شعر العجم

حصۂ اول

عباس مروزی سے نظامی تک

مادۂ تاریخ اختتام تصنیف	مادۂ تاریخ آغاز تصنیف
تذکرہ	تاریخ عجم
۱۳۲۵ھ	۱۳۲۴ھ

مصنفہ

مشہور مورخ اسلام شمس العلما علامہ شبلی نعمانیؒ

جسے

شیخ جان محمد الہ بخش تاجران کتب علوم مشرقیہ کشمیری بازار لاہور

نے ستمبر ۱۹۴۱ء میں

مقبول عام لاہور میں طبع کرایا

تین روپے

کتب نصاب امتحانات علوم مشرقی پنجاب یونیورسٹی ۱۹۴۲ء

منشی ۱۹۴۲ء

پرچہ (۱) جدید تاریخ ہند حصہ اول و دوم عـ
شعر العجم حصہ اول کاغذ اعلیٰ سفید ڈمی ۸ر عـ
(۲) سفیینۂ ادب (حصۂ نثر) ۱۲ ر عـ
وقائع عالمگیر ۸ر عـ
حکیم نباتات (معہ مقدمہ و ترجمہ فرہنگ) ۴ ر
گلستان (باب ۳ و ۵ و ۷ خارج) خوشخط ۱۲ ر
(۳) سفینۂ ادب (حصہ نظم) ۱۲ ر عـ
تحفۃ الاحرار جامی (مقالہ ۱۸ خارج) معہ ترجمہ اردو حاشیہ متن ۱۰ ر
رباعیات عمر خیام معہ حالات ۴ ر
(۴) اخلاق محسنی ۹ ر
شہریت ۔ صفائی حفظان صحت ۱۰ ر
(۵) ترجمتین یعنی فارسی سے اردو اور اردو سے فارسی میں ترجمہ کرنا
(۶) احسن القواعد عـ ر
قواعد عربی از قاضی میر احمد ۳ ر
(یا) نحو میر مجتبائی ۴ ر
سلم الادب جدید ۹ ر

کتب امدادی

خلاصہ تاریخ ہند حصہ ۱ و ۲ ۲ ر
خلاصہ شعر العجم حصہ اول ۷ ر
اردو ترجمہ سفینۂ ادب از مولانا محمد شفیع مولوی فاضل منشی فاضل عـ ر
اردو ترجمہ وقائع عالمگیر معہ فرہنگ ۶ ر
بہترین اردو شرح گلستان از مولانا محمد منیر صاحب عـ ر
گلستان مترجم اردو خوشخط کاغذ عمدہ ۱۲ ر

اردو ترجمہ رباعیات عمر خیام حاشیہ متن
اردو ترجمہ اخلاق محسنی معہ ترجمہ اشعار
جوہر اخلاق بہترین خلاصہ اخلاق محسنی از منشی شادمانی ۳
اوج القواعد خلاصہ احسن القواعد ۸ ر
اردو ترجمہ نحو میر ۴ ر
بہترین اردو ترجمہ سلم الادب معہ فرہنگ
آتالیق فارسی ترجمہ فارسی کے لئے بہترین کتاب ۴
پرچہ جات منشی ۳۱ تا ۱۹۴۰ء ۱۰

منشی عالم ۱۹۴۲ء

(۱) رسالہ عبد الواسع (صنعت ہجا خارج) ۳
عروض سیفی ۳ ر
شعر العجم حصہ دوم عـ
" " سوم عـ
(۲) آئینۂ دانش (حصہ نثر) عـ ر
سرگذشت وزیر خان لنکران معہ ترجمہ اردو فرہنگ ۸ ر
انتخاب سیر المتاخرین
نوٹ ۔ تذکرے کے سوالات عبارتی ہونگے تاریخی نہیں
نیمروز غالب ۸
واقعات عالمگیر مرتبہ عبد اللہ چغتائی ۱۲ ر
(۳) آئینۂ دانش (حصہ نظم) ۱۲ ر عـ
مطلع الانوار امیر خسرو جدید (طبع نہ خارج مقالات ۵ و ۱۰) ۱۲
قصاید عرفی (وحشی) ۹ ر
(۴) اخلاق ناصری (اعلیٰ خوشخط)
خزینۂ معلومات درجہ ۵ و ۶

فہرست مضامین شعر العجم

حصّہ اوّل

(مطبع حمایت اسلام پریس لاہور میں باہتمام چودھری محمد شریف منتظم ناظم کتب خانہ علوم مشرقی کشمیری بازار لاہور ... طبع ہوا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرم جویاں، درے رامے پرستند فقیہاں، دفترے رامے پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد کہ یاراں دیگرے رامے پرستند

وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

اِسلام ایک ابرِ کرم تھا۔ اور سطح خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا۔ لیکن فیض بقدر اِستعداد پہنچا۔ جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت تھی۔ اُسی قدر زیادہ فیض یاب ہوئی۔ عرب۔ ایران۔ افغانستان۔ ہند۔ ترکستان۔ تاتار۔ مصر۔ شام۔ روم۔ سب اِس کے حلقہ میں آئے۔ لیکن قبول اثر میں سب یکساں نہ تھے۔ فرقِ مراتب تھا۔ اور فرقِ مراتب کی حیثیتیں بھی مختلف تھیں۔ جس قوم میں جس قسم کی قابلیت تھی۔ اسلام نے اُنکو اور چمکایا۔ ترک شجاع تھے۔ شجاع تر ہو گئے۔ ایرانی ہمیشہ سے تہذیب۔ معاشرت اور علوم و فنون میں ممتاز تھے۔ اسلام نے ان کو ممتاز تر کر دیا۔ بوعلی سینا۔ غزالی۔ رازی۔ طوسی۔ امام بخاری۔ مسلم سیبویہ۔ جوہری سب ایران ہی کی خاک سے اٹھے تھے۔ آج تمام اِسلامی دنیا میں ایران ہی کی تہذیب و معاشرت جاری ہے۔ ترکوں نے بڑی بڑی پُر زور سلطنتیں قائم کیں۔ لیکن دفتر کی زبان اور دربار کے دستور اور آئین سب فارسی ہی رہے۔

ایران کی خاک فنون لطیفہ کی قابلیت میں بھی سب سے ممتاز تھی۔ اور بالخصوص **شاعری** اس کا خمیر تھا۔ اسلام نے اس خاص جوہر کو زیادہ چمکایا۔ اور اس حد تک پہنچایا کہ تمام دنیا کی شاعری ایک طرف اور صرف ایران کی شاعری ایک طرف لیکن افسوس یہ ہے۔ کہ آج تک کسی اسلامی زبان میں ایران کی شاعری کی کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی گئی جس سے ظاہر ہوتا کہ شاعری کب شروع ہوئی۔ کن اسباب سے شروع ہوئی؟ کس طرح عہد بہ عہد بڑھی؟ کیا کیا انداز قائم ہوئے؟ کیا کیا صورتیں بدلیں۔ ملکی اور قومی حالتوں نے اس پر کیا کیا اثر کئے۔ خود اس نے ملک اور قوم پر کیا اثر ڈالا؟

شعراء کے تذکرے بہت ہیں لیکن وہ درحقیقت بیاض اشعار ہیں۔ جن میں شعراء کے عمدہ اشعار انتخاب کر کے لکھ دیئے ہیں۔ شعراء کے حالات اور واقعات کم اور نہائت کم ہیں۔ اور شاعری کے عہد بہ عہد کے انقلابات اور اُن کے اسباب کا تو مطلق ذکر نہیں۔ میں اسی کمی کو مدت سے محسوس کر رہا تھا۔ اور اکثر اس اُدھیڑ بُن میں رہتا تھا۔ مئی ۱۸۹۴ء میں میرے معزز دوست اور اُستاد مسٹر آرنلڈ نے مجھ کو اطلاع دی کہ جرمن کے ایک پروفیسر جیمس ڈار مسٹیٹر نے اس موضوع پر فرنچ میں ایک کتاب لکھی ہے۔ میں اس زمانے میں فرنچ زبان سیکھ رہا تھا۔ بڑے شوق سے کتاب منگوائی۔ لیکن وہ ۸۸ صفحوں کا ایک رسالہ تھا۔ جس میں شعراء کے نہائت معمولی حالات تھے۔ ایک مدت کے بعد اس مصنف کی ایک اور ضخیم کتاب شائع ہوئی۔ جو تحقیق اور تدقیق کے لحاظ سے نہائت حیرت انگیز تھی لیکن وہ زبان کی تاریخ ہے جس میں ژند پہلوی وغیرہ زبانوں پر نہائت محققانہ بحث کی ہے۔ اور اسلام کے قبل کی تصنیفات کا سراغ لگایا ہے۔ شاعری کی تاریخ سے اسکو لگاؤ نہیں۔

اس اثناء میں میں سررشتۂ علوم و فنون حیدرآباد کے تعلق سے **سلسلۂ کلامیہ** کی طرف متوجہ ہوا۔ اور چند کتابیں لکھیں۔ جو چھپ کر شائع ہوئیں۔ اس سلسلہ سے فی الجملہ فراغت ہوئی تو پچھلے سال پرانا خیال پھر تازہ ہوا۔ اور ۶ مارچ ۱۹۰۶ء کو میں نے اس عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا لیکن بیچ بیچ میں **موازنۂ انیس** اور **الندوہ** سدِ راہ ہوتے رہے۔ جب موازنہ سے بالکل فارغ ہو کر ہمہ تن اس کام میں مصروف ہوا۔ اور **فردوسی** کے حال تک پہنچا تو ۷ مئی ۱۹۰۷ء کو صدمۂ پا کا واقعہ پیش آیا۔ یعنی اتفاق سے میرے پاؤں میں گولی لگی۔ اور پاؤں کاٹ ڈالا گیا۔ یہ بھی فردوسی

شبلی نامہ سیہ را بہ جزائے عملش
پایۂ بند صدا خاست کہ سرے بالیست

کی کرامت تھی۔ کہ واقعہ سے ذرا پہلے شاہنامہ کا یہ مصرع درید و برید و شکست و ببست قلم کی زبان پر تھا۔ اس حادثہ نے تین چار ہفتہ لکھنے سے معذور رکھا۔ پھر وہ سلسلہ شروع ہوا اور باوجود درد اور تکلیف کے کچھ نہ کچھ کام ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ستمبر ۱۹۰۷ء کی چھٹی تاریخ کو دورِ اوّل کا پہلا حصہ انجام پذیر ہوا۔

کتاب کی اجمالی ترتیب یہ ہے کہ قدماء، متوسطین، متاخرین، کے تین دور ہیں۔ پہلا دور حنظلہ سے شروع ہو کر نظامی پر تمام ہوتا ہے۔ دوسرا کمال اسمٰعیل سے جامی تک اور تیسرا فغانی سے ابو طالب کلیم تک، کلیم کے بعد شاعری، شاعری نہیں رہی بلکہ چیستان گوئی بن گئی، اُن دوروں کے لحاظ سے کتاب تین حصوں پر منقسم ہے چوتھے حصہ میں شاعری پر عام ریویو ہے۔ اور یہی حصہ گویا کتاب کی جان، اور اس کی روح رواں ہے۔ اس کتاب کی ترتیب میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔ اگرچہ بہت ہیں لیکن خاص طرح پر جو ذکر کے قابل ہیں حسب ذیل ہیں :۔

نامِ کتاب	نامِ مصنّف	کیفیّت
لب اللباب	عوفی یزدی	سب سے پہلا تذکرہ ہے مصنف ساتویں صدی ہجری میں تھا۔ اور اپنے عہد تک کے حالات لکھے ہیں۔ پروفیسر براؤن نے تصحیح و تحشیہ کر کے شائع کیا ہے۔
چہار مقالہ	نظامی عروضی سمرقندی	مصنف نظامی گنجوی کا ہمعصر تھا۔ گو مختصر سا رسالہ ہے۔ لیکن نہایت مفید باتیں لکھی ہیں۔ خود بھی باکمال شاعر تھا۔
تذکرہ دولت شاہ سمرقندی		مشہور تذکرہ ہے۔ اور گو اکثر جگہ غلطیاں کی ہیں تاہم دلچسپ اور مفید ہے۔
تاریخ آل غزنیں	بیہقی	مصنف مسعود بن سلطان محمد غزنوی کے زمانہ میں تھا ضمناً شعراء عصر کا تذکرہ کیا ہے۔

نامِ کتاب	نامِ مصنف	کیفیت
عرفات	اوحدی	عرفی وغیرہ کا ہم صحبت تھا۔ یہ تذکرہ ضخیم دو جلدوں میں ہے۔ حالات بھی کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں۔
مے خانہ	عبدالنبی فخرالزمانی	جہانگیر کے زمانہ میں تھا۔ صرف اُن شعراء کا حال لکھا ہے۔ جنہوں نے ساقی نامے لکھے۔ تمام تذکروں کی نسبت زیادہ مفصل ہے اور اپنے ہمعصروں کا حال نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔
تذکرۃ الشعراء	میرزا طاہر نصیرآبادی	۱۰۸۳ھ کی تصنیف ہے۔
مآثر رحیمی	عبدالباقی نہاوندی	مصنف خان خاناں عبدالرحیم کا درباری تھا۔ کتاب اصل میں خان خاناں کی سوانحعمری ہے ضمن میں تمام شعرائے خان خانانی کے حالات بھی لکھے ہیں۔ اور تمام تذکروں کی نسبت زیادہ مفصل اور صحیح لکھے ہیں۔
مرآۃ الخیال	شیرخاں لودی	چھپ گیا ہے۔
ہفت اقلیم	امین رازی	جہانگیر کے عہد میں لکھا گیا مستند اور معتبر ہے
تذکرہ میرتقی کاشی		۹۹۳ھ کی تصنیف ہے۔
تذکرہ سامی	سام میرزا صفوی	خاندان صفویہ کا شہزادہ اور جہانگیر کا معاصر تھا
حبیب السیر		معتبر کتاب ہے مصنف جہانگیر کے عہد میں تھا۔
ریاض الشعراء	والہ داغستانی	
سرو آزاد	مولوی غلام علی آزاد	شعرائے عہد تیموریہ کا تذکرہ ہے
ید بیضا	،، ،، ،،	عام تذکرہ ہے۔
خزانہ عامرہ	،، ،، ،،	صرف اُن شعراء کا حال ہے جن کو مدح کے معاوضہ میں صلہ ملا۔

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
مجمع النفائس مجمع الفصحاء	خان آرزو ہدایت قلی خان	حال کی تصنیف ہے شعراء کا کلام نہایت کثرت سے جمع کیا ہے۔

شعراء کے کلیات اور دیوان جس قدر نظر سے گزرے اُن کی فہرست اس قدر لمبی ہے کہ کئی ورق صرف ہوں گے۔ اس لئے قلم انداز کرتا ہوں۔

عجیب بات یہ ہے کہ یورپ نے فارسی زبان کے ساتھ مسلمانوں سے زیادہ اعتنا کیا۔ مسلمانوں کو اسلام سے قبل فارسی زبان کی ایک تصنیف کا بھی پتہ معلوم نہ تھا۔ لیکن **یورپ** نے ان تصنیفات کا اس قدر سرمایہ جمع کر لیا کہ زردشت سے لے کر نوشیرواں کے عہد تک زبان کی پوری تاریخ مرتب ہو گئی۔

پروفیسر دار مسٹیٹر جرمنی نے فرنچ زبان میں ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں کیومرث سے لے کر اسلام کے عہد تک چار دَور قائم کئے۔ اور ہر دَور کی زبان کی نحو و صرف لغات الفاظ و تغیرات پر مفصل ریویو لکھا۔ (یہ کتاب ہماری نظر سے گزری ہے) یورپ کے اور محققین نے خاص خاص زبانوں پر مستقل تصنیفات لکھیں خصوصاً اوستا اور ژند کی زبان کے متعلق اس قدر کثرت سے معلومات مہیا کئے۔ کہ نکتہ نکتہ حل ہو گیا۔ اکثر اساتذہ کے دیوان جو نایاب تھے۔ اُن کو بڑی کوشش اور تلاش سے بہم پہنچا کر تصحیح و تحشیہ کے ساتھ چھاپا۔ **منوچہری** کے قصائد ایران میں نہایت ناتمام اور غلط سلط چھپے تھے۔ لیکن فرانس نے اس اہتمام سے چھاپا کہ دیکھ کر آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ فرنچ میں اس کا ترجمہ بھی چھاپا۔ اور لغات و اصطلاحات کی علیحدہ فرہنگ لکھی۔ اسی طرح رُوس کے **پروفیسر والنٹن ژوکوسکی** نے **انوری** کے قصائد چھاپے۔ اور دیباچہ میں انوری کی سوانح اور کلام پر ریویو لکھا۔ پروفیسر **نولدیکی** نے خاص شاہنامہ کے تاریخی ماخذوں پر ایک مستقل کتاب جرمنی زبان میں لکھی۔ شعراء کے بہت سے تذکرے لکھے گئے جن میں سے **گور اوسلی** کا تذکرہ عام طور پر مشہور ہے۔ سب سے زیادہ مکمل اور جامع کتاب پروفیسر

براؤن نے لکھی جو کیمبرج کالج کے فارسی لکچرار ہیں۔ اس کتاب[1] کے دو حصے شائع ہو چکے ہیں۔

ان کوششوں کے علاوہ قدیم فارسی زبان کی اصل کتابیں بہم پہنچائیں اور چھاپ کر شائع کیں۔ آج مسلمانوں کے پاس پہلوی زبان کا ایک حرف موجود نہیں لیکن یورپ نے پہلوی زبان کی بہت سی تصنیفات شائع کیں۔ جن میں سے ایک کتاب یاتکار زریران حضرت عیسیٰ سے پانچ سو برس قبل کی تصنیف ہے۔

ان تصنیفات میں سے بعض بعض میری نظر سے گزریں، اور جن سے فائدہ اٹھا سکنا ممکن تھا۔ میں نے فائدہ اٹھایا، لیکن ان تمام باتوں پر بھی یہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ کتاب کے لکھنے کا جو حق تھا پورا ہوا۔ قدیم واقع نگاروں اور تذکرہ نویسوں نے جو کمی کی وہ آج کیونکر پوری ہو سکتی ہے ؏

گیرم کہ طرز نوشتن نشد از یاد — پیداست کہ با ایں سر و ساماں چہ نویسم

شعر کی حقیقت

چونکہ ایک مدت سے علم کی کمی اور طبیعتوں کی بدمذاقی نے شعر کی حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اس لئے ضرور ہے۔ کہ پہلے شعر کی حقیقت سے بحث کی جائے۔ تاکہ ایک صحیح معیار قائم ہو۔ جس سے ایران کی شاعری کا اندازہ کیا جائے[2]۔

شاعری کی حقیقت اور اس کی ماہیت پر سب سے پہلے ارسطو نے بحث کی چنانچہ اس نے خاص اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی جس کا نام بوطیقا (پوئٹری) ہے اس کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا اور ابن رشد نے اس کی تلخیص کی۔ اس تلخیص کے جستہ جستہ حصے پروفیسر شیخو لیس نے اپنی کتاب علم الادب میں جو بیروت میں چھپ گئی ہے۔ شامل کئے ہیں۔ افسوس ہے کہ چونکہ مسلمانوں نے ارسطو کی ادبی تصنیفات کی طرف التفات نہیں کیا۔ اس لئے شاعری کے متعلق ارسطو کے جو خیالات تھے وہ مسلمانوں میں بالکل پھیل نہ سکے۔

[1] اس کتاب کا نام لٹریری ہسٹری آف پرشیا ہے۔ اور لندن میں ۱۹۰۳ء میں چھاپی گئی ہے ۱۲

[2] شاعری کی حقیقت پر ہم نے جو کچھ لکھا ہے۔ نہایت اجمالی لکھا ہے۔ اس کے متعلق اس قدر مواد موجود ہے۔ کہ ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

شعر کی عام تعریف

کتب ادبیہ میں شاعری کی جو تعریف کی گئی ہے، اور وہی عام و خاص کی زبانوں پر جاری ہے۔ یہ ہے کہ "کلام موزوں ہو۔ اور متکلم نے بارادہ موزوں کیا ہو" لیکن یہ تعریف درحقیقت عامیانہ تعریف ہے۔ آج تو یہ مسئلہ بالکل فیصل ہو چکا ہے لیکن قدماء کے کلام میں بھی اس کے اشارے بلکہ تصریحات پائی جاتی ہیں۔ کہ شاعری صرف وزن و قافیہ کا نام نہیں۔

شعر صرف وزن و قافیہ کا نام نہیں

کتب ادبیہ میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ حضرت حسان بن ثابت کے صغیر السن بچے کو بھڑ نے کاٹ کھایا۔ وہ حسان کے سامنے روتا ہوا آیا۔ کہ مجھکو ایک جانور نے کاٹ کھایا ہے۔ حسان نے جانور کا نام پوچھا۔ وہ نام سے واقف نہ تھا حسان نے کہا اچھا اس کی صورت کیا تھی؟ بچے نے کہا۔ "کَاَنَّہٗ مُلْتَفٌّ بِبُرْدَی حِبَرَۃٍ" یعنی "وہ گویا یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مخطط چادروں میں لپٹا ہوا ہے" چونکہ بھڑ کے پروں پر رنگین، دھاریاں ہوتی ہیں۔ اس لئے اُس نے مخطط چادر سے تشبیہ دی حسان اچھل پڑے اور خوشی کے جوش میں کہا کہ "واللہ صار ابنی شاعرا" یعنی خدا کی قسم میرا بیٹا شاعر ہو گیا، فقرہ موزوں نہ تھا۔ لیکن چونکہ نہایت عمدہ تشبیہ تھی حسان نے سمجھا کہ بچے میں شاعری کی قابلیت موجود ہے۔ اس لئے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل عرب کے نزدیک شعر کی اصلی حقیقت کیا تھی؟ ابن رشیق قیروانی نے عرب کی شعر و شاعری پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ اس میں شعراء اور علمائے ادب کے جو اقوال نقل کئے ہیں۔ ان سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔

شعرائے فارس کے نزدیک بھی شاعری دراصل تخیل کا نام تھا، نظامی عروضی سمرقندی جو خود بہت بڑا شاعر اور نظامی گنجوی کا معاصر تھا۔ اپنی کتاب **چہار مقالہ** میں لکھتا ہے۔

"شاعری صناعتے است کہ شاعر بداں صنعت اتساق مقدمات موہومہ کند و التیام قیاس نتیجہ برآں وجہ کہ معنی خرد را بزرگ کند۔ و بزرگ را خرد، نیکو را در لباس زشت و زشت را در حلیہ نیکو جلوہ دہد، و بایہام قوت غضبانی و شہوانی برانگیزد و تابداں ایہام طبائع را انبساطے و انقباضے بود و امور عظام را در نظام عالم سبب گردد۔"

اس تعریف کا ماحصل یہ ہے کہ شاعری اس کا نام ہے۔ کہ مقدمات موہومہ کی ترتیب سے اچھی چیز بدنما اور بری چیز خوشنما ثابت کی جائے۔ جس سے محبت و غضب کی قوتیں مشتعل ہو جائیں۔

یورپ کے محققین کے نزدیک شعر کی ماہیت

یہ قدماء کے اقوال وخیالات تھے۔ یورپ کے نکتہ سنجوں نے اس مسئلہ پر نہایت دقیق بحثیں کی ہیں۔ اور عجیب عجیب نکتے پیدا کئے ہیں مل نے اس پر ایک نہایت مفصل اور بسیط مضمون لکھا ہے جس کا نہایت مختصر خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"انسان کے مدرکات میں سے بعض ایسے ہیں جن سے جذبات انسانی کو کچھ تعلق نہیں مثلاً اگر ہم اقلیدس کا کوئی مسئلہ حل کریں تو اس سے ہم کو غصہ یا جوش یا رنج نہیں پیدا ہوگا۔ لیکن اگر ہمارے سامنے کسی شخص کی مصیبت کا حال، دردانگیز لفظوں میں بیان کیا جائے تو اس واقعہ کے ادراک کے ساتھ ہم پر ایک اثر طاری ہوگا۔ اس قسم کے اثروں کا نام جذبات یا احساسات ہے۔ اور جو چیز ان جذبات یا احساسات کو برانگیختہ کر سکتی ہے وہی شاعری ہے۔ اس تعریف کی بنا پر تصویر۔ تقریر۔ وعظ بھی شعر میں داخل ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں بھی جذبات انسانی کو برانگیختہ کر سکتی ہیں۔ اسی بناء پر بعضوں نے ان چیزوں کو بھی شاعری میں داخل کر لیا ہے لیکن مل صاحب کے نزدیک یہ چیزیں شاعری کے دائرہ سے باہر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان جو کلام کرتا ہے۔ اس کی غرض کبھی تو دوسروں پر اثر ڈالنا ہوتا ہے۔ مثلاً اسپیچ، لیکچر وغیرہ کہ ان سب کا مقصد دوسروں کو متاثر کرنا ہوتا ہے کبھی دوسروں سے مطلق غرض نہیں ہوتی۔ بلکہ انسان محض اپنے آپ سے خطاب کرتا ہے اور اپنا آپ ہی مخاطب ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کا بیٹا مر جائے تو اس حالت میں اس کی زبان سے جو الفاظ نکلیں گے۔ اس کی غرض کسی شخص، یا گروہ کو مخاطب کرنا نہ ہوگا۔ بلکہ وہ اپنا آپ مخاطب ہوگا۔ فرض کرو وہاں کوئی شخص موجود نہ ہو تب بھی یہی الفاظ اُسکی زبان سے نکلیں گے۔ شاعری اسی قسم کے کلام کا نام ہے"۔ اس بنا پر شاعری کی تعریف منطقی طور پر کرنا چاہیں۔ تو یوں کہیں گے کہ "جو کلام اس قسم کا ہو کہ اُس سے جذبات انسانی برانگیختہ ہوں اور اس کا مخاطب حاضرین نہ ہوں بلکہ انسان خود اپنا آپ مخاطب ہو۔ اُس کا نام شاعری ہے"۔

مل صاحب کی یہ تعریف اگرچہ نہایت باریک بینی پر مبنی ہے۔ لیکن اس سے شاعری کا دائرہ نہایت تنگ ہو جاتا ہے۔ اور اگر اسی کو معیار قرار دیا جائے تو فارسی اور اُردو کا دفتر بے پایاں بالکل بیکار ہوجائیگا۔

حقیقت یہ ہے کہ شعر کا دائرہ نہ اس قدر تنگ ہے جیسا مل صاحب کرنا چاہتے ہیں اور نہ اس قدر وسیع جتنا ہمارے علمائے ادب نے کیا ہے۔

شعر کی اصلی حقیقت شعر (جیسا کہ ارسطو کا مذہب ہے) ایک قسم کی مصوری یا نقالی ہے فرق یہ ہے کہ مصور صرف مادی اشیاء کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ بخلاف اس کے شاعر ہر قسم کے خیالات جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔

ایک شخص کا عزیز دوست جدا ہو رہا ہے۔ اس حالت میں جو اس پر صدمے گزرتے ہیں۔ اور دل دوز خیالات کا جو طوفان اُس کے دل میں اٹھتا ہے۔ شاعر اس کی تصویر اس طرح کھینچ سکتا ہے۔ کہ اگر رنج و غم مادی چیزیں ہوتیں اور اُن کی تصویر کھینچی جاتی تو وہی ہوتی جو شاعر نے الفاظ کے ذریعہ سے کھینچی تھی۔

اس بنا پر کسی چیز کا بیان جب اِس طرح کیا جائے۔ کہ اُس شئے کی اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے، تو اُس پر شعر کی تعریف صادق آئے گی۔ دریا کی روانی جنگل کا سناٹا۔ باغ کی شادابی، سبزہ کی لہک، خوشبو کی لپٹ، نسیم کے جھونکے، دھوپ کی شدت، گرمی کی تپش، جاڑوں کی ٹھنڈ، صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی یا رنج۔ غم۔ غیظ غضب۔ جوش۔ محبت۔ افسوس۔ حسرت۔ خوشی ان اشیاء کا اس طرح بیان کرنا کہ اُن کی صورت آنکھوں میں پھر جائے یا وہی اثر دل پر طاری ہو جائے یہی شاعری ہے۔

ایک اور پیرایہ میں شاعری کی تعریف کی جا سکتی ہے۔

دنیا میں جس قدر قدرت کے مظاہر ہیں۔ خواہ مادی ہوں مثلاً پہاڑ۔ بیابان۔ باغ دریا وغیرہ خواہ غیر مادی، مثلاً وصل۔ ہجر۔ تحسین۔ نفرین ان سب سے دل پر اثر پڑتا ہے اور ہر شخص کے دل پر پڑتا ہے۔ لیکن اثر کے مراتب متفاوت ہیں۔ بعض اشخاص پر کم بعض پر زیادہ اور بعض پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جو شخص ان مظاہر قدرت سے عام لوگوں کی نسبت زیادہ متاثر ہو اور بعینہٖ اس اثر کو الفاظ سے ادا بھی کر سکتا ہو وہی شاعر ہے۔

شاعر کے جذبات اور احساسات، فطرتاً نہایت نازک، لطیف اور سریع الاشتعال ہوتے ہیں۔ دوست کی جدائی ہر شخص کے دل پر اثر کرتی ہے۔ لیکن شاعر اس موقع پر بالکل بیتاب ہو جاتا ہے۔ دریا کی روانی سے ہر شخص محظوظ ہوتا ہے۔ لیکن شاعر پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ سبزہ کے دیکھنے سے ہر شخص کو فرحت ہوتی ہے۔ لیکن شاعر جھومنے لگتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس درجہ کی کیفیت دوسروں پر بھی طاری ہو لیکن وہ لوگ اس کیفیت کو الفاظ کے ذریعہ سے اس طرح ادا نہیں کر سکتے جس طرح شاعر کر سکتا ہے۔

حاصل یہ کہ جو شخص واقعات اور مظاہر قدرت سے اور لوگوں کی بہ نسبت زیادہ متاثر ہو اور اس اثر کو الفاظ کے ذریعہ سے پورا پورا ظاہر کر سکتا ہو۔ وہی **شاعر** ہے۔

برادر عزیز مولوی **حمید الدین** نے جمہرۃ البلاغۃ فن بلاغت میں ایک نادر کتاب لکھی ہے۔ اس میں شعر کی حقیقت نہایت نکتہ سنجی سے بیان کی ہے۔ اس کا خلاصہ ذیل میں ہے:۔

"شاعر کے لفظی معنے صاحب شعور کے ہیں۔ شعور اصل میں احساس (**فیلنگ**) کو کہتے ہیں یعنی شاعر وہ شخص ہے جس کا احساس قوی ہو۔ انسان پر خاص خاص حالتیں طاری ہوتی ہیں۔ مثلاً رونا۔ ہنسنا۔ انگڑائی لینا یہ حالتیں جب انسان پر غالب ہوتی ہیں تو اُس سے خاص خاص حرکات صادر ہوتی ہیں۔ رونے کے وقت آنسو جاری ہو جاتے ہیں ہنسی کے وقت ایک خاص آواز پیدا ہو جاتی ہے۔ انگڑائی میں اعضا تن جاتے ہیں۔ اسی طرح شعر بھی ایک خاص حالت کا نام ہے۔ شاعر کی طبیعت پر رنج، یا خوشی، یا غصہ، یا استعجاب کے طاری ہونے کے وقت ایک خاص اثر پڑتا ہے۔ اور یہ اثر موزوں الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اسی کا نام **شاعری** ہے۔

حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے۔ تو مختلف قسم کی آوازوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً شیر کی گونج، طاؤس کی جھنکار، کوئل کی کوک، بلبل کا ترانہ، اسی طرح انسان پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے۔ تو الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے! ور جس طرح حیوانات کے جذبات کبھی حرکات کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً طاؤس ناچنے لگتا ہے۔ سانپ جھومتا اور لہراتا ہے۔ اسی طرح انسان کہ چونکہ نطق کے ساتھ نغمہ کا ملکہ بھی عطا ہوا ہے۔ اس لئے موزوں الفاظ منہ سے نکلتے ہیں۔ اور ساتھ ہی انسان گنگنانے بھی لگتا ہے۔ اور جب یہ جذبہ زیادہ تیز ہو جاتا ہے۔ تو انسان ناچنے لگتا ہے۔ یہ سب باتیں جمع ہو جائیں تو یہی اصلی **شعر** ہے۔ اس بیان سے ظاہر ہو گا کہ شعر الفاظ، وزن، نغمہ اور رقص کے مجموعے کا نام ہے۔

لیکن چونکہ یہ تمام چیزیں جذبات کی کمال شدت کے وقت پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے ہر شعر میں ان تمام چیزوں کا پایا جانا ضرور نہیں تاہم کوئی شعر راگ سے خالی نہیں ہو سکتا وزن جو شعر کا ایک ضروری جزو ہے۔ راگ کی ایک قسم ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اہل عرب ہمیشہ اشعار کو گا کر پڑھتے تھے، شعر کے پڑھنے کو جو اہل عرب **انشاد** کہتے ہیں۔ اس کی یہی وجہ ہے۔

کیونکہ انشاوس کے اصلی معنے گانے کے ہیں۔

ارسطو نے اس بحث میں سخت غلطی کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شاعری کے جذبے کے وقت انسان جو گانے یا ناچنے لگتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نغمہ اور رقص، ایک قسم کی مصوری ہے۔ یعنی انسان کے دل میں جو جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ آواز اور حرکات کے ذریعہ سے اُن کی تصویر کھینچتا ہے۔ چنانچہ رقاص جو کچھ گاتے ہیں۔ حرکاتِ رقص کے ذریعہ سے اس کو بتانے جاتے ہیں۔

لیکن ارسطو کا یہ خیال غلط ہے۔ اصل یہ ہے کہ جذباتِ انسانی مثلاً رنج، خوشی وغیرہ انسان کے دل میں نہایت پُر زور حرکت پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی حرکت آواز، یا راگ، یا رقص، یا تڑپ بن جاتی ہے مثلاً انسان کو جب ہنسی آتی ہے۔ تو دل میں ایک حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی حرکت ہنسی بن جاتی ہے۔ اور چونکہ یہ آثار، حرکات نفسانی کے مشابہ ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ حرکات نفسانی پر اسی طرح دلالت کرتے ہیں۔ جس طرح الفاظ، معانی پر دلالت کرتے ہیں۔ غرض جس طرح نطق، ایک فطری چیز ہے۔ اسی طرح یہ اشارات وحرکات بھی خود بخود سرزد ہوتے ہیں، وہ نقالی اور محاکات کی غرض سے نہیں کئے جاتے، گو یہ ممکن ہے کہ محاکات کا مقصد اس سے حاصل ہو جائے۔

ان تمام خیالات سے تم کو شاعری کی حقیقت کا کچھ اندازہ ہوا ہوگا۔ اور معلوم ہوگا کہ آجکل جس چیز کا نام شاعری ہے اس کو شاعری سے کچھ تعلق نہیں۔

فارسی شاعری کی ابتدا

اس قدر عموماً مسلّم ہے کہ اسلامی دور میں شاعری تیسری صدی سے شروع ہوتی ہے۔ ابوالعباس مروزی کے اشعار جن کا ذکر آگے چل کر کہیں آئے گا۔ اگر بر دایتاً ثابت بھی ہوں تو وہ ایک اتفاقیہ تفریح خاطر تھی۔ جو سلسلۂ تاریخی کی کوئی کڑی نہیں بن سکتی۔

شروع اسلام سے کئی سو برس تک فارسی شاعری کیوں وجود میں نہیں آئی

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ دو سو برس تک شاعری کی زبان کیوں بند رہی، فارسی تذکرہ نویسوں نے اس کے اسباب یہ بتائے ہیں۔ "ظاہر است کہ اشعار قدیم، شعرائے عجم بسبب غلبہ عرب از میان رفتہ چنانکہ مشہور است کہ تمام کتب و تواریخ عجمیاں را عرب سوختند۔ از کتب قدیمہ چیزے

برجانگذاشتہ الا قلیلے کہ پنہاں داشتند، چوں مردم را ذہن بلیغ نمودند قاعدہ سخن فارسی وشعر متروک شد، تا مدتے گذشت واوضاع بنوع دیگر گشت۔"

یہ **مجمع الفصحاء** کی عبارت تھی جو زمانہ حال کا سب سے بڑا مستند تذکرہ ہے۔ اور ناصر الدین قاچار مغفور کے عہد میں ۱۲۸۴ھ میں تصنیف ہوا ہے۔ یہ خیال اصل میں دولت شاہ کے تذکرے سے ماخوذ ہے۔ اس نے یہ روایت نقل کی ہے، کہ عبداللہ بن طاہر نے حکم دیا تھا کہ ایران کی تمام کتابیں برباد کر دی جائیں اس بناء پر آل سامان کے زمانے تک فارسی شاعری نے ظہور نہیں کیا۔"

ان بزرگوں کی تاریخ دانی کی داد دینے کا یہ موقع نہیں، اس کیلئے ہمارے مضمون تراجم کو دیکھنا چاہیئے جو رسائل شبلی کے ساتھ چھپ کر شائع ہوا ہے، لیکن استدلال کس قدر لطیف ہے۔ یعنی چونکہ ایران کی قدیم کتابیں برباد کر دی گئیں، اس لئے اہل عجم فارسی میں شعر بھی نہ کہہ سکے۔" اسلام نے ملکی زبان سے کبھی کچھ تعرض نہیں کیا، حضرت عمر رض کے عہد سے حجاج بن یوسف کے زمانہ تک تمام دفاتر فارسی زبان میں تھے، حجاج کے زمانے سے عربی میں ہو گئے، لیکن ملک کی اصلی زبان وہی رہی، رفتہ رفتہ فارسی عربی مخلوط ہو کر اردو کی طرح ایک جدید زبان پیدا ہو گئی، اور وہ گویا خاص اسلامی زبان تھی۔ جب خود فارسی زبان سے کسی قسم کے تعصب کا اظہار نہیں کیا گیا، تو فارسی شاعری نے کیا گناہ کیا تھا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ اسلام جس قوم میں پھیلتا تھا، اس کو مذہبی اثر سے اس قدر لبریز کر دیتا تھا کہ اس کو سوائے مذہب کے دنیا کی کسی چیز سے سروکار نہیں رہتا تھا، خود عرب کو دیکھو، وہ ملک جس کے در و دیوار سے شاعری کی آواز آتی تھی، اسلام کے آتے ہی دفعۃً چاروں طرف سناٹا سا چھا گیا۔ ولید کے زمانے سے جب شاہانہ دربار قائم ہوا تو لوازم سلطنت کی حیثیت سے شاعری نے دوبارہ جنم لیا۔ لیکن تخت کی زبان عربی تھی۔ اس لئے شاعری بھی عربی میں ہی رہی شعراء جو مدحیہ قصائد کے ذریعہ سے زندگی بسر کرتے تھے فارسی میں شاعری کرتے تو ممدوح ان کی زبان کیونکر سمجھتا، اور نہ سمجھتا تو ان کی داد کیا دے سکتا، اتنے سے سہارے سے کہ مامون الرشید ایک مدت تک خراسان میں رہا تھا۔ اور غالباً فارسی سے حرف آشنا ہو گیا تھا۔ عباس مروزی نے ایک قصیدہ فارسی میں لکھا اور

مامون الرشید نے اس کے صلے میں ہزار دینار سالانہ مقرر کر دیئے۔ ارباب تذکرہ لکھتے ہیں، کہ اسلامی عہد میں فارسی شاعری کا یہ پہلا حرف تہجی تھا۔ اس سے پہلے اگر برائے نام کچھ پتہ چلتا ہے تو ابو حفص حکیم سعدی کا شعر ہے جو پہلی صدی ہجری میں موجود تھا، شعر یہ ہے ؎

آہوے کوہی در دشت چگونہ دودا — وندارد یار، بے یار چگونہ بودا

ایک اور بڑا سبب یہ ہوا، کہ چند ہی روز میں اسلام نے اپنے خاص علوم و فنون ادب و انشا کا سرمایہ اس قدر وسیع کر لیا تھا، اور ہر شاخ میں وہ اختراعات اور جدتیں پیدا کی تھیں کہ اس کے سامنے تمام قوموں کو اپنا قدیم لٹریچر ہیچ اور بے وقعت نظر آتا تھا۔ دوسری تیسری صدی ہجری میں اسلام کی جہاں جہاں حکومتیں قائم ہوئیں، یعنی ایران مصر۔ شام۔ اندلس۔ ان تمام ممالک میں اسلامی علوم و فنون نے مفتوحہ قوموں کے علوم و فنون کو بالکل ماند کر دیا۔ اس لئے عرب کی شاعری کے آگے، دوسری قوموں کو اپنی زبان میں شاعری کرتے شرم آتی تھی۔ خراسان، مصر، و شام وغیرہ میں سینکڑوں ہزاروں شعراء پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن جو کچھ کہتے تھے عربی ہی میں کہتے تھے چنانچہ ثعلبی نے یتیمۃ الدہر میں اُن عجمی شعراء کا مفصل تذکرہ لکھا ہے۔

تیسری صدی ہجری میں دولت عباسیہ کا آفتاب اقبال ڈھلنا شروع ہوا۔ اور بڑے بڑے صوبے خود مختار ہو کر نئی نئی حکومتیں قائم ہونے لگیں، اس قسم کی سب سے پہلی سلطنت جو قائم ہوئی وہ خاندان **طاہریہ** تھا، جو مامون الرشید کے مشہور سپہ سالار طاہر ذوالیمینین کی طرف منسوب ہے۔ یہ خاندان ۵۴ برس حکمران رہا اور ۲۵۹ھ میں اس کا خاتمہ ہو گیا، اگرچہ خود مختاری کا مدعی نہ تھا لیکن خراسان میں اس کا اس قدر زور اور اقتدار ہو گیا تھا۔ کہ خود مختاری کے تمام سر و سامان پائے جاتے تھے، دربار میں شعراء کا ہونا بھی ضرور تھا، اس لئے باوجود اس کے کہ یہ خاندان فارسی زبان سے بہت کم آشنا تھا، تاہم بہت سے شعرا پیدا ہو گئے، منوچہری دامغانی نے ایک قصیدے میں متقدمین شعراء کا ذکر کیا ہے ؎

بو العلا و بو العباس و بو سلیک بو المثل — آنکہ آمد از نواخ آنکہ آمد از ہری

از حکیمان خراساں کو شہید و رودکی — بو شکور بلخی و بو الفتح بستی ہکذی

ان شعروں میں جن شعراء کے نام آئے ہیں۔ ان میں ظاہریہ شعراء بھی ہیں یعنی حنظلہ بادغیسی، محمود وراق۔ فیروز مشرقی۔

حنظلہ بادغیسی یہ سب سے پہلا شخص ہے جس نے باقاعدہ شاعری اختیار کی ۔ ۲۱۹ھ میں انتقال کیا، عروضی سمر قندی[1] کی تصریح سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ صاحب دیوان تھا، چند اشعار یہ ہیں :۔

یارم سپند گرچہ بر آتش ہمے فگند		از بہر چشم تا نرسد مر ورا گزند	
اور اسپند و مجمرہ ناید ہمے بکار		با روے ہمچو آتش و با خال چون سپند	

یعنی میرا معشوق نظر بد سے بچنے کے لئے آگ پر سپند جلاتا ہے لیکن اس کو اس کی کیا حاجت ہے ۔ اس کا چہرہ خود آگ، اور اس کا تل خود سپند ہے حنظلہ نے ۲۱۹ھ میں وفات[2] پائی ۔

محمود وراق محمد بن طاہر جو خاندان طاہر کا سب سے اخیر فرمانروا تھا یہ اس کے زمانے میں تھا، مجمع الفصحا میں اس کے یہ دو شعر نقل کئے ہیں ؎

نگار نیا بہ نقد جانت ندہم		گرانی در بہا، ارزانت ندہم	
گرفتم بہ جان، دامان وصلت		نہم جان از کف و دامانت ندہم	

فیروز مشرقی اصل میں ہلمن کا رہنے والا تھا ۲۸۳ھ میں وفات پائی ۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

مرغی است خدنگ او عجب دیدی		مرغے کہ شکار او ہمہ جانا	
دادہ پر خویشش کرگس ہدیہ		تا بچہ اسنش را بردہ بہمانا	

خاندان طاہریہ کے اخیر فرمانروا محمد بن طاہر کو ۲۵۹ھ میں یعقوب صفار نے گرفتار کر لیا اور اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا ۔

خاندانِ صفاریہ کا عہد

یعقوب صفار ذات کا ٹھٹیرا تھا ۔ لیکن شاہانہ دل و دماغ رکھتا تھا یہاں تک کہ خلافت عباسیہ کے زمانے میں اس نے علم بغاوت بلند کیا ۔ اور خراسان و فارس پر قابض ہو گیا ۲۶۵ھ میں وفات پائی ۔ اس کے بعد اس کا بھائی عمرو بن لیث اور اس کے بعد اس کا پوتا طاہر بن محمد چند روز حکمران رہ کر ۲۹۰ھ میں گرفتار ہوا اور اس سلسلہ کا خاتمہ ہو گیا ۔ اس چند روزہ خاندان نے بھی متعدد شعرا پیدا کئے جن میں سے **ابو سلیک گرگانی** زیادہ ممتاز ہے منوچہری دامغانی نے اس کو قدماء شعراء میں شمار کیا ہے ۔

[1] چہار مقالہ صفحہ ۲۷ [2] یہ تمام حالات اور اشعار مجمع الفصحا سے ماخوذ ہیں ۱۲

مجمع الفصحا میں اس کے یہ اشعار نقل کئے ہیں ؎

بمژہ دل زمن بدزدیدی	اے بلب قاضی و بمژگان دزد
مُزد خواہی کہ دل زمن بُردی	اے شگفتا کہ دیدہ دزدی و مزد

شاعری کے متعلق اس خاندان کا بڑا احسان یہ ہے کہ رباعی کی ایجاد اسی زمانے میں ہوئی یعقوب صفار کا ایک کم سن بچہ ایک دن اخروٹوں سے کھیل رہا تھا۔ ایک اخروٹ لڑھکتے لڑھکتے ایک گڑھے میں جا کر گرا۔ بچہ کی زبان سے بے ساختہ یہ مصرع نکلا ع

"غلطاں غلطاں ہمے رود تا لب گو" یعقوب بھی موجود تھا۔ اس کو بچہ کی زبان سے یہ موزوں کلام بہت پسند آیا۔ لیکن چونکہ اس وقت تک اس بحر میں اشعار نہیں کہے جاتے تھے۔ شعرا کو بلا کر کہا کہ یہ کیا بحر ہے۔ انہوں نے کہا۔ ہزج ہے۔ پھر تین مصرع اور لگا کر رباعی کر دیا۔ اور دوبیتی نام رکھا۔ مدت تک یہی نام رہا۔ پھر دوبیتی کے بجائے رباعی کہنے لگے[1] لیکن یہ تعجب ہے کہ عربی زبان میں آج بھی دوبیتی کہتے ہیں جس سے اہل عرب کی دیانت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

خاندان سامانیہ

خاندانِ سامانیہ — اس وقت تک جو کچھ ہوا وہ شاعری کی ابجد تھی لیکن خاندان سامانیہ نے دفعتًا اس زمین کو آسمان بنا دیا۔ رودکی جو فارسی شاعری کا ابو الآباء سمجھا جاتا ہے اسی دربار کا دست پرورد تھا۔ شاہنامہ جو عجم کا صحیفۂ آسمانی ہے۔ اس کا عنصر اسی عہد میں تیار ہوا۔ اس خاندان کا سلسلۂ نسب بہرام چوبین تک پہنچتا ہے۔ اس لئے اس خاندان میں حکومت کا آنا جم و کسریٰ کا دوبارہ عالم وجود میں آنا تھا، عدل و انصاف، جاہ و جلال، شان و شوکت، تربیت علم و فن، کسی بات میں وہ اپنے اسلاف سے کم نہ تھا۔

اس سلسلہ کے قائم ہونے کی مختصر تاریخ یہ ہے۔ کہ مامون الرشید کی جبلی اور شاہانہ فیاضیاں تھیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ قدیم خاندانوں کی تربیت کا خیال رکھتا تھا جس زمانے وہ مرو میں تھا، اس سلسلہ کا مورث اول اسد بن سامان اُ دربار میں پہنچا اور مامون نے اس کو پا یا قرب میں جگہ دی، جب مرو سے بغداد روانہ ہوا تو وہاں کے گورنر

[1] تذکرہ دولت شاہی سمرقندی ۱۲

کو تاکید کرتا آیا کہ اسد کی اولاد کو معزز عہدے دیئے جائیں اسد کے چار فرزند تھے نوح، احمد یحییٰ، الیاس چنانچہ وہ سمرقند، فرغانہ، لشناس، ہرات کے گورنر مقرر کئے گئے، نوح کی وفات کے بعد اس کا بیٹا احمد سمرقند کا حاکم مقرر ہوا لیکن چند روز کے بعد اپنے بیٹے نصر کو اپنا قائم مقام کرکے خود گوشہ نشین ہو گیا ۲۶۱ھ میں خلیفہ معتضد باللہ نے نصر کو ماوراء النہر کی حکومت دی۔ اس نے اپنی طرف سے اسمٰعیل کو بخارا کا حاکم مقرر کیا، چند روز کے بعد دراندازوں نے دونوں بھائیوں کو باہم لڑا دیا۔ یہاں تک کہ نصر میدان جنگ میں گرفتار ہو کر اسمٰعیل کے دربار میں آیا لیکن اسمٰعیل نے حوصلہ شاہانہ سے کام لیا اور بھائی کو قید سے آزاد کر کے تخت پر بٹھایا آپ دست بستہ اس کے سامنے کھڑے ہو کر آداب و دست بوس کی رسمیں ادا کیں اور عرض کیا کہ میں وہی آپ کا ماتحت صوبہ دار ہوں۔ نصر نے ۲۷۹ھ میں انتقال کیا اور سمرقند کا صوبہ بھی اسمٰعیل کے ہاتھ آ گیا۔

سلسلہ سامانیہ کی مستقل حکومت اسی تاریخ سے شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ کا پہلا فرماں روا یہی اسمٰعیل تھا، یہ خاندان ایک سو تیس برس تک قائم رہا۔ اسمٰعیل نے ۲۹۵ھ میں وفات پائی، اسمٰعیل کے بعد احمد بن اسمٰعیل اور اس کے بعد نصر بن احمد تخت نشین ہوا۔ اور یہی وہ تاجدار ہے جس کے دربار کا ملک الشعراء رودکی تھا جو فارسی شاعری کا بانی اول کہا جاتا ہے۔ وہ نہایت فیاض عادل اور قدردان علم و فن تھا تیس برس کی حکمرانی کے بعد ۳۳۱ھ میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا نوح فرمانروا ہوا وہ بھی باپ کی طرح مربی علم و فن تھا فلسفہ و حکمت اور دیگر علوم و فنون کا جو کتب خانہ اس نے مرتب کیا تھا اس کی نسبت علامہ ابن خلکان نے بوعلی سینا کے حالات کے ذیل میں لکھا ہے

کانت عدیمۃ المثل فیھا من کل فن من	یہ کتب خانہ بے نظیر تھا، اس میں متداول اور مشہور
الکتب المشھورۃ بایدی الناس و	کتابوں کے علاوہ کتابیں تھیں جو اس کتب خانہ

سلہ اس کتب خانہ کا حال خود بوعلی سینا کی زبانی طبقات الاطبا میں نقل کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ یہ بہت بڑا کتب خانہ تھا۔ ہر علم و فن کے لئے الگ الگ مکان تھے اور اس میں صرف اسی فن کی کتابیں تھیں۔ کتابیں اوپر تلے بہ ترتیب صندوقوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ بوعلی سینا کا بیان ہے۔ کہ میں نے قدماء کی کتابوں کی فہرست دیکھی اور اپنی پسند کے موافق کتابیں لکھوا کر دیکھیں، ان میں اکثر ایسی کتابیں تھیں جن کے نام بھی کسی کو معلوم نہ تھے اور خود میں نے بھی کبھی ان کو نہیں دیکھا تھا۔

غیرھم مما لا یوجد فی سواھا ولا سمع باسمه فضلا من معرفته۔	کے سوا اور کہیں نصیب نہیں ہو سکتی تھیں، اور جن کا جاننا تو درکنار کسی نے ان کا نام بھی نہیں سنا تھا۔

فلسفۂ یونان کی بے شمار تصنیفات خلفائے عباسیہ کی بدولت عربی میں ترجمہ ہو چکی تھیں، لیکن اکثر ترجمے نامعلوم اور مشتبہ تھے، اور جن کتابوں کے متعدد ترجمے ہوئے تھے وہ باہم مختلف تھے **نوح بن نصر** نے حکیم ابونصر فارابی کو بلا کر فرمائش کی۔ کہ ان تمام تراجم کو سامنے رکھ کر ایک صحیح اور جامع ترجمہ تیار کر دے۔ چنانچہ **فارابی** نے اس فرمائش کی تعمیل کی اور اس کتاب کا نام تعلیم الثانی رکھا۔ اس واقعہ کو تاریخی حیثیت سے یاد رکھنا چاہیئے کہ حکمائے اسلام میں فارابی نے معلم ثانی کا جو لقب حاصل کیا ہے۔ وہ اسی کتاب کی بدولت تھا۔ افسوس ہے کہ یہ کتب خانہ جل گیا۔ اور چونکہ اس کتاب کا اصل مسودہ فارابی کے ہاتھ کا ضائع ہو گیا۔ اس لئے آج یہ بے نظیر کتاب ناپید ہے[1]۔

نوح نے ۳۴۳ھ میں وفات پائی۔ اس کے بعد عبد الملک اور عبد الملک کے بعد منصور بن نوح تخت نشین ہوا۔ اس کے دربار کا وزیر ابو علی بن محمد تھا جس نے تاریخ **طبری** کا عربی زبان سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ منصور نے ۳۶۵ھ میں وفات پائی اس کے بعد **نوح بن منصور ثانی** فرمانروا ہوا۔ **دقیقی** مشہور شاعر اسی کے دربار کا شاعر تھا۔ نوح کے بعد منصور بن نوح، اس کے بعد عبد الملک اور اس کے بعد اسمٰعیل بن عبد الملک تخت نشین ہوا اور اسی پر اس خاندان کا خاتمہ ہوا جس کی تاریخ ۳۹۵ھ ہے۔

شعرائے سامانیہ

سلسلہ سامانیہ سے پہلے جو خاندان گزرے وہ طاہریہ اور صفاریہ تھے۔ طاہریہ عربی النسل خاندان تھا۔ اس لئے فارسی شاعری کو اس کے زمانے میں عروج نہیں ہو سکتا تھا صفاریہ نو دولت اور کم اصل تھے۔ اور ان کی حیثیت ایک فتنہ جو باغی سے بڑھ کر نہ تھی۔ لیکن **سامانی خاندان**، نسل کیان کا یادگار تھا۔ ان کی سلطنت نے ایک سو دس برس

[1] یہ واقعہ اکثر کتابوں میں ہے کشف الظنون (باب الحکمۃ) میں اس تمام واقعہ کو منصور بن نوح کے عہد سے منسوب کیا ہے۔ اور مورخوں کو بھی یہ دھوکا ہوا ہے لیکن یہ صریح غلطی ہے اس لئے کہ فارابی نے ۳۳۹ھ میں انتقال کیا ہے۔ اور منصور ۳۵۰ھ میں تخت نشین ہوا ہے۔

کی عمر پائی۔ قدرداں علم و فن ہونے کے ساتھ وہ خود بھی صاحب کمال اور سخن سنج تھے وہ دیکھتے تھے کہ اہل عجم اپنے لٹریچر اور ملکی خصوصیات سے بالکل الگ ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کی شاعرانہ قوتیں بالکل ایک غیر زبان (عربی) پر صرف ہو رہی ہیں۔ خراساں و بخارا میں سینکڑوں ہزاروں شعرا موجود ہیں۔ جو نسلاً عجم ہیں لیکن دار الخلافہ بغداد کے اثر سے جو کچھ کہتے ہیں۔ عربی میں کہتے ہیں۔ ان اسباب سے اس خاندان نے اپنی قومی اور ملکی زبان کی ترقی پر شاہانہ توجہ کی شعرا کی بیش قرار تنخواہیں مقرر کیں۔ خاص خاص مضامین پر اشعار لکھوائے۔ **کلیلہ و دمنہ** سنسکرت سے اولاً فارسی میں ترجمہ کی گئی تھی لیکن جب عبد اللہ بن المقفع نے اس ترجمہ کو عربی میں منتقل کیا۔ تو فارسی نسخہ بالکل گمنام ہو گیا۔ نصر بن احمد سامانی نے **رودکی** کو حکم دیا کہ اس کو فارسی میں نظم کر دے۔ عجم کی تاریخ اب تک نامرتب اور پریشان تھی۔ اس لئے **دقیقی** کو اس کام پر مامور کیا۔ چنانچہ اس نے ہزار شعر لکھے۔ اور یہ **شاہ نامہ** کا پہلا سنگِ بنیاد تھا۔ تفصیل ان واقعات کی آگے آتی ہے

خاندان سامانیہ کے شعراء

شعرائے سامانیہ کی تعداد اگرچہ سینکڑوں تک پہنچتی ہے لیکن عروضی سمرقندی وغیرہ نے جن لوگوں کا نام خصوصیت سے لیا ہے۔ وہ یہ ہیں۔ ابو العباس، ابو المثل، ابو اسحاق جویباری، ابو الحسن، جنازی نیشاپوری، ابو الحسن کسائی، شہید بلخی، ابو المؤید ابو عبد اللہ فرالادی **رودکی**، **دقیقی**، رابعہ قزداری، ابو ذر، معمر جرجانی، ابو المظفر نصر بن محمد نیشاپوری عمارہ مروزی، طخاری، مرادی۔

یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ اس دور کا پہلا شاعر کون ہے؟ لیکن جہاں تک قرائن سے پتہ چلتا ہے۔ ابو عبد اللہ فرالادی، مرادی۔ شہید، ابو شکور بلخی، اس قافلہ کے پیش رو ہیں۔ رودکی کا ایک شعر ہے ؎

شاعر شہید و شہرہ فرالادی ... ویں دیگراں بہ جملہ ہمہ راوی

یعنی شاعر اصل میں شہید ہے لیکن فرالادی مشہور زیادہ ہو گیا ہے۔ باقی اور شعرا انہیں دونوں کے رواۃ ہیں۔ رودکی نے شہید کا مرثیہ بھی لکھا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے۔

کاروانِ شہید رفت از پیش	واں ما رفتہ گیر و می اندیش
از شمار دو چشم یک تن کم	وز شمار خرد ہزاراں بیش

۱؎ مجمع الفصحاء تذکرۂ ابو عبد اللہ فرالادی ۱۲

رابعہ

اس دور کی یہ خصوصیت یادگار ہے کہ شعروشاعری کا مذاق عورتوں میں بھی پھیل گیا تھا۔ رابعہ فرواری بلخی، جو رودکی کی ہمعصر تھی اعلیٰ درجہ کی شاعر تھی، اس کا باپ کوب، اعراب میں سے تھا لیکن رابعہ عجم میں پیدا ہوئی۔ اور اس وجہ سے عربی فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتی تھی، نہایت حسین اور صاحب فضل و کمال تھی، بکتاش نام ایک غلام سے اُس کو عشق تھا۔ لیکن پھر مجازی سے گزر کر عشق حقیقی کی نوبت پہنچی۔ چنانچہ اس کا شمار صوفیہ میں کیا جاتا ہے۔ تاہم چونکہ عورت کا کسی اجنبی مرد سے محبت کرنا اسلامی جماعت میں معیوب تھا۔ اس لئے لوگوں نے اس کو قتل کر ڈالا، مجمع الفصحاء میں اس کے بہت سے شعر نقل کئے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔

دعوتِ من بر تو آں شد کا یزدت عاشق کناد	بر یکے سنگین دلے نامہرباں چوں خویشتن
تا بدانی دردِ عشق و داغِ ہجر و غم کشی	چوں بہ ہجر اندر بہ پیچی پس بدانی قدر من

رودکی

اِس دور کا مشہور شاعر ہے، تمام تذکرے متفق اللفاظ ہیں کہ سب سے پہلے جس نے فارسی زبان میں دیوان مرتب کیا وہ رودکی تھا۔

سامانیوں کے دَور میں سینکڑوں شعرا تھے۔ جن میں سے بعض کا تذکرہ آگے آئیگا لیکن آج تک سامانیوں کا نام جس کی بدولت زندہ ہے۔ وہ رودکی ہے۔ شریف گرگانی نے سچ کہا۔

ازاں چندیں نعیم جاودانی	کہ ماند از آل سلمان و آل ساماں
ثنائے رودکی ماندست و مدحش	نوائے باربد ماندا ست دوستاں

رودکی کا اصلی نام محمد یا جعفر ہے، رودک، نخشب، کے ضلع میں جس کو نسف بھی کہتے ہیں۔ ایک گاؤں کا نام ہے، رودکی اسی گاؤں کی طرف منسوب ہے بعضوں کا بیان ہے کہ رودکی کی وجہ تسمیہ یہ ہے۔ کہ وہ رود (ایک باجے کا نام ہے) اچھا بجاتا تھا۔

یورپ اور ایشیا کا یہ عجیب اتفاقی توافق ہے۔ کہ رودکی بھی ہومر کی طرح مادر زاد اندھا

تھا، آٹھ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا، پھر علم قرات کی تکمیل کی، اسی سن میں شعر کہنا شروع کر دیا، شاعری کے مشغلہ کے ساتھ تمام متداول علوم و فنون حاصل کئے۔ خوش قسمتی سے نہایت خوش آواز اور طبیعت بذلہ سنج واقع ہوئی تھی، سلاطین و امراء کے دربار میں ایک بڑی خدمت ندیمی کی تھی، تقرب و اثر کے لحاظ سے ندیم کا رتبہ وزراء سے بھی بالاتر ہوتا تھا۔ اس عہدہ کے لئے بذلہ سنجی، لطیف الطبعی، حاضر جوابی، ظرافت، وسعت معلومات، ضروری شرطیں تھیں، رودکی میں یہ سب شرطیں جمع تھیں، اس بناپر **نصر بن احمد** سامانی کے دربار میں اس کو رسائی حاصل ہوئی، نصر نے اس کی تربیت پر خالص توجہ مبذول کی، تمام ارباب تذکرہ کا بیان ہے کہ رودکی کو اس قدر جاہ و دولت حاصل ہوئی کہ دربار کے بڑے بڑے امراء کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ جب اس کی سواری نکلتی تو دو سو[1] زریں کمر غلام، رکاب کے ساتھ ساتھ چلتے، سفر میں اس کا اسباب چار سو اونٹوں پر بار کیا جاتا تھا۔

یہ عموماً مسلم ہے کہ فارسی شاعری عربی کے نمونے پر قائم ہوئی تھی لیکن اس زمانہ میں عربی شاعری واقعیت اور حقیقت سے دور ہو کر ستائش گری اور مداحی کے سوا اور کسی کام کی نہیں رہی تھی، متنبی، ابو تمام، بحتری، جو اس دور کے پیغمبران سخن ہیں، ان کا تمامتر کارنامہ یہی خوشامد اور ثناگستری تھا، خلفاء اور امراء شاعری کو صرف تفریح طبع کا ایک مشغلہ سمجھتے تھے، لیکن **خاندان سامانیہ** نے شاعری سے اصلی کام لئے، چنانچہ **رودکی** کو کلیلہ و دمنہ کے نظم کی خدمت دی، اور اس کے صلے میں چالیس ہزار درہم عطا کئے، عنصری ایک قصیدہ میں کہتا ہے۔

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش	عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور

رودکی کی شاعری عام انداز

رودکی کی شاعری کا عام انداز واقعہ گوئی، پند و موعظت اور حسن تاثیر ہے

عرب جاہلیۃ کی شاعری کا اصلی جوہر یہ تھا کہ اس سے بڑے بڑے قومی اور ملکی انقلابات پیدا کر دیتے تھے۔ فارسی شاعری تفریح طبع کے سوا اور کسی کام کی نہ تھی۔ یعنی اس سے کبھی کوئی تاریخی واقعہ وجود میں نہیں آیا، لیکن رودکی اس عام اعتراض سے مستثنے ہے۔

نصر بن سامانی نے ایک دفعہ ہرات کا سفر کیا، اور بادغیس میں جو ہرات کا مشہور

[1] بہارستان جامی ۱۲

نزہت گاہ ہے۔ پڑاؤ ڈالا۔ بہار کے دن تھے، اور تمام دشت و صحرا چمن زار بن گیا تھا
نصر ان دلفریبیوں میں ایسا محو ہوا کہ ساری بہار یہیں گذر گئی، جاڑے آئے تو میووں کی بہتات
ہوئی، ان اطراف میں ایک سو بیس قسم کے انگور ہوتے ہیں۔ جن میں تریناں اور کلنجری نہایت
خوش مزہ شاداب، اور نرم ہوتے ہیں، النصر صحرا سے اٹھ کر آبادی میں آیا اور درواز میں جو
ایک مشہور مقام ہے۔ قیام کیا، یہ مقامات نہایت آباد اور معمور تھے، ہر طرف عالی شان
قصر و ایوان اور ہر ایوان کے ساتھ خانہ باغ اور پائیں باغ ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں سیستان
اور مازندران کے میوہ جات کی آمد ہوئی، النصر نے جاڑے بھی یہیں گزارے، ہر دفعہ قصد کرتا
تھا کہ اب کی بہار گزرنے پر روانہ ہو جاؤں گا۔ لیکن جب ایک موسم گزر جاتا تھا۔ تو دوسرا
زنجیر پا بن جاتا تھا۔ اسی طرح پورے چار برس گزر گئے۔ امراء اور فوج کے لوگ تنگ آ گئے
تاہم بادشاہ سے کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ آخر رودکی کے پاس گئے، اور پانچ
ہزار اشرفیاں اس شرط پر دینی منظور کیں۔ کہ بادشاہ یہاں سے بخارا کو واپس جائے، اگلے
دن رودکی دربار میں گیا، نصر شراب پی رہا تھا، رودکی نے ساز کے ساتھ عشاق کی
دھن میں یہ اشعار گائے۔

بوئے جوئے مولیاں آید ہمے	یاد یار مہرباں آید ہمے
ریگ آموی و درشتیہائے او	زیر پایم پرنیاں آید ہمے
آب جیحوں (یعنی دریائے جیحوں) با ہمہ پہناوری	خنگ مارا تامیاں آید ہمے
اے بخارا شاد باش و شاد زی	شاہ سویت میہماں آید ہمے
شاہ سرو است و بخارا بوستاں	سرو سوئے بوستاں آید ہمے
شاہ ماہ است و بخارا آسماں	ماہ سوئے آسماں آید ہمے

نصر کا یہ حال ہوا کہ پاؤں میں موزے تک نہ پہنے اور اسی وقت سوار ہو کر بگ ٹٹ
دوڑاتا ہوا پوری ایک منزل پر جا کر دم لیا۔ سمرقندی نے یہ واقعہ لکھ کر حیرت ظاہر کی ہے۔
"کہ یہ ایک سیدھی سادھی نظم ہے۔ نہ کوئی صنعت ہے نہ مضمون بندی ہے، اس کا اس
قدر اثر کیونکر ہو سکتا تھا" دولت شاہ کے زمانے میں شاعری کی اصلی اور فطری حالت
بدل چکی تھی۔ اس لئے لوگوں کو واقعیت اور اظہار فطرت میں مزہ نہیں آتا تھا لیکن جب تک
قوم میں صحیح مذاق باقی رہا، شعراء ان اشعار پر سر دھنتے تھے، عروضی سمرقندی جو خود بہت

بڑا شاعر تھا چہار مقالہ میں لکھتا ہے۔

"ہنوز ایں قصیدہ را کسے جواب نگفتہ است کہ مجال آں ندیدہ اند کہ ازیں مضایق بیروں روند۔"

سلطان سنجر کے ملک الشعرا امیر معزی سے فرمائش کی گئی تھی۔ کہ اس قصیدے کا جواب لکھے، چنانچہ اس نے جو قصیدہ لکھا۔ اس کا مطلع یہ ہے۔

رستم از مازندراں آید ہمے	زیں ملک از اصفہاں آید ہمے (ممدوح کا نام)

امیر معزی مشہور اور کامل الفن شعرا میں سے ہے۔ لیکن رودکی کے کلام کے سامنے اس کے شعر کا جو رتبہ ہے۔ محتاج اظہار نہیں، رودکی نہایت پُرگو تھا۔ رشیدی سمرقندی نے اس کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ بتائی ہے۔ چنانچہ کہتا ہے۔

شعر او را بر شمردم سیزدہ رہ صد ہزار میں نے اسکے اشعار تیرہ دفعہ گنے تو ایک لاکھ ٹھیرے	ہم فزوں تر آید، ار چناں کہ باید بشمری اور اچھی طرح گنے جائیں تو اس سے بھی زیادہ نکلیں گے

اقسام سخن میں رودکی کے ہاں، قصیدہ، رباعی، قطعہ، غزل، مرثیہ، سب کچھ موجود ہے۔ مثنوی کا کوئی نمونہ موجود نہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ کلیلہ ومنہ جو اس نے لکھی ہے مثنوی ہی ہوگی، کیونکہ مسلسل واقعات مثنوی کے سوا اور کسی طرح ادا نہیں ہو سکتے۔

رودکی کی شاعری کی وسعت مضامین کے لحاظ سے بھی اس کی شاعری کا دائرہ نہایت وسیع ہے یعنی واقعہ نگاری، خیال بندی، موعظت و نصیحت، عشق و محبت، مدح و ثنا، صنائع و بدائع سب چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اور درجہ کمال پر پائی جاتی ہیں۔ ہم مختصراً ہر ایک کا نمونہ پیش

ؔ۱ جس زمانے میں مَیں علی گڑھ کالج میں پروفیسر تھا، آسمان جاہ (وزیر ریاست حیدرآباد دکن) علی گڑھ میں آئے۔ سرسید مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ سپاسنامہ کے بجائے کالج کی طرف سے قصیدہ پیش کیا جائے گا۔ وہ تم لکھ دو، میں نے ایک خاص مناسبت سے، اسی قصیدہ کو پیش نظر رکھا۔ ابتدا میں یہ تمہید تھی کہ لوگوں میں آسمان جاہ کی آمد کا چرچا ہے۔ پھر یہ اشعار تھے:۔

ہمچناں باشیم گرم گفتگو	قاصد از در ناگہاں آید ہمے
افگند شور مبارک باد وپس	ایں حدیثش بر زباں آید ہمے
آسماں جاہ از سوے ملک دکن	جانب ہندوستاں آید ہمے

ؔ۲ مجمع الفصحا ذکر رودکی۔

کرتے ہیں۔

اخلاق وموعظت اخلاق وموعظت میں حسنِ ادا کے ساتھ، اس نے دقیق نکتے بھی بیان کئے ہیں، مثلاً اس کو یہ کہنا کہ تم کو اوروں کی خوشحالی پر رشک اور حسد نہیں کرنا چاہیے۔ اس کو وہ اس طرح دلنشین کرتا ہے۔

زمانہ پندے آزادہ وار، داد مرا — زمانہ را چو نکو بنگری ہمہ پنداست
بروزِ نیک کساں گفت غم مخور زنہار — بسا کسا کہ بروزِ تو آرزومنداست

یعنی جس طرح تم اوروں کی خوش قسمتی پر رشک کرتے ہو۔ اسی طرح دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو تمہاری حالت پر رشک کرتے ہیں اسلئے تم کو شکایت کا کوئی موقع نہیں۔ اکثر آدمی لوگوں کی بخالت کی شکایت کرتے ہیں لیکن اُن کو یہ خیال نہیں آتا کہ کسی شخص کی بخالت اور سخاوت پر توجہ کرنا گداطبعی اور طماعی کی دلیل ہے۔ رودکی اس نکتہ کو یوں ادا کرتا ہے۔

تا کے گوئی کہ اہلِ گیتی — در ہستی و نیستی لئیمند
چوں تو طمع از جہاں بریدی — دانی کہ ہمہ جہاں کریمند

زمانہ کی بے ثباتی کو اس طرح ادا کرتا ہے۔

زندگانی چہ کوتہ و چہ دراز — نہ بہ آخر بمرد باید باز
ہم بہ چنبر گزار خواہد بود — ایں رسن را اگرچہ ہست دراز
خواہی اندر عنا و محنت زی — خواہی اندر نشاط و نعمت و ناز
خواہی اندک تر از جہاں بپذیر — خواہی از رے بگیر تا بہ حجاز
ایں ہمہ بود و باد تو خواب است — خواب را حکم نے مگر بہ مجاز
ایں ہمہ روز مرگ اگر بینی — نشناسی ز یکدگر شاں باز

اپیکورس اور عمرخیام کے فلسفہ کو غالباً فارسی میں اول اسی نے روشناس کیا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے۔

شاد زی، باسیاہ چشماں شاد — کہ جہاں نیست جز فسانہ و باد
ز آمدہ شادماں نہ باید بود — وز گذشتہ نکرد باید یاد
نیک بخت آں کسے کہ داد و بخورد — شور بخت آں کہ او نخورد و نہ داد

باد، ابر است، ایں جہاں افسوس	بادہ پیش آر، ہر چہ بادا باد

خواجہ حافظؒ کا سارا دیوان اسی متن کی شرح ہے۔

روئے بہ محراب نہادن چہ سود ایزد تا وسوسۂ عاشقے	دل بہ بخارا و بتان طراز از تو پذیرد، نہ پذیرد نماز

واقعہ نگاری یعنی کسی واقعہ یا حالت کی تصویر کھینچنا شاعری کا ایک عنصر ہے۔ رودکی کے کلام میں یہ عنصر ہر جگہ نظر آتا ہے۔ ایک قصیدہ میں اس نے جوانی اور بڑھاپے کی کیفیت بیان کی ہے۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں۔

مرا بسود و فرو ریخت ہر چہ دنداں بود	نہ بود دنداں، لابل، چراغ خنداں بود
یکے نماند کنوں، ابل ہمہ بسود و بریخت	چہ نحس بود ہمانا کہ نحس کیواں بود
نہ نحس کیواں بود، و نہ روزگار دراز	چہ بود؟ راست بگویم قضائے یزداں بود
ہمے ندانی اے ماہروے غالیہ موئے	کہ حال بندہ ازیں پیش بر چہ ساماں بود
بہ زلف چوگاں نازش ہمیکنی تو بدہ	ندیدہ ای او را آنکہ کہ زلف چوگاں بود
شد آں زمانہ کہ رویش بسان دیبا بود	شد آں زمانہ کہ مویش بسان قطراں بود
شد آں زمانہ کہ او شاد بود و خرم بود	نشاط او بہ فزوں بود و غم بہ نقصاں بود (سیاہ ۱۲)
ہمیشہ دستش زی زلفگاں خوشبو بود	ہمیشہ گوشش زی مردم سخنداں بود
ہمیشہ شاد ندانستمے[1] کہ غم چہ بود	دلم نشاط و طرب را فراخ میداں بود
عیال نہ، زن و فرزند نہ، مؤنت نہ	ازیں ہمہ تنم آسودہ بود و آساں بود
ہمے خرید و ہمے ریخت بے شمار درم	بہ شہر ہر چہ ہمے ترک نار پستاں بود
بسا کنیزک نیکو کہ میل داشت بدو	بشب زیارت او نزد او بہ پنہاں بود
شد آں زمانہ کہ شعر در جہاں بنوشت	شد آں زمانہ کہ او شاعر خراساں بود
تو رودکی را اے ماہرو کنوں بینی	بداں زمانہ ندیدی کہ در خراساں بود
بداں زمانہ ندیدی کہ در چمن رفتے	سرود گویاں گوئی ہزار دستاں بود
کرا بزرگی و نعمت ازیں و آں بودے	ورا بزرگی و نعمت ز آل ساماں بود
بداد میر خراسانش چل ہزار درم	از و فزونی یک پنج میر ماکاں بود
کنوں زمانہ دگر گشت و من دگر گشتم	عصا بیار کہ وقت عصا و انباں بود

[1] غنیمت ہے کہ ایرانی شاعر ہو کر مرد کے بجائے عورت کا نام لیتا ہے۔

مدحیہ مدحیہ شاعری کے جو نمونے پائے جاتے ہیں - اعلیٰ درجہ کے ہیں - اور ان میں خیال آفرینی بھی پائی جاتی ہے۔

شاہے کہ بروز رزم از رادی تا کشتۂ او ازاں کفن سازد	زریں نہد بہ تیر در پیکاں تا خستۂ او، ازاں کند درماں

یعنی بادشاہ اس درجہ کا سخی ہے - کہ لڑائی میں تیر جو استعمال کرتا ہے - ان کی پیکاں سونے کی ہوتی ہیں - جس سے مقصود یہ ہے کہ اگر کوئی شخص زخمی ہو تو پیکاں کو بیچ کر اپنا علاج کر سکے - اور مر جائے تو تجہیز و تکفین کے کام آئے۔

مرثیہ مرثیے متعدد ہیں، اور سب میں مرثیہ کی خالص شان پائی جاتی ہے - ایک مرثیہ میں جو وزیر اعظم کے بیٹے کی وفات پر لکھا ہے حکیمانہ انداز میں وزیر کو صبر کی تلقین کی ہے۔

اے آنکہ غمگینی و سزاواری اے وہ کہ غمزدہ ہے اور غمزدہ ہونا زیبا بھی ہے	و اندر نہاں سرشک ہے باری اے وہ کہ چپکے چپکے آنسو بہاتا ہے
رفت آنکہ رفت، آمد آنکہ آمد جو گیا، گیا، جو آیا، آیا	بود آنچہ بود، خیرہ چہ غم داری جو ہونا تھا ہوا، اب فضول کیوں غم کرتے ہو
ہموار کرد خواہی گیتی را کیا تم زمانہ کو ہموار کرنا چاہتے ہو	گیتی است کے پزیرد ہمواری یہ زمانہ ہے - بھلا وہ کب ہموار ہو سکتا ہے
مستی مکن، کہ نشنود او مستی جوش ظاہر نہ کرو، وہ جوش کا لحاظ نہیں کرتا	زاری مکن، کہ نشنود او زاری فریاد نہ کرو، وہ فریاد نہیں سنتا
شو تا قیامت زاری کن اچھا جاؤ قیامت تک روتے رہو	کے رفتہ را بہ زاری باز آری لیکن جو شخص چلا گیا، کیا وہ رونے سے واپس آ جائیگا

شہید بلخی اور مرادی، جو اس کے زمانے کے مشہور شاعر تھے، اُن کا مرثیہ بھی لکھا ہے جو مجمع الفصحا وغیرہ میں منقول ہے۔

غزل غزل نے اس وقت تک مستقل حیثیت اختیار نہیں کی تھی، قصائد کی ابتدا میں جو تشبیب کرتے تھے یہی اس زمانہ کی غزل تھی - اُس کا نمونہ یہ ہے۔

اے جان سن از آرزوئے تو ہزہ مال	بنمائے یکے روئے بہ بخشائے بریں جاں

دشوار نمائی رُخ و دشوار دہی بوس	آساں بربائی دل و آساں ببری جاں
نزدیک من آسانی تو باشد دشوار	نزدیکِ تو دشواری من باشد آساں
مُشوش است دلم از کرشمۂ سلمیٰ	چناں کہ خاطر مجنوں ز طرۂ لیلیٰ
چو گل شکر دہیم، درد دل شود تسکیں	چو ترش روئے شوی وارہانی از صفرا
ببردہ نرگس تو آب جادوئے بابل	کشادہ غنچۂ تو باب معجز عیسیٰ

والہ داغستانی نے رودکی کی ایک غزل کی نقل کی ہے، جس کا مطلع یہ ہے۔

زہے فزودہ جمال تو زیب آرا را	شکستہ سنبل زلفِ تو مشکِ سارا را

لیکن اِس زمانہ کا یہ انداز نہیں ہے، اِس کے علاوہ اِس غزل کے مقطع میں تخلص بھی مذکور ہے۔ حالانکہ اِس زمانہ تک غزلوں میں تخلص نہیں لاتے تھے۔

رودکی کے ان اشعار کا جو رتبہ ہے۔ ظاہر ہے۔ تاہم عنصری کہتا ہے۔

غزل رودکی وار نیکو بود	غزلہائے من رودکی وار نیست

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عنصری۔ رودکی کو غزل گوئی میں اُستاد مانتا تھا۔ اس لئے یا تو ماننا چاہیئے کہ رودکی کی عمدہ غزلیں جاتی رہیں، یا یہ کہ عنصری غزل گوئی میں رودکی سے بھی کم تھا۔

قصیدہ قصیدہ کا جو طریقہ رودکی نے قائم کیا۔ آج تک قائم ہے یعنی ابتدا میں تشبیب یا بہاریہ وغیرہ پھر بادشاہ کی مدح کی طرف گریز، جود و سخا، عدل و انصاف، شجاعت و دلیری کا ذکر، پھر دعائیہ، صنائع شاعری میں ایک صنعت ہے جس کو **ترصیع** کہتے ہیں۔ یعنی دونوں مصرعوں میں ہم وزن الفاظ لاتے ہیں۔ مثلاً

عرفی	رماد را شررِ قہر او کند شنجرف	جماد را اثرِ لطفِ او کند شمشاد

یہ صنعت رودکی کے تمام قصیدوں میں پائی جاتی ہے۔ اور چھٹی صدی تک تمام شعرا کا یہ عام انداز رہا۔

قصیدہ میں اگرچہ صرف مداحی ہی مداحی ہوتی ہے لیکن رودکی نے جا بجا نیچرل سین بھی دکھلائے ہیں۔

بہار	از بنفشہ مرزہا گستردہ دیباہا بہ چین	وز شگوفہ شاخہا بربستہ دُرّ شاہوار
	باہوائے او ست (زمین) گفتی ہرچہ گفتی در نسیم	بر زمینِ او ست گفتی ہرچہ در عالم بہار

خزاں

از میان جوئے آں آبِ رواں ہمچو گلاب	شاخہائے گل شگفتہ بر کنارِ جوئبار
بود ہر جا بہر نزہت گاہ بادہ و نقل و مُل	گلستاں در گلستان و میوہ اندر میوہ زار
کوہ دیگر کوہ سیمیں گشت و زریں شد چمن	آب دیگر بارہ روشن گشت و تیرہ شد ہوا
گشت خامش فاختہ (برف کی وجہ سے)، تا شد چمن (زرد پتوں کی وجہ سے) پرداختہ	گشت بلبل بے نوا تا بوستاں شد بے نوا (بے سامان)
نار (انار) چوں بر حقۂ زریں نگیں ہائے عقیق (خالی)	سیب چوں بر چہرہ (آواز) سیمیں نشانہائے رگا
باد سرد آمد چو آہِ عاشقاں ہنگام صبح	بانگِ زاغ آمد چو از معشوق پیغامِ جفا

معرکہ جنگ

بدانگہے کہ دو لشکر بروئے یکدیگر	گراں کنند رکاب و سبک کنند عناں
ز گرد اسپاں تیرہ شود رخ خورشید	ز بانگِ مرداں خیرہ شود دل کیواں
یکے کشیدہ سناں و یکے کشادہ حُسام	یکے کشادہ کمند و یکے کشیدہ کماں

قصیدہ کے حسن کا بڑا معیار گریز ہے، یعنی تشبیب کہتے کہتے ممدوح کا ذکر اس طرح چھڑ جائے جس طرح بات میں سے بات پیدا ہو جاتی ہے، یہ بالکل نہ معلوم ہو کہ بہ قصد و ارادہ ممدوح کی مدح شروع کی ہے، رودکی کی اکثر گریزیں اسی قسم کی ہیں۔ مثلاً ایک قصیدہ میں خزاں کا حال لکھتے لکھتے کہتا ہے۔

باد خوارزمی کنارِ باغ پُر دینار کرد	چوں کنار زائراں را کرد دست بادشا

یا مثلاً باغ کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہے۔

یارِ من گفتا بہشت است اے شگفت!! ایں باغ نیست
گفتمش ایں باغیست خرم چوں بہشت کردگار
آں بہشت ناپدید است، ایں بہشت استے عیاں
ایں بہ نقد است آں بہ نسیہ آں نہاں ایں آشکار
آں مکافاتِ نماز است، ایں مکافاتِ مدیح
آں عطائے کردگار است، ایں عطائے شہریار

یعنی معشوق نے باغ کو دیکھکر کہا۔ کہ یہ تو بہشت ہے۔ میں نے کہا بہشت نہیں۔ باغ ہے۔ لیکن خدا کی بہشت کے ہم پلہ ہے۔ فرق یہ ہے کہ خدا کی بہشت کا پتہ نہیں۔ اور یہ علانیہ موجود ہے۔ یہ نقد ہے۔ وہ ادھار، یہ ظاہر ہے۔ وہ مخفی، وہ نماز پڑھنے سے ہاتھ آتی ہے۔ اور یہ مدح کرنے سے، وہ خدا کا عطیہ ہے، اور یہ بادشاہ کا۔

بعض بعض قصیدوں میں ایسی باتوں کا التزام کیا ہے جس کی تقلید کسی نے نہیں کی۔ مثلاً ایک قصیدہ تینتیس ۳۳ شعروں کا ہے جس میں صرف مطلع ہی ہیں۔ پہلا مطلع یہ ہے۔

ندانی درد ہجرانے بت، امرازاں زار گردانی
وگر زارم نگردانی بہ داغ ہجر گردانی

ہجو پاشکائت ہجو فارسی شاعری کے چہرہ کا نہائت بدنما داغ ہے لیکن رودکی کی ہجو میں بھی متانت اور واقعیت پائی جاتی ہے۔

نہ ہے سوار وجوان و توانگر اندرہ دور
پسند آید مر خواجہ را پس از دہ سال
بخدمت آید نیکو سگال نیک اندیش
کہ باز گردد پیر و پیادہ و دل ریش

ممدوح سے کہتا ہے۔ کہ کیا یہ مناسب ہے۔ کہ جو لوگ آپ کے دربار میں جوان دولتمند اور سواریوں پر آئیں، وہ اس قدر آپ کے ہاں امیدواری میں پڑے جھولا کریں، کہ جب واپس جانے لگیں تو دولتمند غریب، اور سوار پیادہ، اور جوان بوڑھا ہو کر جائے۔

جدت مضامین عام قاعدہ یہ ہے۔ کہ ابتدائے شاعری میں مضمون بندی بالکل نہیں ہوتی، لیکن یہ حیرت انگیز بات ہے۔ کہ رودکی نے کثرت سے نئے نئے مضامین پیدا کئے مثلاً۔

گھوڑے کی تعریف

آفتاب ببکہ زچابک قدی
رودکی چند بر گرفت و نواخت
آں عقیقین مے کہ ہر کہ بدید
ہر دو یک گوہرند، لیک بطبع
تابسودہ دو دست رنگیں کرد
بر سر ذرہ نماید جولاں
بادہ انداز، کو سرود انداخت
از عقیق گداختہ نشناخت
ایں بیفسرد، و آں دگر بگداخت
ناچشیدہ بہ تارک اندر تاخت

شراب کی تعریف

یعنی شراب، اور عقیق، دونو ایک ہی چیز ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ایک سیال عقیق ہے اور دوسری منجمد شراب کے رنگ، اور نشہ کی یہ کیفیت ہے کہ بے چھوئے ہوئے ہاتھ رنگین ہو جاتے ہیں۔ اور بے چکھے ہوئے دماغ میں دوڑ جاتی ہے۔

تشبیہ

بنفشہائے طرب خیل خیل سر بر کرد
بیار۔ ہاں بدہ آں آفتاب کش بخوری
چو آتشے کہ بگو گرد بر دوید کبود
ز لب فرو شود از دہاں بر آرد دود

یعنی بنفشہ دستہ دستہ اُگ رہا ہے جس طرح گندھک سے جلانے کے وقت رنگ کا شعلہ اٹھتا ہے۔ اب وہ آفتاب لاؤ (یعنی شراب) کہ ادھر ہونٹوں سے اترے اور ادھر

منہ سے دھواں اٹھنے لگے۔

تیرِ او مانندۂ روزی کہ شے مردم رسد	تیرِ دشمن باز گردد سوئے دشمن چوں صدا

یعنی ممدوح کا تیر اس طرح نشانے پر لگتا ہے جس طرح انسان کا مقدر، اور دشمن کا تیر اس طرح دشمن ہی کی طرف پلٹ جاتا ہے جس طرح آواز،

ہر آنچہ لبست میان ارم بہم شداد سر شکب ابر پراگندہ کرد در بستان	ہر آنچہ کرد بزیر زمیں نہاں قارون نسیم باد پدیدار کرد در ہامون

یعنی باغ ارم میں شداد نے جو چیزیں فراہم کی تھیں، بادل کے آنسوؤں نے وہ سب باغ میں پھیلادیں، اور قارون نے زمین کے اندر جو چیزیں چھپا رکھی تھیں، نسیم نے وہ سب میدان میں کھول کر دکھادیں۔

مہ نیساں شبیخوں کرد، اکنوں برمہ کانوں
کہ گردوں گشت از و پُر گرد، وصحرا گشت ازو پر خوں

اگر خواہی نشان خوں، نگہ کن لالہ بر صحرا	اگر خواہی نشان گرد بنگر ابر بر گردوں

یعنی بہار کے مہینے نے خزاں کے مہینے پر شبخون مارا جس کی وجہ سے صحرا پرخون ہوگیا اور آسمان میں گرد بھر گئی، صحرا میں جو لالہ نظر آتا ہے، یہ وہی خون ہے۔

نگار ینا شنیدستم کہ گاہِ محنت و راحت یکے از کید شد پرخوں، دوم شد چاک از تہمت رخم مانند آں اول، دلم مانند آں دوم	سہ پیراہن سلب بودہ است یوسف را بعمر اندر سوم یعقوب را از بوئے روشن کرد چشم تر نصیب من شود در وصل آں پیراہن دیگر

یعنی اے معشوق! میں نے سنا ہے کہ حضرت یوسف کے تین پیراہن تھے، ایک خون سے رنگین ہوا، دوسرا زلیخا نے چاک کیا، تیسرے نے حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں روشن کیں، میرا چہرہ پہلے پیرہن کے مشابہ ہے۔ اور میرا دل دوسرا پیرہن ہے۔ باقی تیسرا، وہ خدا وصل میں نصیب کرے۔

زلف ترا جیم کہ کرد آں کہ او از دہن تنگ تو گویا کسے یعنی تیرا دہن ایسا چھوٹا ہے کہ معلوم ہوتا ہو	خال ترا نقطۂ آں جیم کرد دانگکے نار بدو نیم کرد کہ کسی نے انار کے دانے کے دو حصے کر دیے ہیں

رباعیاں	رباعیاں معمولی ہیں، مجمع الفصحاء میں ایک رباعی نقل کی ہے۔

چوں کار دلم ز زلف او ماند گرہ	در ہر رگِ جاں صد آرزو ماند گرہ
امید ز گریہ بود، افسوس افسوس	کانہم شب وصل در گلو ماند گرہ

لیکن یہ ہرگز رودکی کے زمانہ کا کلام نہیں ہو سکتا۔

قبولیت عام اور اعتراف شعراء رودکی کے کمال شاعری کو تمام شعرائے تسلیم کیا ہے۔ خود اس کا معاصر اور ہم فن اور ہم پایہ شہید کہتا ہے۔

بسخن ماند شعر شعراء	رودکی را سخنش تلو نبی است
شاعران را خہ و احسنت مدیح	رودکی را خہ و احسنت ہجا ست

عنصری کہتا ہے۔

غزل رودکی وار نیکو بود	غزل ہائے من رودکی وار نیست
اگرچہ بکوشم بہ باریک وہم	دریں پردہ اندر مرا بار نیست

معروف بلخی کہتا ہے۔

از رودکی شنیدم سلطان شاعراں

دقیقی کہتا ہے۔

کرا رودکی گفتہ باشد مدیح	امامِ فنون و سخنور بود
دقیقی مدیح آورد نزد او	چو خرما بسوئے ہجیور بود

نظامی سمرقندی کے زمانہ میں کسی نے رودکی کی شاعری پر اعتراض کیا تھا نظامی نے اُس کے جواب میں لکھا ہے۔

اے آنکہ طعن کردی در شعر رودکی	ایں طعن کردنِ تو از جہل و کودکی است
کانکس کہ شعر داند، داند کہ در جہاں	صاحب قرانِ شاعری، استاد رودکی است

رودکی نے ۳۰۴ھ میں وفات پائی۔ اس کا دیوان ایران میں چھپ گیا ہے۔

دقیقی

سلسلۂ سامانیہ کے ہر فرمانروا کا عہد، اگرچہ بام ترقی کا ایک نیا پایہ ہے لیکن نوح بن منصور کا زمانہ آخر المنازل ہے۔ یہ فخر اسی دور کو حاصل ہے۔ کہ عجم کا سرمایۂ فخر و ناز یعنی "شاہنامہ" جس کو ابن الاثیر، قرآن العجم کہتا ہے۔ اس کا ابتدائی خاکہ اسی عہد میں

قائم ہوا، اور اگر ایک اتفاقی واقعہ پیش نہ آجاتا، تو سلطان محمود کے کارناموں کی فہرست شاہنامہ کے نام سے خالی رہ جاتی۔

سامانی خاندان، ابتداء سے اس بات کا خواہشمند تھا۔ کہ ان کے اسلاف کی داستان نثر سے نظم ہوکر، عام زبانوں پر چڑھ جائے، لیکن ابھی شاعری نے اس قدر ترقی نہیں کی تھی کہ ایک عظیم الشان تاریخی سلسلہ، شعر کے قالب میں آجائے۔ نوح بن منصور جب ۳۶۵ھ میں تخت نشین ہوا۔ تو پایۂ تخت یعنی بخارا میں بڑے بڑے شعراء موجود تھے۔ ان میں دقیقی خاص پایہ تخت کا رہنے والا تھا۔ اس کا اصلی نام منصور بن احمد ہے۔ ابتدائی تربیت امراء چغانیہ یعنی ابوالمظفر نے کی تھی۔ لیکن جب اس کا کمال مشہور ہوا تو نوح نے دربار میں بلاکر، شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت[1] سپرد کی، دقیقی اپنے زور بازو کا اندازہ کرچکا تھا، اس نے یہ خدمت قبول کی۔ اور کم وبیش بیس ہزار شعر لکھے بعضوں کا بیان ہے۔ کہ صرف ایک ہزار شعر تھے۔ جو آج شاہنامہ میں شامل ہیں۔ فردوسی نے شاہنامہ کی تاریخ کے بیان میں ان واقعات کو اس طرح اجمالاً لکھا ہے۔

جوانے بیامد گشادہ زباں	سخنگوی وخوش طبع وروشن رواں
بہ شعر آرم ایں نامہ را گفت من	ازو شادماں شد دل انجمن
زگشتاسپ و ارجاسپ بیتے ہزار	بگفت وسر آمد ورا روزگار

کیا عجیب بات ہے۔ کہ اتنے بڑے کامل الفن کا دامن عزت، ایک اخلاقی دھبے سے داغدار ہے۔ دقیقی کا ایک خوشرو غلام تھا۔ جس سے اس کو عاشقانہ محبت تھی، لیکن افسوس ہے کہ اس محبت میں ہوس کا شائبہ تھا۔ غلام نہایت غیور تھا۔ اس نے ننگ کو گوارا نہ کیا۔ اور دقیقی کا خاتمہ کردیا، فردوسی نے اس ناگوار واقعہ کو ابہام کے پردہ میں ادا کیا ہے۔

جوانیش را خوئے بد یار بود	ابا بد ہمیشہ بہ پیکار بود
یکایک ازو بخت برگشتہ شد	بدست یکے بندہ کشتہ شد

فردوسی نے فیاض دلی سے اس کے اشعار شاہنامہ میں شامل کرئے جس کی بدولت، آج اس کا نام زندہ رہ گیا۔ چنانچہ خود کہتا ہے۔

[1] تذکرہ ہفت اقلیم ومجمع الفصحاء روایت اخیر۔

کنوں راز ہا باز جویم ترا	حدیثِ دقیقی بگویم ترا
چناں دید گوینده یک شب بخواب	کہ یک جام مے داشتے چوں گلاب
دقیقی ز جائے پدید آمدے	بداں جام مے داستانہا زدے
بہ فردوسی آواز دادے کہ مے	مخور جز بہ آئین کاؤس کے
کہ شاہے گزیدے ز گیتی کہ بخت	بنازد بدو تاج و شمشیر و تخت
شہنشاہ محمود گیرندہ شہر	ز شادی بہر کس رسانندہ بہر
بدیں نامہ ار چند بشتافتے	کنوں ہر چہ جستی ہمہ یافتے
از اندازہ من بیش گفتم سخن	اگر باز یابی بخیلی مکن
ز گشتاسپ و ارجاسپ بیتے ہزار	بگفتم سر آمد مرا روزگار
گر آں مایہ نزدِ شہنشہ رسد	روانِ من از خاک بر مہ رسد
بداند کہ پیش از تو آخر کسے	دریں داستاں رنج بردش بسے
بنہ بر فتم و داشتم زو سپاس	مرا در دل آمد ز ہر سو ہراس
کہ روزے مرا ہم بباید گزشت	ز گفتارِ او در نشاید گزشت
ز گفتارِ او بشنو اکنوں سخن	کہ گفت است ایں داستانِ کہن

اِن اشعار کا حاصل یہ ہے۔ کہ ایک دن میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے ہاتھ میں جامِ شراب ہے، دقیقی کہیں سے آنکلا اور اُس نے کہا کہ شراب، کیانی طریقہ سے پیو، تم کو ایسا بادشاہ ہاتھ آگیا ہے۔ جس پر سلطنت کو ناز ہے۔ تم نے شاہنامہ کے لئے بہت تگ و دَو کی، جو تم چاہتے تھے۔ وہ تم کو مل گیا۔ میں نے بھی گشتاسپ و ارجاسپ کے واقع میں ہزار شعر لکھے تھے۔ تم کو اگر یہ اشعار مل جائیں تو اپنی کتاب میں شامل کر دینا کہ بادشاہ تک پہنچ جائیں۔ اور لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ اور بھی کسی نے کچھ محنت اٹھائی تھی۔

یہ سُن کر میرا دل کانپ اٹھا کہ مجھ کو بھی ایک دن مرنا ہے۔ اس لئے اس کی خواہش پوری کرنی چاہیئے۔ اب تم اس کے اشعار سنو۔

فردوسی نے دقیقی کے ساتھ جس ہمدردی اور مُردہ پرستی کا اظہار کیا ہے۔ قدر کے قابل ہے۔ لیکن داستان کے ختم ہوتے ہوتے نیت بدل جاتی ہے۔ دقیقی کے

اشعار کے بعد کہتا ہے۔

نگہ کردم این نظم سست آمدم	ہمہ بیتہا نا درست آمدم
من این زاں نوشتم کہ تا شہریار	بداند سخن گفتن نابکار
وہاں گر بماند ز خوردن تہی	ازاں بہ کہ ناساز خوانے نہی
دو گوہر نمودم بہ گوہر فروش	کنوں شاہ دارد بہ گفتار گوش
سخن چوں بدینگونہ بایدت گفت	نگوی و مکن رنج با طبع جفت
چو طبعت نباشد چو آب رواں	مبر دست، زی نامۂ خسرواں

یعنی جب میں نے دقیقی کی یہ نظم دیکھی تو تمام اشعار مجھ کو سست اور غلط نظر آئے۔ میں نے یہ اشعار اس لئے نقل کر دیئے کہ بادشاہ ان اشعار کی لغویت سے واقف ہو جائے۔ اگر آدمی کو کھانا نہ دیا جائے تو اس سے بہتر ہے۔ کہ اس کے سامنے بدمزہ کھانے لائے جائیں، میں نے گوہر فروش کے سامنے دو موتی رکھ دیئے ہیں، اب بادشاہ خود تمیز کر لے، جب تم کو اس طرح کا شعر کہنا آتا ہے۔ تو اس سے تو نہ کہنا ہی اچھا ہے۔ جب تمہاری طبیعت میں روانی نہیں ہے تو سلاطین کی تاریخ پر کیوں ہاتھ ڈالتے ہو۔ اگر **دقیقی** کا کلام نقل کرنے سے اپنے اشعار کا چمکانا مقصود تھا۔ تو اس غریب پر احسان رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس لئے اندازہ کرنا چاہیئے کہ سلطان محمود کی ہجو میں کس حد تک واقعیت کا پہلو ہو گا۔

فردوسی خدائے سخن ہے۔ اس کے آگے بندوں کو زبان کھولنے کی کیا جرأت ہو سکتی ہے، لیکن ع انصاف شیوہ البیت کہ بالائے طاعت است، ہم سرسری طور پر یہاں دقیقی کے چند اشعار بغیر کسی انتخاب کے نقل کرتے ہیں جس سے **دقیقی** کے رتبۂ کلام کا اندازہ ہو سکے گا، وہ معرکہ آرائی کا سماں اس طرح کھینچتا ہے۔

دقیقی کا اندازِ کلام

ز بس بانگ اسپاں و جوش و خروش	ہمے نالۂ کوس نشنیدہ گوش
درفشاں بسیار افراشتہ	سر نیزہ ہا، ز ابر بگذاشتہ
چو رستہ درخت از بر کوہسار (علم ۱۲)	چو بیشہ نیستان بوقت بہار
ز تاریکی گرد د بانگ سپاہ	کسے روز روشن، نمے دید راہ
بکردند یک تیر باراں نخست	لسان تگرگ بہاراں درست

بپوشید شد چشمۂ آفتاب ۔۔۔ ز پیکانہائے درخشاں چو آب

تو گفتی ہوا ابر آرد ہمے ۔۔۔ وزاں ابر الماس بارد ہمے

ہوا زیں جہاں بود شنگوں شدہ ۔۔۔ زمیں سر بسر پاک درخوں شدہ

در و دشتہا شد ہمہ لالہ گوں ۔۔۔ بہ دشت و بیاباں ہمے ریخت خوں

چناں شد زمیں کشتہ آں رزمگاہ ۔۔۔ کہ برشے نہ تانیست رفتن نگاہ (نہ توانست ۱۲)

فردوسی کے کلام کا جو اصلی جوہر ہے۔ یہی ہے کہ جس واقعہ کو بیان کرتا ہے۔ اس کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ انصاف سے کہو۔ کیا ان اشعار میں یہ بات نہیں؟ بے شبہ فردوسی نے اس وصف کو کمال تک پہنچا دیا۔ لیکن یہ صاف نظر آتا ہے۔ کہ وہی شراب ہے جو دوبارہ کھینچ کر تیز ہو گئی ہے۔ دقیقی کے زمانہ تک فارسی زبان میں عربی الفاظ اس طرح مخلوط تھے کہ دونوں سے مل کر گویا ایک نئی زبان پیدا ہو گئی تھی۔ عباس مروزی کے کل چار شعر ہیں لیکن عربی الفاظ فارسی سے زیادہ ہیں۔ رودکی و شہید بلخی وغیرہ کا کلام بھی اسی کے قریب ہے۔ سب سے پہلے جس نے فارسی زبان کو اس آمیزش سے پاک کر کے مستقل زبان کی حیثیت قائم کی ہے۔ وہ دقیقی ہی ہے۔ اس کے سینکڑوں شعر پڑھتے چلے جاؤ، عربی کا ایک لفظ نہیں آتا۔ دقیقی کی بدقسمتی دیکھو کہ اس فخر کا تاج شہرت کے ہاتھوں نے اس سے چھین کر فردوسی کے سر پر رکھ دیا۔ دقیقی نے زبان کو جس طرح صاف کیا۔ اس کا نمونہ یہ ہے۔

دقیقی کے ہاں عربی الفاظ بہت کم ہیں

چو گشتاسپ را داد لہراسپ تخت ۔۔۔ فرود آمد از تخت و بربست رخت

ق
بہ بلخ گزیں شد بداں نوبہار ۔۔۔ کہ یزداں پرستاں آں روزگار

مراں خانہ را داشتندے چناں ۔۔۔ کہ مر مکہ را تازیاں ایں زماں (اہل عرب ۱۲)

بداں خانہ شد شاہ یزداں پرست ۔۔۔ فرود آمد آں جا و ہیکل ببست

ببست آں در آفریں خانہ را ۔۔۔ دراں خانہ نگزاشت بیگانہ را

بپوشید جامہ پرستش، پلاس (عبادت گاہ ۱۲) ۔۔۔ خدا را چنیں داشت باید سپاس

بیفگند یارہ فرو ہشت موئے (کنگن، انداخت، گری ۱۲) ۔۔۔ سوئے روشن دادگر کرد روئے

نیایش ہمے کرد خورشید را ۔۔۔ چناں بود آئین جمشید را

چو گشتاسپ بر شد بہ تخت پدر ۔۔۔ کہ فرّ پدر داشت بخت پدر

بسر بر نہاد آں پدر دادہ تاج	کہ زیبندہ باشد بر آزادہ تاج
منم گفت یزداں پرستندہ شاہ	مرا ایزد پاک داد ایں کلاہ
بداں داد مارا کلاہِ بزرگ	کہ بیروں کنیم از رمہ میش گرگ
سوئے راہ درزاں نیاریم چنگ	بر آزادہ گیتی نداریم تنگ
پس از دخترِ نامور (مسافر ۱۲) قیصرا	کہ ناہید بد نام آں دخترا
کتایونش خواندی گرانمایہ شاہ	دو فرزندش آمد چو خورشید و ماہ
یکے نامور فرخ اسفندیار	شہے کارزاری، نبردہ سوار
پشوتن دگر گرد شمشیر زن	شہے نامبردار (سپاہی ۱۲) لشکر شکن
چو یک چند گاہے برآمد بریں	درختے پدید آمد اندر زمیں
از ایواں گشتاسپ بمیان کاخ	درختے گشن برگ، و بسیار شاخ
ہمہ برگ او پند، بارش خرد	کسے کو چنو بر خورد کے مرد
خجستہ پے نام او زردہشت	کہ اہرمن بدکنش را بکشت

ان اشعار میں جا بجا فکِ اضافت اور الف اشباع ہے۔ جو آج کل متروک و معیوب ہے، لیکن قدماء کے ہاں اس کا عام رواج تھا، فردوسی بے تکلف ان چیزوں کو برتتا ہے۔

دقیقی نے مثنوی کے ساتھ، قصیدہ اور غزل کو بھی ترقی دی، یہ دو شعر جو عام طور پر لوگوں کی زبانوں پر جاری ہیں۔ اسی کی غزل کے ہیں۔

گویند صبر کن کہ ترا صبر بر دہد	آرے دہد ولیک بہ عمر دگر دہد
من عمر خویشتن بہ صبوری گذاشتم	عمر دگر بباید تا صبر بر دہد

اس نے بعض غزلیں مسلسل لکھی ہیں۔ اور یہ اُس زمانہ کے لحاظ سے بالکل نئی بات ہے۔ اس کی شاعری کی بڑی خصوصیت یہ ہے۔ کہ رزم و بزم، اور عشق و عاشقی کے دائرہ میں محدود نہیں، آج جس چیز کو لوگ نیچرل شاعری کہتے ہیں۔ فارسی میں غالباً سب سے پہلے اِسی نے اِس کی بنیاد قائم کی، ایک قصیدہ میں بہار کا سماں دکھایا ہے اس میں خوشرنگ اور رنگ برنگ پھولوں کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے۔

نیچرل شاعری

سحر گاہاں کہ بادِ نرم جنبد	بجنباند درختِ سُرخ و اصفر

تو پنداری کہ از گردوں ستارہ	ہمے بارید بر دیبائے اخضر
نگار اندر نگار و لون در لون	ہزاراں در رشتہ پیکر بہ پیکر (سنجاب)

غزل مسلسل

ایک مسلسل غزل بہار کی رنگینی اور مے و معشوق پر لکھی ہے۔

در افگند اے صنم ابر بہشتی	زمیں را خلعت اردی بہشتی
زمیں برساں خون آلود دیبا	ہوا برساں مشک اندودہ دشتی
بداں ماند کہ گوئی از مے و مشک	مثال دوست بر صحرا نوشتی (تصویر ۱۲)
بتے رخسار او ہم رنگ یاقوت	مے بر گونہ جامہ کنشتی
جہاں طاؤس گونہ گشت گوئی	بجائے نرمی و جائے درشتی
ز گل بوئے گلاب آید بداں ساں	کہ پنداری گل اندر گل سرشتی
دقیقی چار خصلت برگزیدست	بہ گیتی از ہمہ خوبی و زشتی
لب یاقوت رنگ و نالہ چنگ	مے چوں زنگ و کیش[1] زردہشتی (مذہب)

شہید بلخی

زمانہ کی ناقدردانی کی شکایت

اس دور کا مشہور شاعر ہے مختصر تذکرہ اس کا اوپر گزر چکا، اشعار کا نمونہ یہ ہے۔

تشبیہات

دانش و خواستہ است نرگس و گل	کہ بہ یک جائے نشگفتند بہم
ہر کرا دانش است خواستہ نیست	ہر کرا خواستہ است دانش کم
اگر غم را چو آتش دود بودے	جہاں تاریک بودے جاودانہ
دریں گیتی سراسر گر بگردی	خردمندے نیابی شادمانہ
بر فلک ہر دو شخص پیشہ ورند	ایں یکے درزی، آں دگر جولاہ
ایں نہ دوزد مگر کلاہ ملوک	واں نہ بافد مگر پلاس سیاہ
ابر ہمے گرید چوں عاشقاں	باغ ہمے خندد معشوق وار
رعد ہمے نالد مانند من	چوں کہ بنالم بہ سحرگاہ زار
چوں چلیپائے روم زاں شد باغ	کاب ریزے است باغ را ز حلی

[1] یعنی زردشتی، کیونکہ زردشت کے مذہب میں شراب حلال ہے ۱۲

موعظت و نصیحت

ابر چوں چشم ہند بن عتبہ است	برق مانند ذوالفقار علیؓ
عیب باشد بہ کار نیک درنگ	گر شتاب آید اے رفیق ملام
عاقبت را ہم از نخستین بین	تا بہ غفلت گلو نہ گیرد دام

ابو شکور بلخی

۳۳۶ھ میں تھا۔ اس کا کلام بہت کم ملتا ہے لیکن جس قدر موجود ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاعری کا ہر قدم آگے بڑھ رہا ہے، سقراط سے کسی نے پوچھا تھا۔ کہ آپ کو اس قدر تحقیقات و تدقیقات کے بعد کیا معلوم ہوا؟ اس نے کہا "یہ معلوم ہوا کہ کچھ نہیں معلوم ہوا" اس فلسفیانہ خیال کو کس قدر عمدہ اور شاعرانہ انداز میں ادا کیا ہے۔

تا بدآنجا رسیدہ دانش من	کہ بدانم ہمے کہ نادانم

یعنی میرا علم اس حد تک ترقی کر گیا کہ میں نے اب جان لیا کہ میں کچھ نہیں جانتا اس کی مثنوی کے چند اشعار جو منقول ہیں۔ اُن میں صاف شاہنامہ کا رنگ نظر آتا ہے

بہ دشمن برت مہربانی مباد	کہ دشمن درختے است تلخ از نہاد
درختے کہ تلخش بود گوہرا	اگر چرب و شیریں دہد مر درا
ہماں میوۂ تلخت آرد پدید	ازو چرب و شیریں نخواہی مزید

اسی مضمون کو فردوسی نے زیادہ بلند کر دیا ہے۔

درختے کہ تلخ است ویرا سرشت	گرش برنشانی بہ باغ بہشت
ور از جوئے خلدش بہنگام آب	بہ بیخ انگبیں ریزی و شہد ناب
سر انجام گوہر بہ کار آورد	ہماں میوۂ تلخ بار آورد

خبازی نیشاپوری

دولت سامانیہ کا مشہور شاعر ہے ۳۴۲ھ میں وفات پائی اس کا کلام بالکل نایاب ہے۔ ایک قصیدہ کی گریز کے دو شعر مشہور ہیں۔ جن میں متاخرین کی جدت مضمون کے ساتھ نیچرل رنگ بھی موجود ہے۔

سے ہمینی آں دو زلف کہ بادش ہمے برد	گوئی کہ عاشقی است کہ ہیچش قرار نیست
یا نہ کہ دست حاجب سالار لشکر است	گز دور مے نماید کامروز بار نیست

یعنی معشوق کی زلف جو ہوا سے ہل رہی ہے، گویا ایک بےچین عاشق ہے۔ یا شاہی نقیب کا ہاتھ ہے۔ جو دور سے اشارہ کر رہا ہے۔ کہ آج دربار نہ ہوگا۔

عمارہ مروزی

مرو کا رہنے والا تھا، ۳۶۵ھ میں انتقال کیا، کلام کا نمونہ یہ ہے۔

آتش اگر ندیدی با آب ممتزج	اینک نگاہ کن تو بدیں جام وایں شراب
جام بلور و لعل مے صاف اندرو	گوئیکہ آتشے ست بر آمیختہ بہ آب

ان شعراء کے علاوہ اس دور میں اور بہت سے خوشگو اور خوش فکر تھے مثلاً العجمی الطخاری۔ ابوالعباس زنجی۔ جوئباری۔ ابوالمثل بخاری طلحہ۔ وغیرہ لیکن چونکہ ان کے حالات اور اشعار بہت کم ملتے ہیں۔ اس لئے ہم ان کے نام قلم انداز کرتے ہیں۔

غزنویہ

شاعری اگرچہ ابتدائے ظہور سے روز افزوں ترقی کرتی جاتی تھی لیکن غزنویہ دور میں انتہائے کمال تک پہنچ گئی، فردوسی، اسدی، طوسی، عنصری، فرخی، حکیم سنائی، منوچہری دامغانی، جن میں ہر شخص اقلیم سخن کا صاحب تاج و تخت ہے اسی عہد کی یادگار ہیں۔

غزنوی خاندان کا اجمالی تذکرہ

سلسلہ غزنویہ، حقیقت میں سامانی حکومت کی ایک شاخ ہے۔ عبدالملک بن نوح سامانی المتوفی ۳۵۰ھ کے زمانہ میں الپتگین جو اسی خاندان کا غلام تھا، ترقی کر کے امارت کے درجہ تک پہنچ گیا، عبدالملک نے اس کو خراسان کا حاکم مقرر کر دیا۔ عبدالملک کے بعد جب اس کا بیٹا منصور تخت نشین ہوا۔ تو الپتگین، خراسان چھوڑ کر غزنین چلا گیا۔ اور یہاں ۱۶ برس تک حکومت کر کے وفات پائی، اس کے بعد اس کا بیٹا ابواسحق قائم مقام ہوا، لیکن چند روز کے بعد مر گیا، الپتگین کا ایک غلام سبکتگین تھا۔ اس نے الپتگین کے عہد میں ایسی قابلیت کے جوہر دکھائے۔ کہ ابواسحق کے بعد لوگوں نے ۳۶۵ھ میں اسی کو غزنین کا حاکم مقرر کر دیا۔ یہی غلام (درغلام) سلطنت غزنویہ کا بانی اول

ہے۔ اور سلطان محمود فاتح ہندوستان اسی نامور کا فرزند ہے۔ سبکتگین پہلا شخص ہے۔ جس نے ہندوستان کو تسخیر کی نگاہ سے دیکھا۔ اور جیپال کو بار بار سخت شکستیں دیں۔ سامانی دربار سے اس کو ناصر الدین کا خطاب ملا۔ ۳۸۷ھ میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اسمٰعیل جو الپتگین کی دختر کے بطن سے تھا بلخ میں تخت نشین محمود غزنیں میں تھا۔ اس نے بھائی کو لکھا۔ کہ آپ بلخ میں حکومت کیجئے لیکن غزنیں میرے قبضہ میں رہنے دیجئے۔ اُس نے نہ مانا۔ اس پر جنگ ہوئی۔ اور اسمٰعیل نے شکست کھائی۔ محمود باپ کی زندگی ہی میں نوح سامانی کے دربار سے سیف الدولہ کا خطاب حاصل کر چکا تھا تخت نشینی کے بعد اس کو بغداد کے دربار سے یمین الدولہ کا لقب ملا۔

محمود کی شاہانہ فتوحات اور معرکہ آرائیاں ایک دلچسپ داستان ہے۔ جس کی آواز بازگشت آج بھی ہندوستان کے در و دیوار سے آ رہی ہے لیکن شعر العجم کی زبان سے اس کے ملکی فتوحات کے بجائے علمی فتوحات کا ترانہ زیادہ موزوں ہوگا۔

سلطان محمود کے علمی کارنامے محمود جس طرح فاتح و کشورستان تھا۔ اسی طرح علم و فضل میں بھی کمال رکھتا تھا۔ جواہر مضیئہ جو فقہائے حنفیہ کے حالات میں ایک نہایت مستند کتاب ہے اس میں اس کو فقہا میں شمار کیا ہے۔ فقہ میں خود اس کی ایک مبسوط تصنیف موجود ہے۔ غزنیں میں اس نے ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا تھا جس کے ساتھ ایک عجائب خانہ بھی تھا جس میں تمام دنیا کے نوادر موجود تھے[1]۔ ملک میں جو بڑے بڑے مشاہیر فن تھے اکثروں کو بلا کر دربار میں جگہ دی تھی، ان میں سے ایک ابوریحان بیرونی بھی تھا۔ جو متعدد فنون میں بوعلی سینا کا ہمپایہ وہمسر تھا۔ بوعلی کو بھی اس نے خوانِ کرم پر دعوت دی تھی لیکن اس کو کچھ وہم پیدا ہوا اور نہ آیا۔

شعراء کی تربیت اور فیاضی شاعری پر اس نے خصوصاً شاہانہ توجہ کی، ایک مستقل محکمہ قائم کیا۔ اور عنصری کو ملک الشعراء کا خطاب دے کر اس کا افسر مقرر کیا۔ تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ محمود کے خوانِ کرم سے چار سو شاعر بہرہ یاب تھے، جنکو حکم تھا کہ جو کچھ کہیں پہلے عنصری کو دکھلا کر پھر دربار میں لائیں۔ ایک موقع پر جب شہزادہ مسعود خراسان سے غزنیں میں آیا اور شعرا نے دربارِ عام میں قصائد پیش کئے۔ تو ایک ایک شاعر کو بیس بیس ہزار اور زینبی اور عنصری کو پچاس پچاس ہزار درہم عطا کئے[2]۔ غضائری کو دو شعروں

[1] تاریخ فرشتہ ۱۲ [2] مجمع الفصحا، تذکرہ زینبی ۱۲

پر دو توڑے دیئے۔ چنانچہ عنصری خود کہتا ہے۔

مرا دو بیت بفرمود شہر یار جہاں دو بدرہ زر بفرستاد و دو ہزار درم	براں صنوبر عنبر غدار مشکین خال بر غم حاسد و تیمار بدسگال نکال

عنصری کو ایک رباعی پر حکم دیا کہ اُس کا مُنہ جواہرات سے بھر دیا جائے۔

ان واقعات کو ایک نکتہ چین محمود کے فضائل کے بجائے، اس کے معائب کے دفتر میں لکھے گا۔ اور واقعی، مداحوں اور خوشامد گویوں کی ایک فوج کثیر بہم پہنچانا اور ان پر زر و جواہر کا مینہ برسانا، فیاضی نہیں، بلکہ اسراف اور سبک سری ہے لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ محمود کی یہ فیاضیاں، مدح پسندی کی غرض سے نہیں، بلکہ فن ادب و تاریخ کی ترقی کی غرض سے تھیں، اس نے فردوسی سے شاہنامہ لکھوا کر عجم پر یہ احسان کیا۔ کہ عجم گو خود مٹ گیا، لیکن اس کے کارنامے آج تک نہ مٹ سکے، اسلامی فتوحات، مسلمانوں کے مذہبی ترانے ہیں لیکن مسلمان، خالد، وضرار، کے بجائے، رستم، و سہراب کے نام سے زیادہ آشنا ہیں، عبد الملک، ولید، مقتدر، معتضد، معتصم، مستعصم کو کتنے آدمی جانتے ہیں! لیکن جم و کیخسرو، کیکاؤس و فریدوں، افراسیاب و اسفندیار کو بچہ بچہ جانتا ہے۔

عنصری نے ۸۰ اشعروں کا قصیدہ لکھا جس میں محمود کی تمام لڑائیاں نہایت تفصیل سے بیان کیں[1]، بدایعی بلخی نے نوشیرواں کا نصیحت نامہ نظم کیا، اسدی طوسی نے لغات فارسی کی تدوین کی اور بدائع و صنائع فارسی پر ایک کتاب لکھی، تاریخ و لغات کے علاوہ محمودی شعراء نے اصل فن کو ترقی دی اور شاعری کو اس قابل کر دیا کہ جس قسم کے مطالب چاہیں ادا کر سکیں، واقعہ نگاری، معاملہ بندی، اظہار جذبات، قدرتی مناظر کی تصویر غرض شاعری کے جتنے انواع ہیں سب ان کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ **غزل** البتہ رہ گئی۔ لیکن ابھی اسلام کی ترقی کا شباب تھا۔ ابھی سے اس فتنۂ خوابیدہ کے جگانے کی کیا ضرورت تھی۔

محمودی شعراء اگرچہ بے شمار ہیں، لیکن جن ناموروں کو محمود نے ندما میں داخل کر لیا تھا۔ اور جو آسمان سخن کے سبعہ سیارے تھے یہ ہیں عنصری، فردوسی، اسدی، عسجدی، عنقاری، فرخی، منوچہری،

[1] تذکرہ دولت شاہ سمرقندی ۱۲

عنصری

حسن بن احمد نام، ابو القاسم کنیت، عنصری تخلص، بلخ کا رہنے والا تھا، آغاز شباب میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا، چونکہ آبائی پیشہ تجارت تھا، خود بھی تجارت شروع کی ایک دفعہ اسی ضرورت سے سفر کو نکلا، راہ میں ڈاکہ پڑا اور جو کچھ کائنات تھی سب جاتی رہی۔

عنصری نے تجارت کا خیال چھوڑ کر علم کی طرف توجہ کی، اس زمانہ میں تحصیل علم کے لئے فیس وغیرہ کا کچھ جھگڑا نہ تھا۔ ہر جگہ، ہر طرف بڑی بڑی درسگاہیں کھلی ہوئی تھیں۔ اور جو شخص جس آزادی سے پڑھنا چاہتا تھا۔ پڑھ سکتا تھا، عنصری نے تمام متداول علوم و فنون حاصل کئے، لیکن طبیعت کو قدرتی لگاؤ شاعری سے تھا۔ اس لئے شاعری کو اپنا فن قرار دیا اور اسی ذریعہ سے، سلطان محمود کے چھوٹے بھائی نصر بن سبکتگین کے دربار میں پہنچا۔ نصر نے جوہر قابل دیکھ کر محمود کے دربار میں تقریب کی، رفتہ رفتہ ملک الشعرا کا خطاب ملا، سلطان محمود نے حکم دیا کہ دربار کے تمام شعرا جن کی تعداد چار سو تھی، اپنا کلام عنصری کو اصلاح کی غرض سے دکھائیں، اور جس کا کلام پیش ہو، عنصری کی اصلاح کے بعد پیش ہو۔ بڑے بڑے نامور شعراء عنصری کی مدح میں قصائد لکھ کر پیش کرتے تھے۔ اور گراں بہا صلے پاتے تھے۔ محمود کی شاہانہ فیاضیوں نے عنصری کو دولت و مال سے اس قدر مالا مال کر دیا کہ چار سو زریں کمر غلام، رکاب میں ساتھ چلتے تھے۔ اور جب سفر کرتا تو اس کا ساز و سامان جو عموماً طلائی، نقرئی ہوتا تھا۔ چار سو اونٹوں پر بار کیا جاتا تھا، انتہا یہ کہ دیگیں بھی طلائی اور نقرئی ہوتی تھیں[1]۔ اکثر شعراء نے عنصری کی دولتمندی کا ذکر حسرت و رشک کے ساتھ کیا ہے۔ خاقانی کہتا ہے۔

ملک الشعرائی کا خطاب

عنصری کی دولت و ثروت

شنیدم کہ از نقرہ زد دیگداں	ز زر ساخت آلاتِ خوان عنصری

محمود کے دربار میں چار سو شعراء تھے۔ جن میں فرخی۔ عسجدی۔ عضائری۔ منوچہری جیسے قادر الکلام بھی شامل ہیں۔ لیکن یہ بات اسی کو حاصل ہوئی کہ سلطان محمود کا بقائے نام اسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ نظامی سمرقندی کہتا ہے۔

[1] عنصری کے حالات زیادہ تر مجمع الفصحاء و تذکرہ دولت شاہ سمرقندی سے لئے گئے ہیں ۱۲

بسا کاخا کہ محمود ش بنا کرد		کہ از رفعت ہمے بامہ مسر ندا کرد	
نہ بینی زاں ہمہ یک خشت برپائے		مدیح عنصری ماندا ست برجائے	

عنصری نے سلطان محمودؒ کی وفات کے تقریباً دس برس بعد ۴۳۱ھ میں وفات پائی۔ اس کے اشعار کی تعداد ۳۰ ہزار بیان کی جاتی ہے۔ جن میں اب صرف تین ہزار موجود ہیں۔ قصائد کے سوا متعدد مثنویاں بھی لکھی تھیں۔ مثلاً وامق وعذرا، سُرخ بت و خنگ بت، شہر و عین، لیکن آج بالکل ناپید ہیں۔ اس زمانہ تک شاعری کا بڑا لازمہ ندیمی یعنی فن مجلس تھا۔ جو شاعر جس قدر زیادہ اس فن میں کمال رکھتا تھا۔ اُسی قدر زیادہ کامیاب ہوتا تھا۔ اس کے لئے سب سے مقدم چیز بدیہہ گوئی تھی۔ **عنصری** اس وصف میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ وہ نہایت پُر گو تھا اور برجستہ کہتا تھا۔ آتشکدہ میں لکھا ہے۔ کہ ایک موقع پر رات بھر میں ہزار شعر کہ ڈالے۔ اِس کی بدیہہ گوئی کے واقعات تذکروں میں کثرت سے ملتے ہیں۔

عنصری کی بدیہہ گوئی

سلطان محمود کو ایاز سے جو محبت تھی۔ اگرچہ حد سے متجاوز تھی لیکن ہوس کا شائبہ نہ تھا۔ ایک دن بزم عیش میں بادہ و جام کا دور تھا محمود خلاف عادت معمول سے زیادہ بیکر بدمست ہوگیا۔ اسی حالت میں **ایاز** پر نظر پڑی۔ اس کی شکن در شکن زلفیں چہرہ پر بکھری ہوئی تھیں۔ محمودؒ نے بے اختیار اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے لیکن فوراً سنبھل گیا اور جوش تقوی میں آکر ایازؔ کو حکم دیا کہ زلفیں کاٹ کر رکھ دے۔ ایازؔ نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔[1] صبح کو جب محمود سو کر اٹھا تو ایاز کی صورت دیکھ کر سخت مکدّر ہوا۔ بار بار اُٹھ اُٹھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ نُدما اور مقربین دم بخود تھے۔ آخر علی قریبؔ نے جو حاجب خاص تھا۔ عنصری کو بلا کر صورتِ واقعہ بیان کی، عنصری نے **محمود** کے سامنے جا کر یہ رباعی پڑھی۔

نہ جائے بہ غم نشستن وخاستن است		گر عیب سرِ زلف بت، از کاستن است	
کاراستن سرو ز پیراستن است		وقتِ طرب و نشاط، و مے خواستن است	

یعنی اگر معشوق کی زلفیں ترش گئیں تو یہ رنج و غم کی کیا بات ہے۔ یہ تو اور خوشی کا موقع ہے۔ اس لئے کہ سرو جب چھانٹ دیا جاتا ہے۔ تو اور زیادہ موزوں ہو جاتا ہے محمود

[1] شعراء نے اس واقعہ سے مضامین پیدا کئے، مرزا صاحب کہتے ہیں۔ یا از گلیم خویش بنا بید راز کرد؛ تیغ ستم ہمیں چہ بزلف ایاز کرد۔

نے حکم دیا کہ عنصری کا مُنہ جواہرات سے بھر دیا جائے، چنانچہ تین دفعہ ایسا کیا گیا چہار مقالہ میں لکھا ہے کہ مُنہ کے بجائے دامن بھرا گیا تھا۔ فیاضی کے مبالغہ کے لحاظ سے یہی روائت صحیح ہو لیکن مُنہ بھرنے میں جو بات ہے۔ وہ دامن میں نہیں۔

ایک دفعہ سلطان نے فصد لی، عنصری نے برجستہ کہا۔

آمد آں رگ زنِ مسیح پرست	نیش الماس گوں گرفتہ بدست
طشتِ زرّیں وآبدستاں خواست	بازوئے شہر یار را بر بست
نیش بگرفت و گفت ع۔ علیک	ایں چنیں دست را کہ یارو خست
سر فرو بُرد و بوسہ بر داد	وز سمن شاخ ارغواں برجست

پہلے شعر سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اوج ترقی کے زمانہ میں بھی جراحی و فصادی کا کام عیسائی کرتے تھے۔ ایک دفعہ محمود، چوگاں کھیلنے میں گھوڑے سے گر پڑا، خفیف سا زخم آیا عنصری نے فی البدیہہ کہا۔

شاہا! ادبے کن فلک بد خو را	کاسیب رسانید رخ نیکو را
گر گوی خطا رفت بہ چوگانش زن	در اسپ غلط کرد ابمن بخش اورا

اخیر مصرع دو پہلو رکھتا ہے۔ ایک یہ کہ گھوڑے نے اگر غلطی کی تو میری خاطر اُس کو بخش دیجئے، دوسرے یہ کہ گھوڑا اگر غلط رَو ہے۔ تو مجھے دے ڈالئے محمود نے اِس حسن طلب کے صلہ میں گھوڑا عنصری کو دے دیا، عنصری نے ایک اور رباعی گھوڑے کی طرف سے معذرت میں لکھی۔

رفتم بر اسپ تا بزارش بکشم	گفتا کہ نخست بشنو ایں عذر خوشم
نے گاوِ زمینم کہ جہاں برگیرم	نے چرخ چہارمم کہ خورشید کشم

یعنی میں نے گھوڑے کو سزا دینے کا قصد کیا، گھوڑے نے کہا۔ پہلے میرا عذر تو سُن لیجئے، کچھ میں گاؤ زمین تو نہیں ہوں۔ کہ عالم کا بار اٹھالوں، نہ چوتھا آسمان ہوں کہ آفتاب کو لئے پھروں۔

شاعری کے متعلق عنصری نے جو کام کئے اُن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) قصیدہ میں تخلص اور گریز سب سے زیادہ مہتم بالشان چیز سمجھی جاتی ہے۔ یعنی غزلیہ مضامین کہتے کہتے بادشاہ کی مدح کی طرف کیونکر رجوع کریں، متاخرین کو ناز ہے۔

کہ یہ نکتہ آفرینیاں انہیں کے ساتھ مخصوص ہیں لیکن انصاف یہ ہے۔ کہ عنصری کے مخالص بھی متاخرین سے کم نہیں، ایک قصیدہ میں ابتداء سے انتہا تک دو دو چیزوں کا مقابلہ کیا ہے۔ اُس میں لکھتا ہے۔

عنصری کی شاعری کی خصوصیات

عنود ستند آں ماہ منوّر	خط و زلفین آں امہ روئے دلبر
یکے را سنبل نورستہ بالین	یکے را لالۂ خودروئے بستر
بروئے و موئے او بنگر کہ بینی	یکے آوازہ ہر دو آں را فعل آذر (آگ ۱۲)
یکے بے دو دسال و ماہ تیرہ	یکے بے نور روز و شب منوّر
مرا بہرہ دو چیز آمد ز گیتی	دل پاک و زبان مدح گستر
یکے بر مہر جاناں وقف کردم	یکے بر مدحِ شاہنشاہ کشور

ایک اور قصیدہ ہے۔

گہ آں آراستہ زلفش گرہ گردد گہے چنبر	گہ آں پیراستہ عنبرش ببار و مشک، گہ عنبر
شگفتہ لالہ رخسارہ، حجاب لالہ چہ آرہ (زلف ۱۲)	براز عاج و دل از خارہ، تن از شیر، و لب از شکر
سمن بوئے، شبہ موئے، بلا جوئے، جفا گوئے	پری زادے، پری روئے، پری چہرے، پری پیکر
بپرداز اے دل از روئے، کہ گاہ آمد کہ حق جوئے	غزل چندیں چرا گوئی ز عشق آں بتِ دلبر
ثنا جوئے از غزل پاسخ، کہ (گزرا ۱۲) کیت ایں ہر دو بود فرخ	غزل بر ماہِ زیبا رخ، ثنا بر شاہ نیک اختر

ایک قصیدہ سوال و جواب سے شروع کیا ہے، اور اخیر تک یہ اندازہ قائم رکھا ہے اُس میں نہایت خوبی سے مدح کی طرف رجوع کی ہے۔

ہر سوالے کز آں گل سیراب	دوش کردم مرا بداد جواب
گفتم آتش بر آں رخت کہ فروخت	گفت آں کہ دلِ تو کرد کباب
گفتم اندر عذاب عشق تو ام	گفت عاشق نکو بود بہ عذاب
گفتم از چیست روئے راحتِ من	گفت ہر دم از زردی خمر و شباب
گفتم آں میر نصر ناصر دین	گفت آں مالک قلوب و رقاب
گفتم اندر جہاں چو او دیدی	گفت نے و نخواندہ ام بکتاب
گفتم اعدائے او دروغ زن اند	گفت ہیچو مسیلمہ کذاب
گفتم از مدح او نیاسایم	گفت زینساں کنند اولو الالباب

گفتم اورا چہ خواہم از ایزد	گو زنت عمرِ دراز و دولت شباب

ایک قصیدہ کو تشبیب سے شروع کیا ہے، معشوق کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہے۔

او، و من ہر دو ہمے زاریم، او ناز من بہ آشت	کو بہ حسنِ خویش ناز و من بہ مدحِ شہریار

ایک قصیدہ زلف کی تعریف سے شروع کیا ہے۔

اے شکستہ زلفِ یار، از بسکہ کہ تو دستاں کنی	وسمہ، دستِ لتت، اگر با ساحراں یکساں کنی
ہم زرہ پوشی و ہم چوگاں زنی بر ارغواں	خویشتن را گہ زرہ سازی و گہ چوگاں کنی
نیستی دیوانہ، بر آتش چرا غلطی ہمے؟	نیستی پروانہ، گرد شمع چوں جولاں کنی!

زلف سے خطاب کرتے کرتے، اپنے آپ سے خطاب کرتا ہے۔

دل نگہدار اے تن از دردش کہ دل باید ترا	تا ثنائے کدخدائے کشورِ ایراں کنی

(۲) قصیدہ اگرچہ مداحی اور [illegible] کیلئے مخصوص ہوگیا تھا۔ اسی بنا پر عرفی نے کہا ہے۔

قصیدہ کارِ ہوس پیشگاں بود عرفی۔

ایک اور شاعر کہتا ہے۔

اگر نگویم قصیدہ باکے نیست	من خوشامدئے توانم گفت

لیکن **عنصری** نے اکثر قصائد سے واقعہ نگاری کا کام لیا ہے۔ اس نے اکثر قصیدوں میں محمود کی لڑائیاں اور فتوحات نظم کی ہیں۔ ایک قصیدہ میں جو ۱۷۲ شعروں کا ہے۔ محمود کے تمام معرکے اجمالاً لکھے ہیں[1]۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں۔

شنیدہ؛ خبرِ شاہِ ہندواں **جیپال**	کہ بر سپہر بلندش ہمے بسود افسر
بداں صفت سپہے چوں شبِ سیاہ بزرگ	بدستِ الشتاں شمشیرہائے ہمچو سحر
چو دودِ تیرہ، درو آتشے زبانہ زناں	تو گفتی کہ پراگندہ شد بدشتِ سفر
خدایگانِ خراساں بدشتِ **پیشاور**	بہ حملۂ بپراگند آں ہمہ لشکر
حکایتِ سفرِ **مولتان** ہمیدانی	وگر ندانی **تاج الفتوح** پیش آور
اگر ز دجلہ **فریدوں** گزشت بے کشتی	بہ شاہنامہ برآں بر حکایت است سمر
ازاں سپس کہ درو وہم را نبود پایاب	وزاں سپس کہ براں باد را نبود عبر

[1] تذکرۂ دولت شاہ میں لکھا ہے کہ اس قصیدہ میں ۱۸۰ شعر ہیں۔ لیکن دیوان مروجہ میں اس سے کم ہیں۔

بہ مولتاں (ملتان) شد و در رہ دو لیست قلعہ کشاد	کہ ہر یکے را صد بندہ بود چوں خیبر
بلاد و بت کدہ شان کشاد و سوخت ہمہ	بہ بُرد باد ہمہ تو دہائے خاکستر
چو باز گشت بہ یک تاختن بہ میمنہ شد	ازاں کہ بود خراساں ز رنجہا مضطر

خوارزم کی فتح میں لکھتا ہے۔

بوقت آں کہ زمیں تفتہ بُد ز بادِ سموم	ہوا چو آتش گرداند رو، بجائے شرار
فرو گذشت بآموی (دریائے جیحوں) بہ شہریار جہاں	بہ فالِ اخترِ نیک و بہ نصرتِ دادار
ہمہ زمیں شدہ، از روئے بندگاں کشمیر	ہمہ ہوا شدہ از عکس چاؤشاں فرخار
در آب در ہمہ غرقہ شدند چوں فرعون	چو بر گذشت بر آں آب، شاہ موسیٰ وار
فراخ جیحوں چوں کوہ شد ز بسکہ در و	کلاہ و ترکش و زیں بود و جامہ و دستار
کسے کہ زندہ بماند است ازاں ہزیمتیاں	اگرچہ تنش درست است ہست چوں بیمار
بہ مغزش اندر تیغ است، اگر بود خفتہ	بہ چشمش اندر تیر است اگر بود بیدار
اگر بہ جنبد، بند قبائے او از باد	گماں کند کہ ہمے بر جگر خورد مسمار
گر سوال کند، گوید اے سوار مزن	و گر جواب دہد، گوید اے ملک زنہار

اخیر شعروں میں شکست یافتہ فوجوں کی بدحواسی اور خوف زدگی کی تصویر کس خوبی سے کھینچی ہے۔ کہتا ہے کہ جب یہ سوتے ہیں۔ تو خواب میں اُن کو ہر طرف تلواریں نظر آتی ہیں۔ اور آنکھ کھلتی ہے۔ تو تیر ہی تیر دکھائی دیتے ہیں۔ قبا کا بند اگر ہوا سے جنبش کرتا ہے۔ تو گمان کرتا ہے۔ کہ کوئی شخص کلیجے میں کیل ٹھوک رہا ہے۔ اگر کچھ درخواست کرتا ہے۔ تو یہ کہ میاں سوار! اب نہ مارنا، اور کچھ جواب دیتا ہے۔ تو یہ کہ اے بادشاہ پناہ دے۔

(۳) مناظر قدرت، اور خاص خاص چیزوں کے اوصاف بھی اُس نے نہائت خوبی سے لکھے ہیں۔

بہار

ابر نوروزی ہمے دُر بار دو بت گر شود	تا ز صنعش ہر درختے لُعبتے دیگر شود
باغ ہمچوں کلبۂ بزّاز پُر دیبا شود	باد ہمچوں طبلۂ عطار پُر عنبر شود
روئے بندِ[۱] ہر زمینے حلّۂ چینی شود	گوشوارِ ہر درختے رشتۂ گوہر شود
زمین کا ہر تختہ چینی کپڑے کی نقاب پہن لیتا ہے	درخت کانوں میں سونے کے بُندے ڈال لیتے ہیں

۱؎ نقاب کو کہتے ہیں۔

چوں حجابے لعبتاں خورشید را بینی که باز — گہ بروں آید ز میغ و گہ بہ میغ اندر شود

آفتاب، بھان متی کی پتلی بن گیا ہے — کہ کبھی بادل سے نکل آتا ہے اور کبھی بادلوں میں گھس جاتا ہے

افسرِ سیمیں فرو گیرد، ز سر کوہِ بلند — باز، مینا چشم، و دیبا روے و مشکیں سر شود

پہاڑ نے چاندی کا تاج (برف) سر سے اتار کر رکھدیا — اور اُسکی آنکھیں سبز، چہرہ پرنگار، اور سر مشکیں ہو گیا

مقصد یہ کہ پہاڑ پر سبزہ، بنفشہ اور طرح طرح کے پھول پیدا ہو گئے۔

نہر کی تعریف

درخت نارنج، از خامہ گوئیا شنگرف — بریخت است کسے مُشت مُشت و زنگار

زبرگ و بار ہمہ طوطیانِ پر آنند — کہ برگ شاں ہمہ پر است و بارِ شاں منقار

مجرّہ (کہکشاں) وار یکے جوئے اندرو گزرد — بر آب خضر بنہ کردہ، آب او بازار

اگر بجنبد گوئی ہمے بجنبد جان — وگر بہ پیچد (آبحیات) گوئی ہمے بہ پیچد مار

بسان قارول گاہے فرو شود بزمیں — گہے شود بہ ہوا بر چو جعفرؓ طیار

ہاتھی کی تعریف

نہ چرخ اند، لیکن ہمہ چرخ گردش — نہ کوہ اند، لیکن ہمہ کوہ پیکر

چو اندر ہوا، کوہ بر قوم موسیٰؑ — چو بر قومِ عاد آیتِ باد صرصر

چناں گردد، از عرضِ شاں دشت گوئی — بہ موج اندر آید ہمے بحرِ اخضر

تنگ راہ گیرند بر آب و آتش — بدنداں بدرند پولاد و مرمر

زمیں (تنگ ۱۲) کوہ باشد چو آیند پیدا — چو اندر گزشتند، چاہِ مقعّر

صنائع و بدائع

یہ بدعت عنصری سے پہلے شروع ہو چکی تھی، لیکن خال خال تھی۔ اور اس قدر نمایاں نہ تھی کہ لوگوں کا خیال اُس طرف رجوع ہوتا۔ عنصری نے اکثر صنعتیں مثلاً لف و نشر، ترصیع، تقسیم، سوال و جواب، کثرت سے برتیں۔ اور چونکہ بعض صنعتیں نہائت خوبی سے استعمال کیں، اور شعراء نے بھی تقلید کی، اور ایک عام شاہراہ پیدا ہو گئی۔ چنانچہ ترصیع یعنی دونو مصرعوں میں تمام الفاظ کا باہم مساوی الوزن ہونا یا ہم قافیہ ہونا، اس قدر عام ہوا کہ قدماء کے اخیر دور یعنی ساتویں صدی تک تمام قصائد اسی انداز پر لکھے جاتے تھے۔ اور فیصدی ۸۰ شعروں میں یہ صنعت پائی جاتی تھی۔ لف و نشر، تقسیم سیاقۃ الاعداد، کو بھی رواج ہوا لیکن نہ اس قدر کہ قصائد کے گلے کا ہار بن جائیں۔ عنصری نے جس طرح ان صنعتوں کو برتا اُن کی مثالیں درج ذیل ہیں۔

توصیف شراب

درختے است گویا بہ مینا منقش — پرندے ست گویا بہ لؤلؤ مشجّر
رونده است و رفتنش در مغز شیراں — خورنده است و خوردنش از مغز کافر
نہ وہم است و گشتنش چوں وہم بر دل — نہ مغز است و بودنش چوں مغز در سر

گہ آں آراستہ زلفش گره گرد، گاہے چنبر — گہ آں پیراستہ جعدش بہار و مشک گہ عنبر
رخ چوں تو شگفتہ گل، ہمہ گلبن برنگِ گل — ہمہ شمشاد، پر سنبل، ہمہ بیجاده پر شکر
بہ رو از نیکوئے معنی، بہ غمزہ از جادوئی دعوے — بہ چہرہ حجتِ مانی، بہ خوبی حاجتِ آذر
سمن بوئے، شبہ موئے، بلا جوئے، جفا گوئے — پریزادے، پری روئے، پری چہرے، پری پیکر
دل آرامی، دل آرائے، غم انجامے، غم افزائے — نکو روئے، نکو رائے، بہ حسن اندر جہاں سرور

تمام قصیدہ اسی صنعت میں ہے۔ اور اس قدر مقبول ہوا کہ تمام شعرائے مابعد نے التزاماً اسکے تتبع میں قصائد لکھے **سلیمان ساوجی، امیر خسرو، اور قاآنی** نے بعض اور خوبیاں اس میں اضافہ کیں، اور زیادہ حسن پیدا کر دیا، مثلاً قاآنی کہتا ہے۔

کنوں کز شنبلید و ارغوان و یاسمن دارد — چمن تزئین و من تمکین زمین آئین زماں زیور
بہ صحن باغ و طرفِ راغ و زیر سرو و پائے خم — بزن گام و بجو کام و بده جام و بکش ساغر

لف و نشر اور تقسیم کو اگرچہ عنصری نے بہت کم برتا ہے لیکن نہائت خوبی اور سادگی سے برتا ہے۔

یا بہ بندد یا کشاید، یا ستاند یا دہد — تا جہاں باشد ہمے مر شاه را ایں یادگار
آنچہ بستاند ولائت، آنچہ بدہد خواستہ — آنچہ بندد دست دشمن، آنچہ بکشاید حصار

مبالغہ، اس میں بھی عنصری نے کچھ کمی نہیں کی لیکن اس وقت تک تکلف اور بناوٹ کو اس قدر ترقی نہیں ہوئی تھی، اس لئے متاخرین کے مقابلہ میں اس کے مبالغے پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ گھوڑے کی تعریف میں لکھتا ہے۔

شگفت آید از مرکب تو خرد را — کش از باد طبع ست و از خاک منظر
بہ گام بسپرد گر براند — بہ تقریبش از باختر تا بہ خاور
بہ جستن کند کم ز دریا بہ دریا — نہ منزل کند کم ز کشور بہ کشور

مضمون آفرینی

بہ نور و ظلمت ماند از زمین و ابر ہمے — بہ در و مینا ماند سر شاخ ابر و گیا
فریفتہ است زمیں ابر تیرہ را کہ از و — ہمے ستاند در و ہمے دہد مینا

یعنی زمین اور بادل نور و ظلمت کے مشابہ ہیں، اور قطرۂ باراں۔ اور گھاس۔ گویا موتی اور سبز شیشے ہیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ بادل زمین کے قریب ہیں آگئے ہیں کیونکہ زمین سبز شیشہ دے کر اس کے عوض بادلوں سے موتی لیتی ہے۔

ہمانا کہ خورشید رنگِ رخش را	بدزدد کہ بخشد بہ یاقوت احمر

عام خیال یہ ہے کہ آفتاب، جب کسی پتھر پر چالیس برس تک متصل طلوع ہوتا رہتا ہے۔ تو وہ یاقوت بن جاتا ہے۔ عنصری کہتا ہے کہ آفتاب دراصل معشوق کے چہرے کا رنگ، چراتا ہے۔ اور یاقوت کو دے دیتا ہے۔

گھوڑے کی تعریف

زمانِ گذشتہ است کش در نیابی	چو بگذشت از پیش چشم تو دیگر
بہ رجعت بر آں گونہ باشد کہ گوئی	سپہر باز گردد زمانہ مکرر

یعنی جب یہ گھوڑا، سامنے سے نکل جاتا ہے۔ تو گویا گزرا ہوا زمانہ ہے جس کو تم پا نہیں سکتے، اور جب چکر لگا کر آجاتا ہے۔ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ نے پلٹا لیا۔

فرّخی

علی نام۔ ابوالحسن کنیت۔ فرخی تخلص، سیستان وطن۔ باپ کا نام قلوغ تھا۔ جو امیر خلف بن حاکم سیستان کے دربار میں ملازم تھا۔ بچپن میں ادب اور موسیقی کی تعلیم پائی۔ چنانچہ چنگ بجانے میں کمال پیدا کیا، معاش کی یہ صورت تھی کہ ایک زمیندار کی ملازمت کرتا تھا جس کے معاوضہ میں سالانہ دو سو کیل غلہ اور سو درم مقرر تھے۔ یہ مختصر سی آمدنی اس کی سادہ زندگی کے لئے کافی تھی۔ لیکن چند روز کے بعد اس نے امیر خلف کی ایک لونڈی سے شادی کی جس کی وجہ سے خرچ بڑھ گیا۔ آقا سے تحریری درخواست کی کہ تنخواہ میں ۵۰ درم کا اضافہ کر دے۔ اور غلہ کی مقدار دو سو کیل کی بجائے تین سو کر دی جائے، آقا نے عرضی کی پشت پر لکھ دیا کہ اس قدر حاضر ہے اور اس سے زیادہ کا مجھ کو مقدور نہیں۔

فرخی کو شعر و شاعری کا بچپن سے ذوق تھا۔ اور اب اس نے اس فن میں کافی ترقی کر لی تھی۔ شاعری کی قدردانی کے قصے ہر جگہ مشہور تھے۔ اس لئے اس کو خیال ہوا کہ اس ذریعہ سے یہ مشکل حل ہو گی۔ چنانچہ لوگوں سے پوچھتا رہتا تھا کہ اس فن کا کون بڑا

قدر دان ہے۔

ابو المظفر چغانی، اس زمانہ میں سلطان محمود کی طرف سے بلخ کا گورنر تھا۔ اور نہایت فیاض طبع۔ اور قدر دانِ سخن تھا۔ فرخی اس کی فیاضی اور قدر دانی کا شہرہ سن کر چغان میں آیا چنانچہ ایک قصیدہ کی ابتداء اس واقعہ سے کی ہے۔

باکاروان حلہ برفتم زسیستان	باحلۂ تنیدہ زدل، بافتہ زجاں

ابو المظفر کو گھوڑوں سے بہت شوق تھا۔ اور بڑے اہتمام سے ان کی پرداخت و تربیت کرتا تھا۔ اٹھارہ ہزار گھوڑیاں اور بچھیرے ہمیشہ چراگاہ میں رہتے تھے بسال میں ایک دفعہ ان بچھیروں کا جائزہ لیتا تھا اور ان کو داغ کرتا تھا۔ فرخی جب بلخ پہنچا تو معلوم ہوا کہ ابو المظفر داغ گاہ میں گیا ہے لیکن خوش قسمتی سے عمید اسعد جو ابو المظفر کا مختار کل تھا موجود تھا۔ فرخی اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ شاعر ہوں عمید نے نظر اٹھا کر دیکھا تو فرخی کے چہرہ مہرہ ہیئت، وضع قطع، کسی چیز کو شاعری سے مناسبت نہ تھی، بھدا ڈیل ڈول۔ ڈھیلا ڈھالا کرتا جس کے دونو طرف چاک، سر پر بڑا سا پگڑ، سخت متعجب ہوا تاہم حسن اخلاق کے لحاظ سے کہا کہ میں تم کو امیر کے دربار میں لے چلوں گا لیکن پہلے داغ گاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھ لاؤ، اس کے ساتھ، داغ گاہ کی صورت کا نقشہ کھینچ کر دکھایا کہ کوسوں تک سبزہ زار ہوتا ہے، جا بجا چشمے بہتے ہیں بے تکلف احباب مل بیٹھتے ہیں۔ گاتے بجاتے ہیں۔ شراب پیتے جاتے ہیں۔ بادشاہ ایک ہاتھ میں پیالہ دوسرے میں کمند لیکر بیٹھتا ہے۔ شراب پیتا جاتا ہے۔ اور لوگوں کو گھوڑے انعام دیا جاتا ہے۔

فرخی نے رات بھر میں قصیدہ طیار کر کے صبح کو عمید کے سامنے پڑھا۔

چوں پرند نیلگوں، بر روے پوشد مرغزار	پرنیان ہفت رنگ، اندر سر آرد کوہسار
خاک راچوں نافِ آہو مشک زاید بیقیاس	بید راچوں پرِ طوطی برگ روید بے شمار
دوش وقت نیم شب بوے بہار آورد باد	حبذا باد شمال و فرخا بوئے بہار
باد گوئی مشک سودہ دارد اندر آستین	باغ گوئی لعبتان جلوہ دارد در کنار
نسترن لولوے بیضا دارد اندر مرسلہ	ارغواں لعل بدخشاں دارد اندر گوشوار
باغ بوقلموں لباس، و شاخ بوقلموں نمائے	آب مروارید گون، و ابر مروارید بار
داغہائے شہریار اکنوں چناں خرم شود	کاندر و از خرمی خیرہ بماند روزگار

سبزہ اندر سبزہ بینی، چوں سپہر اندر سپہر　　خیمہ اندر خیمہ بینی، چوں حصار اندر حصار

ہر کجا خیمہ است، خفتہ عاشقے با دوست مست　　ہر کجا سبزہ است، شاداں، یارے از دیدار یار

سبزہا بر بانگ چنگ مطرباں چرب دست　　خیمہا بر بانگ نوش ساقیان مے گسار

عاشقاں بوس و کنار، و نیکواں ناز و عتاب　　مطرباں رود و سرود و خفتگاں خواب و خمار

بر در پردہ سرائے خسرو پیروز بخت　　از پئے داغ آتشے افروختہ خورشید وار

داغہا چوں شاخہائے بسد یاقوت رنگ　　ہر یکے چوں ناردانہ گشتہ اندر زیر نار

دیدگاں خواب نادیدہ مصاف اندر مصاف　　مرکباں داغ ناکردہ قطار اندر قطار

روئے ہاموں، سبزہ چوں گردون ناپیدا کراں　　روئے صحرا، سادہ چوں دریائے ناپیدا کنار

اندراں دریا سماری، واں سماری جانور　　اندریں گردوں ستارہ واں ستارا بیدار

خسرو فرخ سیر، بر بارہ، دریا گزر　　با کمند اندر میان دشت چوں اسفندیار

گردن ہر مرکبے چوں گردن قمری بہ طوق　　از کمند شہریار شہر گیر شہر وار

ہر کرا اندر کمند شصت بازی، در فگند　　گشت نامش بر سرین و شانہ و رویش نگار

روز یک نیمہ، کمند و مرکبان تیز تگ　　نیم دیگر مطرباں و بادۂ نوشین گوار

عمید نے فرخی کو ساتھ لیا، اور ابو المظفر کے پاس جا کر اس تقریب سے پیش کیا کہ دقیقی کے بعد آج تک اس پایہ کا شاعر نہیں پیدا ہوا، یہ کہ کر سارا واقعہ بیان کیا۔ ابو المظفر نے فرخی کو دربار میں مناسب موقع پر جگہ دی، شراب کا دور چل رہا تھا۔ دو تین دور ہو چکے تو فرخی اٹھا۔ اور درد آمیز لہجہ میں یہ قصیدہ پڑھا ع با کاروانِ حلّہ برفتم ز سیستان، ابو المظفر خود شاعر تھا، حد سے زیادہ مسرور ہوا، اور فرخی سے کہا کہ ہزار کمیت بچھڑے سامنے ہیں۔ جس قدر تم سے پکڑے جا سکیں سب تمہارے ہیں۔ فرخی شراب سے بدمست تھا۔ فوراً اٹھا دستار سر سے پھینک بچھڑوں کی قطار میں گھس گیا۔ وہ بھاگ کر اِدھر اُدھر پھیل گئے فرخی ہر طرف پیچھے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا۔ تھک کر چور ہو گیا، اور وہیں زمین پر پڑ کر سو رہا صبح کو دن چڑھے اٹھا، ابو المظفر نے صبح کی نماز سے فارغ ہو کر، فرخی کو دربار میں طلب کیا۔ اور اسپ خاصہ، ایک خیمہ، تین شتر، پانچ غلام، اور پہننے کے کپڑے انعام دیئے دریافت سے معلوم ہوا کہ فرخی نے جس گلہ پر ہاتھ ڈالا تھا۔ اس میں بیالیس بچھڑے تھے ابو المظفر نے وہ بھی انعام میں دیدیئے۔ چند روز کے بعد فرخی بڑے سر و سامان سے

سلطان **محمود** کے دربار میں پہنچا۔ سلطان نے نہایت قدردانی کی اور شعرائے خاص[1] میں داخل کیا۔ ایک موقعہ پر اسپ خاصہ عنایت کیا تو فرخی نے یہ اشعار شکرگزاری میں لکھے۔

اسپے کہ چناں شاہ دہد اسپ نباشد	تاجے بود آراستہ از لولوئے شہوار
دشمن کہ بریں ابلق رہوار مرا دید	بے صبر شد و کرد غم خویش پدیدار

اس وقت باوجود تقرب اور منصب ندامت کے **فرخی** کو دربار میں کمر بند باندھنے کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ یہ لباس امرائے فوج کے ساتھ مخصوص تھا، فرخی نے نہایت خوبی سے اس قصیدہ میں اس عہدہ کی آرزو کی ہے۔

گفتا کہ بہ میراں و بہ سرہنگاں مانی	امروز کلاہ و کمرت باید ناچار
گفتم کہ چہ دانی کہ شب تیرہ چہ زاید	بشکیب و صبوری کن تا شب بنہد بار
من تنگدلی پیشہ نگیرم کہ بزرگاں	کس را بہ بزرگی نرسانند بیک بار

یعنی دشمن نے مجھ سے کہا کہ اب تو تمہارا ٹھاٹھ امرا کا سا ہے۔ اب کمر بند و کلاہ بھی ملنا چاہئے میں نے کہا تجھ کو کیا خبر ہے کہ کل کیا ہوگا؟ جس نے مجھکو اسپ خاصہ کے قابل سمجھا وہ اس کا مستحق بھی سمجھے گا۔ میں دل گرفتہ نہیں ہوتا کیونکہ سلاطین کا یہ دستور نہیں کہ کسی کو ایک دم سے بڑے رتبہ پر پہنچا دیں، بالآخر فرخی کی دولت و جاہ کی یہ نوبت پہنچی کہ جب اس کی سواری نکلتی تھی تو بیس زریں کمر غلام رکاب میں چلتے تھے۔

ایاز جو سلطان محمود کا محبوب خاص تھا۔ فرخی کا نہایت قدردان تھا۔ اور اس سے نہایت خلوص رکھتا تھا۔ ربط زیادہ بڑھا تو محمود کو رشک ہوا یہاں تک کہ فرخی کا دربار آنا بند کر دیا۔ فرخی نے متعدد قصیدے[2] معذرت میں لکھے۔ بالآخر سلطان صاف ہو گیا، اور فرخی بدستور دربار میں جانے آنے لگا۔

اس زمانہ کے تمدن اور معاشرت پر تعجب ہوتا ہے۔ کہ شعرا محمود کی مدح میں جو قصیدے لکھتے تھے۔ اس میں علانیہ ایاز کے حسن و معشوقی کا ذکر کرتے تھے۔ اور محمود اس سے خوش ہوتا تھا۔ فرخی ایک قصیدہ میں لکھتا ہے۔

امیر جنگجو ایاز اُو یماق	دل و بازوئے خسرو روز پیکار

[1] یہ تمام واقعہ اگرچہ تمام تذکروں میں منقول ہے لیکن سب سے زیادہ تفصیل چہار مقالہ میں ہے۔ اور میں نے گویا اُسی کا لفظی ترجمہ کیا ہے۔ [2] مجمع الفصحار۔

زنانِ پارسا از شوق گردند	بہ کابین کردنی او را خریدار
نہ بر خیرہ بدو دل داد محمود	دلِ محمود را بازی مپندار
جز او در پیش سلطان نیز کس بود	جز او سلطان غلامان داشت بسیار
اگر چوں میر یک تن بود آنجا	نہ چندیں بُد مراد را گرم بازار

غضناری نے محمود کی فرمائش سے ایاز کی تعریف میں دو شعر لکھ کر پیش کیے تو محمود نے دو ہزار اشرفیاں انعام میں دلوائیں۔ چنانچہ غضناری ایک قصیدہ میں کہتا ہے۔

مرا دو بیت بفرمود شہریار جہاں	براں صنوبر عنبر عذار مشکیں خال
دو بدرہ زر بفرستاد دو دو ہزار درم	بہ رغم حاسدِ بیمار بد سگال نکال

فرخی نے صنائع و بدائع شعری میں ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام ترجمان البلاغت ہے۔ رشید الدین وطواط نے حدائق السحر میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ "لغو کتاب ہے" بظاہر تعجب ہوتا ہے کہ ایران کے شعراء ابتداء ہی سے صنائع و بدائع کی طرف کیونکر مائل ہوئے لیکن حقیقت میں یہ تعجب کی بات نہیں۔ شاعری کا جو نمونہ فارسی شعراء کے پیش نظر تھا وہ عربی شاعری تھی۔ عرب میں خود اس زمانہ میں صنائع و بدائع کی بدعت ایجاد ہو چکی تھی۔ اور عبد اللہ بن معتز کی کتاب البدیع جو اس فن کی پہلی کتاب تھی گھر گھر پھیلی ہوئی تھی۔ تاہم فرخی کی سلامت روی دیکھو کہ اس نے صنائع و بدائع پر کتاب لکھی لیکن خود ان تکلفات سے آزاد ہے۔ فرخی نے ۴۲۹ھ میں وفات پائی۔

کلام پر رائے

فرخی کے کلام کا عام جوہر زبان کی صفائی، اور سلاست و روانی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس ابتدائی زمانہ میں اس نے بیان کو اس قدر صاف کر دیا کہ ہزار برس گزر چکے لیکن آج کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ قاآنی کا بڑا اعجاز یہی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ قصائد میں ہر قسم کے واقعات اس طرح بے تکلف ادا کرتا جاتا ہے۔ گویا دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ فرخی سے اس کا موازنہ کرو۔ صاف نظر آئیگا جو بات قاآنی کو ہزار برس کے بعد حاصل ہوئی، فرخی کو اس وقت حاصل تھی، رمضان اور عید کے ذکر میں قاآنی کا ایک مشہور قصیدہ ہے۔

دلا کجا ہیچ خبر داری کہاں ترک پسر	یا من از ناز دگر بار چہ آورد بہ بر
بلب نوشیں آمد شب دوشیں بسرائے	حلقہ بر در زد و بر جستم و بکشودم در
گفت قاآنیا تا کے خسپی ہیں برائے	خیز کز روزہ نشد اوضاع جہاں زیر و زبر

غالباً مست چناں خفتہ اندر رمضان
کز مہ روزہ و از روزہ ترا نیست خبر

گفتم اے ترک دلآرام مگر باز آمد
رمضاں آں مہ شاہد کش و زاہد پرور

گفتم آرے رمضان آمد و گوید کہ بخلق
رقم از بار خدا دارم و از پیغمبر

وقت آں آمد کاں و اعتکاف از بعد نماز
ہمچو بوزینہ بہ یکبار جہد از منبر

اسی بحر و قافیہ میں فرخی کا قصیدہ دیکھو۔

رمضاں رفت و رہے دور گرفت اندر بر
خنک آں کس رمضاں را بہ سزا برد بسر

بس گرامی بود ایں ماہ و لیکن چہ کنم
رفتنی رفتہ بہ و اور دست نہادہ بہ سفر

رمضاں گر بشد از راہ فراز آمد عید
عید فرخندہ ز ماہِ رمضاں نیکو تر

گاہ آں آمد کز شادی پر گردد دل
وقت آں آمد کز بادہ گراں گردد سر

بادۂ روشن و آسودہ و صافی چو گلاب
ساقی دلبر و شائستہ و شیریں چو شکر

مطربا! آں غزل نغز دلاویز بیار
ور نہ دانی بشنو تا غزل گویم تر

اے دریغا دل من کاں صنم سیمیں بر
دل من برد و مرا از دل او نیست خبر

او دلے داشت گرامی و دل دیگر یافت
کاشکے من دلکے یافتمی نیز دگر

اسی بحر اور قافیہ میں اس کا ایک اور قصیدہ ہے۔ جو سراپا محاورہ اور روزمرہ ہے۔

ترک جست روے من از خواب گراں دارد سر
میرا پری چہرہ معشوق نیند سے سرگراں ہے

دوش مے دادہ است از اول شب تا بسحر
کل شام سے صبح تک شراب پلاتا رہا ہے

من بچشم اورا دو بار نمودم کہ بخسپ
میں نے دو دفعہ آنکھ سے اشارہ کیا کہ سو رہو

او ہمے گفت بسر، تا برم ایں دور بسر
لیکن وہ یہی کہتا رہا کہ یہ دور تو ختم ہونے دو

شب بسر برد بہ مے دادن و نہ نشست و نہ خفت
ساری رات شراب پلانے میں گزاری نہ بیٹھا نہ سویا

دل من جست کہ نہ نشست و نخفت آں دلبر
یہ میری خاطر داری تھی کہ سویا نہیں اور کھڑا رہا

حیلہ سازد کہ مے افزوں خورد از نوبت خویش
چالاکی کرکے چاہتا ہے کہ اپنے حصہ سے زیادہ پی لے

ور تواند بخورد نوبت یاران دگر
اور اس کے امکان میں ہو تو اوروں کا حصہ بھی اڑا لے

کیست آں کو ندہد دل بچنیں خدمت دوست
کیست آں کو نہ کشد بار چنیں خدمت گر

مدح کے تشبیب میں فتوحات کا ذکر کرتا ہے۔

خسرو ما بہ شکار رہ کاں تاختہ بود
ماز اندیشۂ او خستہ دل و خستہ جگر

خسرو از راہ دراز آمد با نہمت و کام
قلعہ ہا کندہ و بنشاندہ بہر شہر سپاہ
اے پسر، گر دل من کردہ ہمے خواہی شاد
نقل با بوسہ بود، بادہ دہی نقل بدہ
گر ہمے گوئی بوس از دگرے نیز بخواہ

دیگر

ملک از جنگ عراق آمد با فتح و ظفر
جنگہا کردہ و بنمودہ بہر جائے ہنر
از پس بادہ بمن بوسہ ہمے باید داد
دیر گاہ است کہ ایں رسم نہاد آں کہ نہاد
تو مرا از دگراں پردہ اے حور نژاد

یہ بھی **فرخی** کے خصوصیات میں ہے کہ جب کسی چیز کی تعریف یا کسی واقعہ کی حالت اور کیفیت بیان کرتا ہے۔ تو اس کا اصلی سماں آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے۔ ایک قصیدہ میں مجلس عیش کی خیالی تصویر کھینچی ہے۔

سرو ساقی و ماہ رود نواز (باجا)
زخمۂ رود زن نہ پست و نہ تیز (یعنی شعر نہ بہت اونچے نہ بہت نیچے)
مجلسے خوب با خسروانی وار (بادشاہانہ)
بوستانے ز لالہ و سوسن
دوستان مساعد و یکدل
ماہ روئے نشاندہ اندر پیش
جعد او بر پرند گشتی گیر (زلف — یعنی چہرہ)
بادہ چوں گلاب روشن و تلخ
از چنیں مجلس و چنیں بادہ

پردہ بستہ در پردہ شہناز (دھن ۱۲ ایک راگنی کا نام ہے)
زلف ساقی نہ کوتہ و نہ دراز
از سخن چیں، تہی و از غمّاز
ہمچو روئے تذرو و سینۂ باز
کہ تواں گفت پیش ایشاں راز
خوش زبان و موافق و دمساز
زلف او بر حریر چوگاں باز
ماندہ در خم زنگارہ آدم باز (دھن)
ہیچ زاہد مرا ندارد باز

سلطان محمود نے ایک باغ بڑے سرو سامان سے تیار کرایا تھا۔ گلہائے رنگ رنگ کے تختۂ زاب جا بجا جدولیں، دو طرفہ سرو شمشاد، ایک طرف مصنوعی خوشنما جھیل اُس میں رنگ برنگ کی مچھلیاں کانوں میں موتی کے آویزے پہنے تیرتی پھرتی تھیں، تصویر خانہ میں محمود کی مجسم تصویریں، کہیں برچھا ہاتھ میں لئے ہوئے شکار کھیل رہا ہے کہیں بزم عیش میں بیٹھا ہے۔ اور شراب کا دور چل رہا ہے۔ **فرخی** اس باغ کا نقشہ دکھاتا ہے۔

بہ فرخندہ فال و بہ فرخندہ اختر
در مسکن ماہرویان مجلس
کجا جائے بزم است گلہائے بجد (بر کنج)

ز نو باغ میخواست شاہ مظفر
در و خانۂ شیر گیران لشکر
کجا جائے صید است مرغان بہم (بیشمار)

روان گرد بہ گرد درعنا درختان — تا روان، آموختہ مادہ و نر
یکے کاخ شاہانہ اندر میانش — سر کنگرہ برکنارش دو پیکر
بہ کاخ اندرون صفہائے مصفا — در صفہا ساختہ سوئے منظر
یکے ہمچو دیبائے چینی منقش — یکے ہمچو ارژنگ مانی مصور
نگاریدہ در چند جا مصور — شہ شرق را اندران کاخ پیکر
بہ یکجائے در صید و در دست ژوبین (نیزہ ۱۲) — بہ یکجائے در بزم و بر دست ساغر (سلطان محمود کو ۱۲)
ازان کاخ فرخ چو اندر گذشتی — یکے رود آب اندرو ہمچو شکر (نہر ۱۲)
نہ چرخ است و اجزائے او چون ستارہ — نہ ابر است و آوائے او ہمچو تندر (آواز ۱۲)
اگر بگذرد بر سرش مرغ موجش — نیارد لاید اندر ہوا مرغ را پر
بد نیسان بہ باغ اندران تند رودے (نہر ۱۲) — یکے ژرف دریا مر آن را برابر
بدو اندران ماہیان چون عروسان — بگوش اندرون پر گہر حلقہ زدہ
مکانے برآوردہ پہلوئے دریا — بدان تا بران مے خورد شاہ صفدر
یمین دول شاہ محمود غازی — ابن ملک خسرو بنندہ پرور

ابوالمظفر چغانی کے دربار میں جب اس نے جانا چاہا ہے۔ تو راہ میں بہت صعوبتیں پیش آئیں، قصیدہ میں تمام حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ اور دیکھو مدح کی تمہید کا پہلو کس خوبصورتی سے پیدا کیا ہے۔

رہے صعب اندر شبے تاریک تیرہ — ہوا چون فیروزہ ہامون معقر
ہوا اندودہ رخسارہ بدودہ (سیاہی) — سپہر آراستہ چہرہ بہ گوہر
گمان بردی کہ باد اندر پراگند — بروئے سبز دریا برگ عبہر
مجرہ چون بہ دریا راہ سوئے (کہکشاں) — کہ اندر قعر او بگذشت لشکر (یعنی آسمان، یعنی ستارے)
زمانے رفت و سر برزد مہ از کوہ (رود نیل) — برنگ روئے مہجوران مزعفر
بہ رنگ اندر ہمے شد بارہ تازان (گھوڑا) — چو در غرقاب مرد آشنا در (تیراک)
شکم مالان بہ ہامون در ہمے رفت — شدہ ہامون بزیرش آن مقعر
دمندہ اژدہائے پیش آمد (یعنی دریا) — خروشان و بے آرام[لہ] و زمین در

لہ بے کی سی ظاہر نہیں ہوتی۔ اور یہ قدما کی زبان ہے۔ ۱۲

گرفتہ دامنِ خاور (مشرق) دنبال
بہ بارانِ بہاراں گشتہ فربہ
مدیحِ شاہ بر جیحوں بخواندم
کہ من شاگردِ کفِ را دادیم
بفرِ شاہ از جیحوں گزشتم
وزاں جا تا بدیں درگاہ گفتی
ہمہ بالا (بلندی) پُر از دیبائے رومی
تو گفتی ہیکلِ زردشت گشتہ است

نہادہ بر کرانِ باختر (پچھم) سر
نگرہائے حزیراں گشتہ لاغر
بر آمد بانگ از آب (مہینہ کا نام) اللہ اکبر
کہ تو مدحش ہمے بر خوانی از بر
یکے موئے از تنِ من نا شدہ تر
کشادہ ستند مر فردوس را در
ہمہ پستی پُر از کالائے ششتر (نام شہر ۱۲)
زبس لالہ ہمہ صحرا احمر

فرخی نے واقعہ نگاری کو بہت ترقی دی، اس سے پہلے بھی یہ صفت موجود تھی، لیکن سینکڑوں گوناگوں واقعات کو نہایت بے تکلفی اور برجستگی سے ادا کرکے اس نے واقعہ نگاری کی ایک شاہراہ قائم کردی۔ اور آیندہ نسلوں کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ اکثر قصیدوں میں فتوحات کے حالات لکھتا جاتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک مؤرخ بکم و کاست ٹھیک ٹھیک حالات لکھتا جاتا ہے سومنات کی فتح میں جو قصیدہ لکھا ہے۔ اس میں ایک ایک مقام کا نام اور اس کا حال بیان کیا ہے۔

گماں کہ برد؟ کہ ہرگز کسے زراہِ طراز
یہ کس کو خیال تھا کہ کوئی شخص طراز کی راہ سے
ہوائے آں، دژم و بادِ آں چو دودِ جحیم
راستے میں ہوا ایسی خراب جیسے دوزخ کا دھواں
ہمہ درخت و میانِ درخت خار کشن
تمام جھاڑیاں اور جھاڑیوں کے کانٹے
نہ مرد را سرِ آں کاندراں نہادے پے
نہ آدمی کو یہ جرأت ہوتی تھی کہ قدم رکھے
عجب تر آنکہ ملک را ہمے چنیں گفتند
سب سے بڑھکر عجیب بات یہ کہ لوگوں نے بادشاہ سے کہا تھا
بہ شب چو خفتہ بود مرد سر بر آرد مار

بہ سومنات برد لشکر و چنیں لشکر
سومنات پر فوج لیجا سکتا ہے اور فوج بھی ایسی فوج
زمینِ آں سیہ و خاکِ آں چو خاکستر
زمین بالکل سیاہ اور خاک جیسے راکھ
نہ خار بلکہ سنانِ خلندہ و خنجر
کانٹے نہیں بلکہ چبھنے والی برچھیاں اور خنجر
نہ مرغ را دلِ آں واندراں کشادے پر
نہ پرند کو یہ ہمت ہوتی تھی کہ اڑ سکے
کہ اندریں رہ مارِ دو سر بود بمیر
کہ اس راہ میں دو موہنے سانپ بے شمار ہیں
ہمے کشند نفس خفتہ تا بر آید خور

آدمی جب رات کو سو جاتا ہے تو یہ سانپ نکلتے ہیں

چو خور بر آمد اگر می بہ مردِ خفتہ رسد

جب آفتاب نکل آتا ہے اور آدمی کے بدن کو گرمی پہنچتی ہے

بدیں درشتی و زشتی رہے کہ کردم یاد

ایسے سخت اور خراب راستہ سے جس کا میں نے بیان کیا

ہر روز بہر پس ماندگان و گم شدگان

پیچھے رہ جانے والوں کے لیئے

بدان رہ اندر چندیں حصار و شہر بزرگ

بیسیوں قلعے اور شہر جو راہ میں پڑے

نخست لاردہ کز روئے برج و بارہ او

پہلا قلعہ لاردہ تھا جس کے برج اور دیوار سے

چہ مندھیر کہ در مندھیر حوضے بود

اور مندھیر کا کیا کہنا جس میں ایک ایسا حوض تھا

فراخ پہنا حوضے بہ صد ہزار عمل

نہایت چوڑا حوض جس میں ہزاروں کاریگریاں کام میں آئیں

یکے حصار قوی بر کرانِ شہر و درو

شہر کے کنارے پر ایک قلعہ تھا

فریضہ ہر روز آں سنگ را بشستندے

اس بت کے لازمی طور پر ہر روز

اور دھوپ نکلنے تک پھنکار مارتے ہیں

سبک نہ گردد ازاں خواب تا گہ محشر

تو آدمی ٹھنڈا ہو کر رہ جاتا ہے اور قیامت تک ٹھس ہوسکتا

گذشت شاہ بتوفیق خالقِ اکبر

بادشاہ خدا کی توفیق سے گزر گیا

میانِ بادیہ ہا حوضہائے چوں کوثر

جنگل میں حوض تیار کر دیئے تھے

خراب کرد و بکند اصل ہر یک از بن و بر

برباد کر دیئے اور ان کی جڑ کھود کے پھینک دی

چو کوہ کوہ فرو ریخت آہن و مرمر

پہاڑوں کے برابر لوہا اور پتھر برستا تھا

چنانکہ خیرہ شدے اندرو دو چشم فکر

جس کو دیکھ کر عقل کی آنکھوں کو چکا چوندھ لگ جاتی تھی

ہزار بتکدہ خرد گرد حوض اندر

ایک ہزار چھوٹے چھوٹے بتخانے اس کے اندر تھے

زبت پرستان گرد آمدہ یکے محشر

جس میں بت پرست کھٹ کے کھٹ رکھے تھے

بہ آب گنگ و بہ شیر و بزعفران و شکر

گنگا کے پانی اور دودھ اور زعفران اور شکر سے دھوتے تھے

شکار میں قمرغہ کا طریقہ، ایک مدت سے چلا آتا ہے یعنی کسی بڑے جنگل میں جہاں کثرت سے شکاری جانور ہوتے تھے۔ چاروں طرف آدمیوں کی صفوں کو پھیلا کر ایک بڑا حلقہ قائم کر لیتے تھے۔ پھر حلقہ کو بتدریج چھوٹا کرتے جاتے تھے یہاں تک کہ دو چار میل کی وسعت رہ جاتی تھی۔ اور تمام جانور سمٹ کر اتنے ہی دور میں آجاتے تھے۔ پھر ہر طرف سے اس پر حملے ہوتے تھے۔ اکثر مارے جاتے۔ بہت سے زندہ بھی گرفتار ہوتے سلطان محمود بھی اس طریقے سے اکثر شکار کھیلا کرتا تھا۔ فرخی نے ایک قصیدہ میں اس کا سماں دکھایا ہے۔

اے ز جنگ آمدہ و روئے نہادہ بہ شکار	تیغ و تیر تو ہمہ سیر نگردیدہ زکار
ہر چہ در ایران پرندہ، و دو دامی بود	ہمہ را گرد بہم کردی در یک دیوار
گرد ایشاں پرہ بربستی مانند عقاب	زاں بروں رفت ندانست، یکے از ہیچ کنار
(زنقہ ۱۲) در دوید ند سوئے تو بہ قطار از سر کوہ	باز گستردے و در دامن (زمیں ۱۲) کہ شاں بہ قطار
بامداداں ہمہ کہسار پُر از وحشی بود	شامگاہاں ہمہ پرداختہ (خالی ۱۲) بود از کہسار
در زمانے، ہمہ آں دشت زخون دو و دام	لعل کردے چو گلستانے ہنگام بہار
خواہی من کہ بجا بستے (زندہ ہوتا) بہرام امروز	تا بدیدے و بیاموختے از شاہ شکار

واقعہ نگاری کا انداز فرخی پر اس قدر غالب ہے کہ قصائد کی تشبیب میں جو در اصل غزل ہوتی ہے۔ یہ انداز قائم رہتا ہے۔ مثلاً ایک قصیدہ کی تشبیب میں لکھتا ہے۔

دوش متواریک بہ وقت سحر	اندر آمد بہ خیمہ آں دلبر
چنگ در بر (چھپکر ۱۲) گرفت و خوش بنواخت	واز دو لبید فرو فشاند شکر
پنج شش جام خورد و پُر گل گشت	روئے آں روئے (یاقوت ۱۲) نیکواں یکسر
مست گشت و، زبہر خفتن ساخت	خویشتن را کنار (افسر ۱۲ خوبصورت ۱۲) من بستر
زلف مشکیں بروئے در پوشید	دست من زیر کرد، و زلف زبر
زلف اورا بدست بگرفتم	زنخ گرداد بہ دست دگر
راست گفتی، گرفتہ بُد چاکر	گوئے و چوگاں شہ بدست اندر

دیکھو تشبیب سے مدح کی تمہید کس خوبی سے پیدا کی ہے۔

فرخی سے پہلے مرثیہ کے اشعار بہت کم پائے جاتے ہیں، اور جس قدر ہیں معمولی درجہ کے ہیں۔ لیکن **فرخی** نے **سلطان محمود** کا جو مرثیہ لکھا، وہ نہ صرف پُر درد اور پُر تاثیر ہے۔ بلکہ اس فن کے تمام اصول اور آئین اس سے قائم ہوسکتے ہیں۔

مرثیہ گوئی کے بڑے اصول تین ہیں۔

(۱) ممدوح کی عظمت و شان کا ذکر کیا جائے۔ تاکہ اس سے عبرت کا سبق حاصل ہو کہ اس پایہ کا شخص اٹھ گیا۔

(۲) اس کے مرنے سے ملک میں جو رنج و ماتم برپا ہے۔ اس کا ذکر کیا جائے۔

(۳) اُس کو مخاطب کر کے ایسے خیالات ظاہر کئے جائیں جس سے یہ ثابت ہو کہ انتہائے

وارفتگی اور مدہوشی کی وجہ سے مرثیہ کہنے والے کو اُس کے مرنے کی بھی خبر نہیں، اور وہ اب تک اُس کو اسی طرح مخاطب کر کے باتیں کرتا ہے جسطرح زندگی میں کرتا تھا۔

فرخی کے مرثیہ میں یہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ الفاظ، بندش، اور طرز ادا اس قدر مؤثر ہے۔ کہ پتھر کا دل بھی پانی ہو جاتا ہے۔

شہر غزنین نہ ہماں است کہ من دیدم پار
غزنین اب وہ نہیں ہے جو میں نے پارسال دیکھا تھا

چہ فتاد است کہ امسال دگرگوں شد کار
اس سال کیا پیش آیا کہ وہ حالت بالکل بدل گئی

کوچہا بینم پر شورش و سرتاسر کوئے
دیکھتا ہوں کہ تمام گلیوں میں شور برپا ہے اور اس سرے سے اس سرے تک

ہمہ پر جوش و جوش درا و پر خیل سوار
جوش بوش گھوڑوں اور سواروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ ہیں

مہتراں بینم بر روئے زناں ہمچو زناں
بڑے بڑے سردار عورتوں کی طرح منہ پیٹ رہے ہیں

چشمہا کردہ ز خوں ناب برنگِ گلنار
اور اُن کی آنکھیں خون سے رنگین ہو گئی ہیں

مَلِکِ امسال وگر باز نیامد ز غزا
شاید اس سال بادشاہ جہاد سے واپس نہیں آیا

دشمنے روئے نہادست دریں شہر و دیار
اس وجہ سے ملک میں کوئی دشمن آ پہنچا ہے

میر مے خوردہ مگر دی کہ بخفتہ است امروز
غالباً رات بہت شراب پی گیا اس لئے اب تک سو رہا تھا

دیر تر خواست مگر رنج رسیدش ز خمار
چونکہ خمار کی تکلیف ہے اسلئے آج دیر میں اُٹھے گا

خیز شاہا! کہ رسولانِ شہاں آمدہ اند
اے بادشاہ اٹھ! بادشاہوں کے قاصد آئے ہیں

ہدیہا دارند آوردہ فراواں و نثار
جو کثرت سے ہر قسم کے ہدیے اور تحفے لائے ہیں

کہ تواند؟ کہ برانگیزد ازیں خواب ترا
کس کی طاقت ہے کہ تجھ کو اس نیند سے جگا سکے

خفتنی خفتی، کز خواب نگردی بیدار
تو ایسی نیند سویا کہ اب پھر نہ جاگے گا

خفتن بسیار اے خواجہ خوئے تو نبود
اے آقا! دیر تک سونا تو تیری عادت نہ تھی

ہیچ کس خفتہ ندیدہ است ترا ازیں کردار
کسی نے اس طرح تجھ کو سوتے نہیں دیکھا تھا

یک دمک باش و درخانہ بیاسائے نشست
ذرا دیر تو تجھ کو دربار میں آکر بیٹھنا چاہئے تھا

تا بدیدندے روئے تو عزیزان و تبار
کہ عزیز اور قریب تیرا چہرہ دیکھ لیتے

بہ حصار از فزع و بیم تو رفتند شہاں
تیرے ڈر سے تو تمام سلاطین قلعوں میں بھاگ کر چھپ گئے

تو شہا از فزع و بیم کہ رفتی بہ حصار!
تو کس کے ڈر سے قلعہ میں بھاگ کر چھپا ہے

شعرا را بہ تو بازار برافروختہ بود

رفتی و با تو بہ یکبارہ برفت آں بازار

تیرے دم سے شاعروں کا بازار گرم تھا ۔۔۔ تو گیا۔ اور وہ بازار بھی جاتا رہا

صنائع شاعری میں ایک چیز تلمیح یعنی کسی قصہ طلب واقعہ سے مضمون پیدا کرنا لطیف صنعت ہے۔ فرخی اس صنعت کا استعمال نہایت خوبی سے کرتا ہے۔ مشہور ہے کہ حضرت آدم نے جب بہشت میں گیہوں کھالیا۔ تو اُن کے بدن کے کپڑے خود بخود اُتر گئے اور وہ بالکل برہنہ رہ گئے، فرخی نے اس واقع سے خزاں کی تعریف میں مضمون پیدا کیا۔

مگر درخت شگوفہ گناہ آدم کرد ۔۔۔ کہ از لباس چو آدم ہمے شود عریاں

نوشیرواں نے زنجیر عدل قائم کی تھی یعنی ایوان شاہی میں ایک زنجیر لٹکا دی تھی کہ جس کسی کو کچھ شکائت ہو وہ زنجیر آکر ہلا دے۔ زنجیر کے ہلنے کے ساتھ وہ کسی حالت میں ہوتا باہر نکل آتا تھا، دیکھو فرخی اس سے مضمون پیدا کرتا ہے۔

من چو مظلوماں، از سلسلۂ نوشیرواں ۔۔۔ اندر آویختہ زاں سلسلۂ زلف دراز

مشہور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہوا کے تخت پر بیٹھ کر سیر کیا کرتے تھے فرخی نے اس سے تشبیہ کا کام لیا۔

پے بازی گوئے شد خسرو ۔۔۔ بر یکے تازی اسپ کہ پیکر
راست گفتی بہ باد برسُلیمان بود ۔۔۔ گر بود باد را ستام بہ زر

حضرت موسیٰ جب رود نیل پر پہنچے تو دریا بیچ میں سے پھٹ کر سیدھی سڑک نکل آئی جس سے تمام بنی اسرائیل پار اتر گئے۔ فرخی کہکشاں کی تعریف میں کہتا ہے۔

مجرّہ چوں بدریا راہ موسے ۔۔۔ کہ اندر قعر او بگذشت لشکر

صنائع و بدائع، عارض سخن کے داغ ہیں۔ تاہم چونکہ اس زمانہ میں اس کا رواج عام ہو چکا تھا۔ فرخی کے کلام میں بھی یہ داغ پائے جاتے ہیں۔ لیکن چنداں بدنما نہیں معلوم ہوتے، لف و نشر، اور صنعت تقسیم کو ایک قصیدہ میں جمع کیا ہے۔

در رگ و اندر تن و اندر دل و اندر دو چشم ۔۔۔ خواب و صبر و روح و خوں را اے مہ افتاد انقلاب[۱]
رنج دارد جائے خون و درد دارد جائے روح ۔۔۔ عشق دارد جائے صبر و آب دارد جائے خواب
ہشت چیز او بر داز ہشت مایہ، ہشت چیز ۔۔۔ سال و ماہ ایں ہشت چیزش را ہمین است اکتساب
حلم او سنگ زمین و طبع او لطف ہوا ۔۔۔ روئے او دیدار ماہ و دست او جود سحاب

۱؎ یعنی برباد

رہم او حسن بہار و لفظ او قدر شکر	خلق او بازار مشک و خوئے او بوئے گلاب
ہشت چیزش را برابر یافتم با ہشت چیز	ہر یکے زاں ہشت سوئے فضل او دارد مآب
تیغ او را با قضا و تیر او را با قدر	اسپ او را با سپہر و خشت او را با شہاب
حزم او را با امان و عزم او را با ظفر	لفظ او را با قرآن و حفظ او را با کتاب

صنعتِ سوال و جواب

بہ بخت کہ گل سوری بچہ ریخت برگ چرا	زبہر لالہ کجا رفت لالہ شد پنہاں
ازاں چہ خیزد؟ دُرّ و ازیں چہ خیزد؟ زر	سخا کہ ورزد؟ ایں و عطا کہ بخشد؟ آں

فردوسی

حسن بن اسحاق بن شرف نام، اور فردوسی[1] تخلص تھا۔ دولت شاہ کا بیان ہے کہ کہیں کہیں وہ اپنا تخلص ابن شرف شاہ بھی لاتا ہے۔ مجالس المومنین میں بعض مؤرخوں کے حوالے سے اس کے باپ کا نام منصور بن فخر الدین احمد بن مولانا فرخ بیان کیا ہے۔ وطن میں بھی اختلاف ہے۔ چہار مقالہ میں ہے کہ طبرستان کی نواحی میں باژ نام ایک گاؤں تھا۔ فردوسی یہیں کا رہنے والا تھا۔ دیباچہ شاہنامہ میں گاؤں کا نام شاداب لکھا ہے۔ بہرحال اس قدر عموماً مسلم ہے کہ فردوسی کا وطن طوس کے اضلاع میں تھا۔ اور یہ وہی مردم خیز صوبہ ہے جس کی خاک نے امام غزالی اور محقق طوسی پیدا کئے۔ فردوسی کا وطن

سن ولادت معلوم نہیں، البتہ سال وفات سنہ ۴۱۱ھ ہے۔ اور چونکہ عمر کم از کم ۸۰ برس کی تھی جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے۔

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد	امیدم بہ یکبارہ بر باد شد

اس لئے سال ولادت تقریباً سنہ ۳۲۹ھ سمجھنا چاہیئے۔

[1] فردوسی کا حال، تمام تذکروں میں بہ تفصیل مذکور ہے لیکن سب میں باہم سخت اختلاف ہے۔ ان میں سب سے زیادہ قابل اعتبار چہار مقالہ ہے جس کا مصنف خود نامور شاعر اور فردوسی سے قریب العہد ہے۔ تاہم اس میں بھی سخت غلطیاں ہیں تیمور کے پوتے بای سنقر نے فضلا سے شاہنامہ پر جو دیباچہ لکھوایا تھا۔ اس میں فردوسی کی مفصل سوانحمری ہے۔ لیکن بعض واقعات ایسے لغو لکھے ہیں۔ کہ اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ دولت شاہ سمرقندی نے بھی کسی قدر تفصیل سے حالات لکھے ہیں۔ اور وہ بھی غلطیوں سے خالی نہیں۔ عربی مصنفین میں سے صرف قزوینی نے آثار البلاد میں اس کا حال لکھا ہے۔ میں نے ان سب میں سے واقعات لئے ہیں۔ لیکن جا بجا ان کی غلطیوں کی بھی تصریح کر دی ہے ؎

فردوسی کی ولادت فردوسی جب پیدا ہوا تو اس کے باپ نے خواب میں دیکھا کہ نوزائیدہ بچے نے کوٹھے پر چڑھ کر نعرہ مارا، اور ہر طرف سے لبیک کی صدائیں آئیں، صبح کو جا کر نجیب الدین سے جو اُس زمانہ کے مشہور معبر تھے، تعبیر پوچھی، انہوں نے کہا "یہ لڑکا شاعر ہوگا، اور اس کی شاعری کا غلغلہ تمام عالم میں پھیلے گا" سن رشد کو پہنچ کر تحصیل علوم میں مشغول ہوا اور تمام درسی علوم حاصل کئے، چونکہ آبائی پیشہ زمینداری تھا۔ اور جس گاؤں میں سکونت تھی خود اس کی ملک میں تھا۔ اس لئے معاش کی طرف سے فارغ البال تھا[1]، وہ اطمینان کے ساتھ علمی مشغلوں میں بسر کرتا تھا۔ اور کتب بینی کیا کرتا تھا۔

شاہنامہ کی ابتداء اور دربار میں رسائی یہ واقعہ جس قدر قطعی ہے۔ اُسی قدر اس کی تفصیل میں اختلاف ہے۔ عام روایت یہ ہے کہ فردوسی داد رسی کے لئے محمود کے دربار میں گیا یہاں اس کی شاعری کا جوہر کھلا، اور شاہنامہ کی تصنیف پر مامور ہوا۔ لیکن یہ قطعاً غلط ہے۔ فردوسی نے خود بیان کیا ہے۔ کہ شاہنامہ کی تصنیف میں ۳۵ برس صرف ہوئے۔

سی و پنج سال از سرائے سپنج	بسے رنج بردم بہ امید گنج
چو بر باد دادند گنج مرا	نبد حاصلے سی و پنج مرا

اور سلطان محمود کی کل مدت سلطنت ۳۱ برس ہے۔

شاہنامہ کے دیباچہ میں فردوسی نے خود جو سبب تصنیف بیان کیا ہے۔ اُس سے بھی اس روایت کی تکذیب ہوتی ہے۔ اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محمود کے دربار میں پہنچنے سے بہت پہلے وہ شاہنامہ شروع کر چکا تھا۔ تفصیل اُن واقعات کی، شاہنامہ کے سبب تصنیف میں آگے آئے گی۔

شاہنامہ کی ابتدا بہر حال اس قدر یقینی ہے۔ کہ فردوسی نے وطن ہی میں شاہنامہ کی ابتداء کی اور ابو منصور نے جو طوس کا صوبہ دار تھا، اس کی سرپرستی کی، ابو منصور کے مرنے کے بعد طوس کا عامل ارسلان خاں مقرر ہوا۔ چونکہ شاہنامہ کا اب ہر جگہ چرچا پھیلتا جاتا تھا۔ سلطان محمود کو بھی خبر ہوئی، ارسلان خاں کے نام حکم پہنچا کہ فردوسی کو دربار میں بھیج دو۔ فردوسی نے پہلے تو انکار کیا، لیکن پھر شیخ معشوق کی پیش گوئی یاد آئی۔ اس لئے راضی ہو گیا اور طوس سے چل کر ہرات میں آیا۔ لیکن ادھر دراندازیاں شروع ہو گئیں اور دربار کا میر منشی بدیع الدین دبیر تھا۔ اسی نے عنصری سے کہا کہ بادشاہ کو مدت سے شاہنامہ کی

[1] چہار مقالہ صفحہ ۶۰

تصنیف کا خیال تھا لیکن دربار کے شعراء میں سے کسی نے اس کی حامی نہیں بھری اب اگر فردوسی سے یہ کام بن آیا تو تمام شعرائے دربار کی آبرو خاک میں مل جائیگی عنصری نے کہا بادشاہ سے یہ تو نہیں کہا جاسکتا، کہ فردوسی کو الٹا پھیر دیجیے لیکن اس کی اور تدبیر کرنی چاہیئے۔ چنانچہ فردوسی کے پاس ایک قاصد بھیجا[1] کہ یہاں کا قصد بیفائدہ ہے۔ سلطان کو یونہی ایک خیال پیدا ہوا تھا۔ جس کی بنا پر آپ کی طلبی کا حکم صادر ہوا لیکن اس دن سے آج تک پھر کبھی ذکر تک نہیں آیا۔ اس لیے حقیقت واقعہ سے آپکو اطلاع دی گئی۔ **فردوسی** نے ہرات سے واپس جانا چاہا لیکن ساتھ ہی خیال پیدا ہوا کہ شاید اس میں کچھ بھید ہو۔ اتفاق سے عنصری اور بدیع الدین دبیر میں شکر رنجی پیدا ہوئی عنصری نے فردوسی کو جو خط لکھا تھا، بدیع الدین ہی کے مشورہ سے لکھا تھا۔ اب بدیع الدین نے فردوسی کے پاس قاصد بھیجا کہ فوراً ادھر کا عزم کیجیے، عنصری نے جو لکھا خود غرضی سے لکھا تھا۔ فردوسی نے خط کے جواب میں لکھ بھیجا کہ میں آتا ہوں، یہ اشعار بھی خط میں درج کیے۔

بگوش از سرو چشم بے مژدہ ہاست	دلم گنج گوہر زبان اژدہاست
چہ سنجد بہ میزان من عنصری	گیا چوں کشد پیش گلبن سرے

غرض ہرات سے چل کر غزنین میں آیا۔ اور ایک باغ کے قریب ٹھیرا، وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھی، شہر میں جن لوگوں سے راہ و رسم تھی۔ اُن کو اپنے آنے کی اطلاع دی اور پھرتا باغ میں جا نکلا جس اتفاق سے دربار کے ممتاز شعر یعنی **عنصری۔ فرخی۔ عسجدی** باغ میں سیر کو آئے تھے، اور بادہ جام کا دور چل رہا تھا، فردوسی ادھر جا نکلا حریفوں نے اس کو مخل صحبت سمجھ کر روکنا چاہا۔ ایک نے کہا کہ اس کو چھیڑا جائے تو خود تنگ ہو کر چلا جائے گا، عنصری نے کہا۔ یہ تہذیب اور آدمیت کے خلاف ہے۔ آخر رائے قرار پائی کہ رباعی کا ایک مصرعہ طرح کیا جائے، سب اس پر طبع آزمائی کریں، اگر یہ بھی مصرع لگائے، تو شریک صحبت کر لیا جائے ورنہ خود شرمندہ ہو کر اٹھ جائے گا۔

عنصری نے ابتدا کی اور کہا ع چوں عارض تو ماہ نباشد روشن۔

شعراء کا معرکہ

فرخی نے کہا۔ مانند رخت گل نبود در گلشن۔

[1] دیباچہ نویسوں نے عنصری کے ساتھ رودکی کا نام بھی لکھا ہے، لیکن رودکی اس سے پہلے ۳۰۴ھ میں مر چکا تھا

عسجدی نے کہا، مژگانت ہمے گزر کند از جوشن۔

قافیوں میں شین کا التزام تھا۔ اور اس التزام کے ساتھ کوئی شگفتہ قافیہ باقی نہیں رہا تھا۔ فردوسی نے برجستہ کہا ع مانند سناں گیو در جنگ پشن۔

سب نے گیو اور پشن کی تلمیح پوچھی، فردوسی نے تفصیل بیان کی، اُس وقت تو سب نے اس کو شریک صحبت کر لیا، لیکن رشک اور حسد، ایشیائی قوموں کا خاصہ ہی سب نے سازش کی کہ فردوسی دربار تک نہ پہنچنے پائے۔

بعض روائتوں میں ہے کہ یہ مشاعرہ خود سلطان محمود کے دربار میں ہوا تھا سلطان محمود کے ندیموں میں ماہک نام ایک شخص صاحب مذاق تھا۔ اُس سے کہیں باغ میں ملاقات ہو گئی تھی۔ فردوسی کی شیریں زبانی اور قابلیت دیکھ کر گرویدہ ہوا۔ اور اپنے گھر میں لاکر رکھا، کھانے کے بعد فردوسی سے اس کا حال دریافت کیا۔ اُس نے اپنی ساری داستان بیان کی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطان نے شاہنامہ کی تصنیف کا حکم دیا تھا۔ اور سات شاعر یعنی عنصری، فرخی، زینبی، عسجدی، منجیک چنگ زن خرمی، ابوبکر، اسکاف، ترمذی اس کام کے لئے انتخاب ہوئے تھے۔

ماہک نے فردوسی سے شاہنامہ کی تصنیف، اور شعرار کے انتخاب کا ذکر کیا۔ فردوسی نے کہا میں بھی شعر کہتا ہوں موقع ہو تو دربار میں میرا بھی ذکر کر دینا۔ ماہک نے اُسی دن دربار میں جاکر فردوسی کی تقریب کرنی چاہی لیکن موقع نہ ملا۔ اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ ایک دن ماہک نے دربار سے آکر بیان کیا کہ آج تمام شعرا دربار میں حاضر تھے۔ اور شاہنامہ کی مختلف داستانیں سنائی جارہی تھیں، عنصری نے رستم و سہراب کی داستان نظم کی تھی، جب یہ دو شعر پڑھے۔

دربار میں پہنچنے کی تقریب

ہر آنگہ کہ تشنہ شدی تو بخوں	بپالود ی ایں خنجر آب گوں
زمانہ بخون تو تشنہ شود	بہ اندام تو موئے دشنہ شود

تو سلطان محمود نے نہائت پسند کیا۔ اور حکم دیا کہ عنصری ہی اس خدمت کے لئے

لہ یہ دیباچہ شاہنامہ کی روائت ہی۔ دولت شاہ کا بیان ہے۔ اس امتحان کے بعد عنصری نے فردوسی کی تحسین کی اور خود دربار شاہی میں اس کو لے جاکر پیش کیا۔

مقرر کیا جائے، فردوسی اُس وقت چپکا ہو رہا۔ اور خود یہ داستان نظم کرنی شروع کی، رات کو جب معمول کے موافق کھانے پر بیٹھے تو فردوسی نے کہا عنصری سے پہلے شعرا نے رستم و سہراب کی داستان نظم کی ہے۔ چنانچہ خود میرے پاس ایک نظم موجود ہے جس کے آگے عنصری کے اشعار کی کچھ حقیقت نہیں، یہ کہہ کر نظم حوالہ کی، سرنامہ تھا۔

کنوں خورد باید مے خوشگوار	کہ مے بوئے مشک آرد از جویبار
ہوا پر خروش و زمیں پر ز جوش	خنک آنکہ دل شاد دارد بہ نوش
ہمہ بوستاں زیر برگ گل است	ہمہ کوہ پر لالہ و سنبل است

ماہک نے سلطان محمود کی خدمت میں جا کر تمہید کے ساتھ پیش کی۔ محمود نے پوچھا کہ یہ جواہر کہاں سے ہاتھ آئے۔ **ماہک** نے فردوسی کا نام لیا، اسی وقت طلبی ہوئی، محمود نے نام و نشان پوچھا، فردوسی نے کہا طوس کا باشندہ ہوں، محمود نے اس کے حالات پوچھے اور اسی سلسلہ میں پوچھا کہ طوس کب سے آباد ہے۔ اور کس نے آباد کیا، فردوسی نے تفصیل سے تمام واقعات بیان کئے، محمود نے شعرائے سبعہ کو بلوایا اور فردوسی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ رستم و سہراب کی داستان اسی نے نظم کی ہے۔ **فردوسی** نے اس کے اشعار سنائے تو سب حیرت زدہ رہ گئے۔ محمود نے خلعت عطا کیا، شعرا نے تحسین کی صدا بلند کی، عنصری نے بڑھ کر، فردوسی کے ہات چوم لئے۔ اس زمانہ میں امرد پرستی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا، محمود نے فردوسی سے فرمائش کی کہ ایاز کے سبزہ خط کی تعریف میں کچھ کہے، فردوسی نے برجستہ کہا۔

بدیہہ گوئی کا امتحان

مست است بتا! چشم تو و تیر بدست	بس کس کہ ز تیر چشم مست تو بخست
گر پوشد عارضت زرہ، عذرش است	کز تیر بتر سد ہمہ کس خاصہ ز مست

یعنی معشوق کی آنکھیں مست اور تیر بکف ہیں، اُن تیروں نے ہزاروں کے دل چھلنی کر دیئے ہیں۔ اس لئے ان سے بچنے کے لئے رخساروں نے زرہ پہن لی ہے۔ (خط کو زرہ سے تشبیہ دی ہے) کیونکہ مست سے سبھی ڈرتے ہیں، خصوصاً جب اُس کے ہاتھوں میں تیر ہو۔

شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت سپرد ہوئی

محمود نہایت محظوظ ہوا اور شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت سپرد کی، ساتھ ہی یہ بھی حکم ہوا کہ فردوسی کو ایوان شاہی کے قریب ایک مکان دیا جائے۔ جو تمام ضروری ساز و سامان

سے آراستہ ہو، اور آلاتِ جنگ، اسلحۂ حرب، شاہانِ عجم اور بہادروں اور پہلوانوں کے مرقعوں اور تصویروں سے سجا دیا جائے، ایک ایک شعر پر ایک ایک اشرفی صلہ مقرر ہوا اور حکم ہوا کہ جب ہزار شعر تک نوبت پہنچ جائے تو ہزار اشرفیاں دیدی جایا کریں لیکن فردوسی نے متفرق رقم سے انکار کیا، اور کہا کہ جب کتاب پوری ہو جائے گی تو ایک ساتھ لوں گا۔

فردوسی جب وطن میں تھا تو اکثر ایک چشمہ کے کنارے بیٹھا کرتا۔ اور آبِ رواں کی سیر سے لطف اٹھاتا، چشمہ کے اوپر بند تھا۔ جو برسات کے زمانہ میں ٹوٹ جاتا تھا۔ اور اس وجہ سے پانی گدلا ہو جاتا تھا، فردوسی کی طبیعت اس سے مکدر ہوتی تھی، قصد کیا کہ بند کو پختہ کرا دے لیکن اتنا مقدور نہ تھا۔ شاہنامہ لکھنا شروع کیا تو نیت کی کہ جو کچھ صلہ ملے گا۔ بند کی تیاری میں صرف کروں گا، یہ وجہ تھی کہ اس نے شاہنامہ کا صلہ متفرق طور پر لینا پسند نہ کیا۔

فردوسی نے متصل ۴ سال تک غزنین میں قیام کیا، اور شاہنامہ کی تصنیف میں مصروف رہا۔ پھر وطن گیا اور کئی برس رہ کر واپس[1] آیا، اس اثنا میں جو حصہ تیار ہو چکا تھا، محمود کے حضور میں پیش کیا۔ اور تحسین و آفرین کے صلے حاصل کئے۔

اثنائے تصنیف میں بیٹے کا انتقال

شاہنامہ کی تصنیف کے بیسویں سال جبکہ اس کی عمر ۶۵ برس کی تھی، اس کے جوان بیٹے کا انتقال ہو گیا، فردوسی کو سخت رنج ہوا چنانچہ اس واقعہ کا ذکر شاہنامہ میں کیا ہے۔

مگر بہرہ گیرم از پند خویش	براندیشم از مرگ فرزند خویش
ز بدہا تو بودی مرا دستگیر	چرا راہ جستی ز ہمراہ پیر
مگر ہمرہانِ جواں یافتی	کہ از پیش من تیز بشتافتی
جواں را چو شد سال بر سی (۳۷) و ہفت	نہ بر آرزو یافت گیتی و رفت
ہمے بود ہموارہ با من درشت	برآشفت و یکبارہ بنمود پشت
مرا شصت (۶۵) و پنج و ورا سی و ہفت	نپرسید ازیں پیر و تنہا برفت

عجمی تاریخ کا یہ نہایت ناگوار واقعہ ہے۔ کہ **فردوسی** کو اس کی اعجاز بیانی کی داد نہیں ملی یعنی جب شاہنامہ تیار ہوا تو اس کو اشرفیوں کے بجائے روپے دلوائے گئے

فردوسی کی ناکامی اور اس کا سبب

یہ واقعہ عموماً مسلم ہے لیکن اسباب مختلف بیان کئے گئے

[1] دولت شاہ

ہیں - اور سب باہم متناقض ہیں -

دولت شاہ نے لکھا ہے - کہ چونکہ فردوسی نے **ایاز** کی طرف کبھی رُخ نہیں کیا اِس لیے اُس نے دراندازی کی اور محمود کو یقین دلایا کہ فردوسی رافضی ہے، نظامی عروضی کا بیان ہے - کہ دربار کا بڑا گروہ وزیر اعظم **حسن میمندی**[1] کا مخالف تھا - اور چونکہ فردوسی کا مربی اور سرپرست وہی تھا - اِس لیے اُس کی ضد پر اس گروہ نے محمود کے کان بھرے - اور فردوسی کو معتزلی اور رافضی ثابت کیا، دیباچہ میں ہے کہ فردوسی کو خود حسن میمندی نے تباہ کیا جس کی وجہ یہ تھی - کہ غزنین اور اطراف وجوانب کے امراء فردوسی کو طرح طرح کے تحفے بھیجتے تھے، فردوسی بھی اشعار کے ذریعہ سے اُن کا شکریہ ادا کرتا تھا جس کو یہ ناگوار معلوم ہوتا تھا لیکن فردوسی کچھ پروا نہیں کرتا تھا - اور کہتا تھا -

من بندہ کز مبادی فطرت نبودہ ام — مائل بہ مال ہرگز وطامع بجاہ نیز
سوے در وزیر چرا ملتفت شوم — چوں فارغم زبارگہ بادشاہ نیز

حسن میمندی مذہباً خارجی تھا - اور فردوسی شیعہ، اس لئے بھی اُس نے فردوسی کی مخالفت کی، اِن متناقض روائتوں میں سے کس پر اعتبار کیا جائے[2] -

دیباچہ نویسوں نے ایک اور نکتہ بیان کیا ہے - اور اُس پر اُن کو ناز ہے - وہ یہ کہ **فردوسی** نے شاہنامہ میں جا بجا شرافتِ نسب کو بڑی آب و تاب سے لکھا ہے - اور یہ **سلطان محمود** کو اِس وجہ سے ناگوار ہوتا تھا - کہ وہ غلام زادہ تھا - اس لئے شرافت کی خوبی پر زور دینا، گویا در پردہ اس پر چوٹ تھی -

[1] سلطان محمود کی مدت حکومت میں تین شخصوں کو وزارت کا رتبہ ملا، سب سے پہلے فضل ابن احمد اس منصب پر ممتاز ہوا - وہ ابتدا میں سامانی خاندان کا نائب میر منشی تھا پھر سبکتگین کے دربار میں وزارت کے رتبہ پر پہنچا سبکتگین کے بعد سلطان محمود نے اس کا عہدہ بحال رکھا، علم وفن سے عاری تھا، لیکن مہمات سلطنت کے انتظام میں خداداد ملکہ رکھتا تھا - دس برس وزارت کرنے کے بعد سلطان محمود نے رقابت کی بنا پر معزول کر دیا - اس کے بعد حسن میمندی وزیر مقرر ہوا - اٹھارہ سال کے بعد وہ بھی معزول ہوا اور حسن بن محمدؒ کو وزارت[2] کی سند ملی، فردوسی نے فضل بن احمد کی مدح شاہنامہ میں لکھی ہے - اس سے قیاس ہوتا ہے کہ محمودؒ کے دربار میں اُسی نے فردوسی کی تقریب کی ہوگی - اور بالآخر جس نے محمود کو فردوسی کی ناکامی پر متوجہ کیا، وہ حسن بن محمدؒ ہوگا ۱۲

[2] حبیب السیر میں ان وزرا کے حالات کسی قدر تفصیل سے مذکور ہیں ۱۲

تذکرہ نویسوں کا فیصلہ یہ ہے۔ کہ محمود نے فردوسی کے شیعہ پن کی وجہ سے اسکی قدردانی میں کمی کی لیکن اولاً تو محمود کے دربار میں بہت سے شیعی علماء و فضلاء تھے۔ جو نہائت قدر و عزت سے بسر کرتے تھے۔ **ابوریحان بیرونی** جو علانیہ شیعہ تھا محمود نے خود فرمان بھیج کر اسکو بلایا تھا۔ اور نہائت قدردانی کرتا تھا، دربار میں ہندو، عیسائی، یہودی ہر مذہب و ملت کے اہل کمال تھے، فردوسی نے کیا قصور کیا تھا۔

دیباچہ میں ایک اور وجہ بیان کی ہے۔ اور وہ قرین قیاس ہے۔

سلطان محمود کو دیلمی خاندان سے سخت عداوت تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ متعصب شیعہ تھے۔ (دیباچہ میں رافضی کا لفظ تھا جس کو ہم نے بدل دیا) اس خاندان کا تاجدار فخر الدولہ تھا۔ وہ فردوسی کا نہائت قدردان تھا جب فردوسی نے رستم و اسفندیار کی داستان نظم کی تو اُس نے صلہ کے طور پر ہزار اشرفیاں بھیجیں اور لکھا کہ اگر آپ یہاں تشریف لائیں تو نہائت اعزاز و احترام کیا جائے گا، یہ خبر تمام غزنین میں پھیل گئی محمود نے سنا تو اُس کو ناگوار گزرا۔

اس اجمال کی توضیح یہ ہے کہ سلاطین دیلم عموماً سخت متعصب شیعہ تھے ۳۵۱؁ھ میں معزالدولہ دیلمی کے حکم سے بغداد کی تمام مسجدوں کی دیواروں پر یہ عبارت لکھی گئی۔ "امیر معاویہ اور غاصب فدک پر لعنت ہے" رات کو لوگوں نے یہ عبارت مٹادی معزالدولہ نے دوبارہ لکھنے کا حکم دیا لیکن وزیر مہلبی نے رائے دی کہ صرف اس قدر لکھوا دیا جائے "ظالمین آل محمدؐ پر لعنت ہے" البتہ معاویہ کا نام بہ تصریح لکھا جائے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل ہوئی۔[1] یہ تعصب روز بروز بڑھتا گیا، سیوطی ۳۶۴؁ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں۔

وفی هذہ السنة وبعدها علا الرفض وفار بمصر والشام والمشرق والمغرب	اس سن میں اور اس کے بعد، مصر، شام اور مشرق و مغرب میں یہ رفض اُبل پڑا۔

فرقہ باطنیہ جو مسلمانوں کو چھپ چھپ کر قتل کرتا رہتا تھا۔ اُن کی بڑی جمعیت دیلمیوں ہی کے زیر حمائت تھی چنانچہ جب ۴۲۰؁ھ میں سلطان محمود نے مجدالدولہ دیلمی کو گرفتار کیا تو باطنیوں کا ایک گروہ عظیم اس کے ساتھ تھا۔[2] ان اسباب سے محمود کو دیلمیوں کے ساتھ نہ صرف مذہبی بلکہ پولیٹکل دشمنی تھی۔ اس لئے وہ فردوسی کے ساتھ فخرالدولہ دیلمی کی خط و کتابت کو مصالح ملکی کے لحاظ سے بھی گوارا نہیں کرسکتا تھا۔

[1] ابن الاثیر واقعات ۳۵۱؁ھ [2] ابن الاثیر واقعات ۴۲۰؁ھ۔

بہر حال وجہ کچھ ہو، واقعہ یہ ہے۔ کہ محمود نے فردوسی کی قدر دانی کا حق ادا نہ کیا۔

فردوسی حمام میں نہا رہا تھا کہ شاہنامہ کا صلہ پہنچا۔ فردوسی حمام سے نکلا۔ تو ایاز نے روپے کی تھیلیاں پیش کیں۔ فردوسی نے بڑی بیتابی سے دستِ شوق بڑھایا۔ لیکن سونے کے پھول کے بجائے چاندی کے پھول تھے۔ فردوسی کے دل سے بے ساختہ آہ نکلی تھیلیاں کھڑے کھڑے لٹا دیں اور ایاز سے کہا کہ بادشاہ سے کہنا کہ میں نے یہ خونِ جگر ان سفید دانوں کے لئے نہیں کھایا تھا۔ ایاز نے محمود سے ساری کیفیت بیان کی۔ محمود نے حسن میمندی کو بلا کر ناراضی ظاہر کی اور کہا کہ تیری درانداز ی نے مجھ کو بدنام کر دیا۔ میمندی نے کہا۔ کہ حضور خاک کی ایک چٹکی بھیج دیتے تب بھی فردوسی کو آنکھوں سے لگانا تھا۔ انعام شاہی کا رد کرنا بڑی گستاخی ہے۔" اس چبھتے ہوئے فقرہ نے محمود کے دل میں بھی اثر کیا۔ اور برہم ہو کر کہا کہ کل میں اس قرمطی کو اس گستاخی کا مزہ چکھاؤں گا۔ فردوسی کو خبر ہوئی تو سخت پریشان ہوا۔ صبح کو محمود باغ میں آیا۔ تو فردوسی نے دوڑ کر پاؤں پر سر رکھ دیا۔ اور بدیہہ یہ اشعار پڑھے ۔

چو در ملک سلطان کہ چرخش سعود	بسے ہست ترسا و گبر و یہود
گرفتند در ظلِ عدلش قرار	شمارہ ایمن از گردشِ روزگار
چہ باشد کہ سلطانِ گردوں شکوہ	برے را شمارد یکے زاں گروہ

سلطان محمود کو رحم آیا۔ اور اس کی تقصیر معاف کی۔

غزنین سے چلتے وقت فردوسی نے ایاز کو ایک لفافہ سر بمہر دیا اور کہا کہ میرے جانے کے ۲۰ دن بعد بادشاہ کو دینا، فردوسی ہرات کو روانہ ہوا۔ محمود نے لفافہ کی مُہر کھولی تو ہجو کے اشعار تھے۔ سلطان محمود کی ہجو

بسے بندگی کردم اے شہریار	کہ ماند ز تو در جہاں یادگار
پے افگندم از نظم کاخِ بلند	کہ از باد و باراں نیابد گزند
بسے رنج بردم دریں سال سی	عجم زندہ کردم بدیں پارسی
چو بر باد دادند گنج مرا	نبد حاصلے سی و پنج مرا
اگر شاہ را شاہ بودے پدر	بسر بر نہادے مرا تاجِ زر
وگر مادرِ شاہ بانو بُدے	مرا سیم و زر تا بزانو بُدے

پرستار زادہ نیاید بکار　　دگر چند دارد پدر شہریار
سرِ ناسزایاں برافراشتن　　وزلیشاں امید بہی داشتن
سرِ رشتۂ خویش گم کردن است　　بہ جیب اندروں مار پروردن است
درختے کہ تلخ است ویرا سرشت　　گرش برنشانی بہ باغِ بہشت
وراز جوئے خلدش بہ ہنگامِ آب　　بہ بیخ انگبیں ریزی وشہد ناب
سرانجام گوہر بہ کار آورد　　ہماں میوۂ تلخ بار آورد
زبد اصل چشم بہی داشتن　　بود خاک در دیدہ انباشتن
ازاں گفتم ایں بیتہائے بلند　　کہ تا شاہ گیرد ازیں کار پند
کہ شاعر چو رنجد بگوید ہجا　　بماند ہجا تا قیامت بجا

کلام کی جہانگیری دیکھو، محمود نے دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں مٹا دیں۔ ملک کے ملک غارت کر دیئے۔ عالم کو زیر و زبر کر دیا لیکن فردوسی کی زبان سے جو بول نکل گئے آج تک قائم ہیں۔ اور قیامت تک نہیں مٹ سکتے۔

فردوسی کا غزنین سے نکل کر آوارہ پھرنا

فردوسی غزنین سے نکلا تو اس بے سر و سامانی سے نکلا کہ ایک چادر اور عصا کے سوا کچھ پاس نہ تھا۔ احباب اور قدردانوں کی کمی نہ تھی لیکن معتوبِ شاہی کو کون پناہ دے سکتا تھا۔ تاہم ایاز نے یہ جرأت کی کہ جب فردوسی شہر سے باہر نکل گیا تو مخفی طور پر کچھ نقدی اور سامانِ سفر بھجوا دیا، فردوسی ہرات میں آیا اور اسمٰعیل وراق کے ہاں مہمان ہوا۔ چونکہ سلطان محمود نے ہر طرف فرمان بھیج دیئے تھے۔ کہ فردوسی جہاں ہات آئے گرفتار کر کے بھیج دیا جائے۔ چھ مہینے تک روپوش رہا، شاہی جاسوس ہرات میں آئے لیکن فردوسی کا پتہ نہ لگا سکے، اب اس نے ہرات سے طوس[1] کا رخ کیا۔ طوس سے قہستان گیا۔ ناصر لک یہاں کا حاکم تھا۔ اس کو خبر ہوئی تو ندیمانِ خاص کو استقبال کے لئے بھیجا اور نہایت اخلاص کیساتھ پیش آیا، فردوسی نے ایک مثنوی لکھنی شروع کی تھی جس میں حاسدوں کی دراندازی، اپنی مظلومی اور سلطان محمود کی بدعہدی و ناقدردانی کا ذکر تھا۔

سلطان محمود کی شکایت کے اشعار

بہ غزنین مرا اگرچہ خوں شد جگر　　زبیداد آں شاہ بیداد گر
کزاں ہیچ شد رنج سی سالہ ام　　شنید از زمین آسماں نالہ ام

[1] چہار مقالہ ۱۲

ہمے خواستم تا فغانہا کنم	بہ گیتی از و داستانہا کنم
بگویم ز مادرش و ہم از پدرش	نہ ترسم بغیر از خداوند عرشش
چو دشمن نمیداند از دوست باز	بہ تیغ زبانش کنم پوست باز
ولیکن ز فرمودۂ محتشم	ندانم کزیں پیش چوں سرکشم
فرستادم از گفتۂ داشتم	بہ نزدیک خود، ہیچ نگذاشتم
اگر باشد ایں گفتہا ناصواب	بسوزاں در آتش بشوے آں در آب
گزشتم ایا سرورِ نیک رائے	ازیں داوری تا بدیگر سرائے
رسد لطف یزداں بفریاد من	ستانند بحشر از و داد من

فردوسی نے مثنوی کے اشعار ناصرلک، کو سنائے، تو اس نے سمجھایا کہ بدگوئی اہل کمال کی شان نہیں میں لاکھ روپے ان اشعار کے معاوضہ میں دیتا ہوں اشعار کہیں ظاہر نہ ہونے پائیں، فردوسی نے منظور کیا، ناصرلک نے سلطان محمود کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ فردوسی کے حق میں بڑا ظلم ہوا۔ فردوسی جب غزنین سے روانہ ہوا تھا تو جامع مسجد کی دیوار پر یہ اشعار لکھ آیا تھا۔

خجستہ درگہ محمود غزنوی دریا است	چگونہ دریا کاں را کرانہ پیدا نیست
چو غوطہ ہا زدم و اندرو ندیدم دُر	گناہ بخت من است ایں گناہ دریا نیست

اتفاق یہ کہ جس دن ناصرلک کا عریضہ پہنچا سلطان نماز جمعہ پڑھنے کے لئے جامع مسجد میں آیا تھا۔ اتفاق سے ان اشعار پر نظر پڑی۔ نہایت متاسف ہوا۔ مسجد سے آکر، ناصرلک کا عریضہ دیکھا اور بھی مکدر ہوا۔ جن لوگوں نے فردوسی کے حق میں کانٹے بوئے تھے۔ اُن کو بُلا کر سخت توبیخ کی کہ تم نے دنیا میں مجھ کو بدنام کر دیا۔

ناصرلک نے گو فردوسی کی بہت کچھ خاطر مدارات کی تاہم سلطان محمود کے ڈر سے اپنے پاس نہ ٹھیرا سکا۔ فردوسی یہاں سے بھی نکلا اور رماژندران میں آیا یہاں وہ شاہنامہ کی نظر ثانی میں مشغول ہوا۔

له یہ دیباچہ کی روایت ہے۔ چہار مقالہ میں قہستان کے بجائے طبرستان اور ناصرلک کے بجائے سپہبد شیرزاد کا نام ہے۔ دولت شاہ نے طبرستان کے بجائے رستمدار لکھا ہے۔ طبرستان اور رستمدار دراصل ایک ہی ہیں لیکن سپہبد اور ناصرلک دو شخص ہیں۔ دولت شاہ نے ان میں سے ایک کو چھوڑ دیا ہے۔

مازندران کی حکومت قابوس بن وشمگیر کے خاندان میں چلی آتی تھی اور اس زمانہ میں سپہبد فرمانروا تھا۔ اس کو فردوسی کے آنے کی خبر ہوئی تو نہایت مسرت ظاہر کی اور فردوسی کو دربار میں بلایا۔ فردوسی نے مدحیہ اشعار اضافہ کر کے شاہنامہ پیش کیا۔ سپہبد نے چاہا کہ فردوسی کو دربار سے نہ جانے دے، لیکن پھر سلطان محمود کا خیال آیا۔ ایک گراں بہا صلہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ محمود آپ سے ناراض ہے۔ اس لئے میں آپ کو ٹھیرا نہیں سکتا۔ آپ اور کہیں تشریف لے جائیے۔

دیباچہ نویسوں نے لکھا ہے کہ "فردوسی یہاں سے بغداد گیا خلیفۂ عباسی نے اس کی بڑی قدر کی۔ فردوسی نے عربی میں قصیدے لکھ کر پیش کئے۔ اور اہل بغداد کی فرمائش سے یوسف زلیخا لکھی۔ سلطان محمود کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو خلیفۂ عباسی کو تہدید کا خط لکھا کہ فردوسی کو فوراً یہاں بھیج دیجئے۔ ورنہ بغداد ہاتھیوں کے پاؤں کے نیچے ہوگا۔ وہاں سے تین حرف الف لام میم لکھ کر آئے کہ سورۂ الم ترکیف کی طرف اشارہ تھا" لیکن یہ تمام بے سروپا خرافات ہیں۔

ایک دفعہ سلطان محمود ہندوستان کی مہم سے واپس آ رہا تھا۔ راستہ میں دشمن کا قلعہ تھا۔ وہیں ٹھیر گیا اور قاصد بھیجا کہ حاضر خدمت ہو کر اطاعت بجالائے۔ دوسرے دن قاصد جواب لایا لیکن ابھی کچھ کہنے نہیں پایا تھا کہ محمود نے وزیر اعظم سے کہا کہ دیکھ کیا جواب لایا ہے وزیر نے برجستہ کہا۔

اگر جز بکام من آمد جواب	من و گرز و میدان و افراسیاب

سلطان محمود نے تلافی مافات کا ارادہ کیا

محمود پھڑک اٹھا۔ اور پوچھا کس کا شعر ہے؟ وزیر نے کہا۔ اس بدقسمت کا جس نے ۲۵ برس خونِ جگر کھایا اور کچھ نہ حاصل ہوا۔ محمود نے کہا۔ مجھکو سخت ندامت ہے۔ غزنین پہنچ کر یاد دلانا۔ غرض پائے تخت میں پہنچ کر ساٹھ ہزار اشرفیاں فردوسی کے پاس روانہ کیں۔ لیکن تقدیر پر کس کا زور ہے۔ ادھر شہر کے ایک دروازے سے جس کا نام رودبار تھا صلہ پہنچا، ادھر دوسرے دروازے سے فردوسی کا جنازہ

لہ یہ واقعہ مختلف طریقوں سے مروی ہے۔ میں نے جو روایت لکھی ہے۔ نظامی سمرقندی سے مروی ہے۔ اور اس لئے زیادہ معتبر ہے کہ اس نے ۵۱۲ھ میں امیر معزی (ملک الشعرا سلطان سنجر) سے سنی تھی۔ اور امیر معزی سے امیر عبدالرزاق نے بیان کی تھی، دیکھو چہار مقالہ واقعات فردوسی ۱۲

نکل رہا تھا۔

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میسر	یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

طوس میں ایک واعظ صاحب تھے۔ انہوں نے فتویٰ دیا کہ چونکہ فردوسی رافضی تھا۔ اس کا جنازہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہو سکتا۔ ہر چند لوگوں نے منت سماجت کی لیکن بدنفس واعظ نے ایک نہ مانی۔ مجبوراً شہر کے باہر ایک باغ میں کہ خود فردوسی کی ملک تھا دفن کیا۔ سلطان محمود کو پرچہ گزرا تو حکم دیا کہ واعظ شہر سے نکال دیا جائے۔

فردوسی نے اولاد ذکور نہیں چھوڑی تھی۔ صرف ایک لڑکی تھی۔ شاہی صلہ اس کی خدمت میں پیش کیا گیا لیکن اس کی بلند ہمتی نے گوارا نہ کیا کہ باپ جس چیز کی حسرت میں مر گیا اولاد اُس سے تمتع اٹھائے۔ سلطان محمود کو اسکی اطلاع دی گئی حکم دیا کہ اشرفیاں امام ابوبکر اسحٰق کے حوالے کی جائیں کہ اس سے فردوسی کے نام پر ایک کارروان سرائے بنا دی جائے۔ ناصر خسرو نے سفر نامہ میں لکھا ہے۔ کہ ۴۳۰ھ میں جب میں طوس میں پہنچا تو ایک بڑی کارروان سرا دیکھی۔ لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ فردوسی کے صلہ سے تعمیر ہوئی ہے۔ فرہنگ رشیدی اور چہار مقالہ میں لکھا ہے کہ اس کا نام چاہ ہے۔ اور مرو اور نیشاپور کے راستہ میں ہے۔

عام تذکرہ نویسوں کا بیان ہے۔ کہ فردوسی نے ۴۱۱ھ میں وفات پائی۔ لیکن فردوسی نے شاہنامہ کے خاتمہ میں تصریح کی ہے۔ کہ شاہنامہ ۴۰۰ھ میں انجام کو پہنچا۔"

ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار	کہ گفتم من ایں نامۂ شہریار۔

اس کے ساتھ یہ بھی تصریح کی ہے کہ اس وقت اس کی عمر اسّی برس کی تھی۔

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد	امیدم بہ یکبارہ برباد شد

شاہنامہ کے ختم ہونے کے بعد، وہ دو چار برس سے زیادہ زندہ نہیں رہا اس لئے اس کی وفات ۴۱۱ھ سے چند برس پہلے ہوئی ہوگی۔

فردوسی کا مزار مدت تک آباد اور بوسہ گاہ عالم رہا نظامی سمرقندی نے ۵۱۰ھ میں اس کی زیارت کی تھی۔ دولت شاہ نے لکھا ہے۔ کہ آج اس کا مزار مرجع عام ہے۔ قاضی نور اللہ شوستری مجالس المومنین میں لکھتے ہیں۔ کہ عبداللہ خاں ازبک کی توجہ سے فردوسی کا مقبرہ معمور اور پُر رونق ہے۔ عام لوگ عموماً اور شیعہ خصوصاً زیارت کو جاتے

ــــــــــــــــ

لہ چہار مقالہ ۱۲

ہیں۔ میں نے بھی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے۔''

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق	ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

شاہنامہ

سن تصنیف و سبب تصنیف کیا عجیب بات ہے۔ جو واقعہ جس قدر زیادہ مشہور ہوتا ہے۔ اُسی قدر اکثر غلط اور بے سروپا ہوتا ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ فردوسی نے سلطان محمود کے دربار میں پہنچ کر اس کے حکم سے شاہنامہ لکھنا شروع کیا۔ اکثر تذکروں میں بھی یہی لکھا ہے لیکن یہ غلط اور محض غلط ہے۔

فردوسی نے خاتمہ میں خود تصریح کی ہے۔ کہ یہ کتاب ۴۰۰ھ میں تمام ہوئی۔

ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار[1]	کہ گفتم من ایں نامۂ شہریار

اس کے ساتھ یہ بھی تصریح کی ہے کہ پینتیس برس کتاب کی تصنیف میں صرف ہوئے۔

سی و پنج سال از سرائے سپنج	بسے رنج بردم بامید گنج

اس بنا پر تصنیف کا آغاز ۳۶۵ھ سمجھنا چاہئے۔ اور چونکہ سلطان محمود ۳۸۹ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس لئے اُس کی تخت نشینی سے مدتوں پہلے شاہنامہ کی ابتداء ہو چکی تھی۔ عام خیال یہ ہے۔ کہ شاہنامہ **سلطان محمود** کی فرمائش سے لکھا گیا لیکن یہ بھی محض غلط ہے۔ فردوسی نے خود سبب تصنیف لکھا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس کو صرف اپنے اسلاف کا نام زندہ کرنا مقصود تھا۔

ہمے خواہم از داد گر یک خدائے	کہ چنداں بمانم بہ گیتی بہ جائے
کہ ایں نامۂ شہریاران پیش	بہ پیوندم از خوب گفتار خویش
بسے رنج بردم دریں سال سی	عجم زندہ کردم بدیں پارسی
ہمہ مردہ از روزگار دراز	شد از گفت من نام شاں زندہ باز
چو عیسٰے من ایں مردگاں را تمام	سراسر ہمہ زندہ کردم بنام
پے افگندم از نظم کاخ بلند	کہ از باد و باراں نیابد گزند

تیسرے دفتر میں جہاں **دقیقی** کے اشعار نقل کئے ہیں۔ خاتمہ پر لکھتا ہے۔

[1] پانچ کو اسی میں ضرب دیں تو چار سو ہوتے ہیں۔ ۱۲

من ایں نامہ فرخ گرفتم بہ فال
ہمے رنج بردم بہ بسیار سال

ندیدم سرافراز بخشندۂ
بہ گاہِ کیاں بر نشینندۂ

سخن را نگہد اشتم سال بیست[۲۰]
بداں تا سزاوار ایں گنج کیست

جہاندار محمود با فر وجود
کہ اورا کند ماہ و کیواں سجود

ان اشعار میں صاف تصریح ہے کہ سلطان محمود کے دربار میں پہنچنے سے بیس سال پہلے **شاہنامہ** شروع ہو چکا تھا۔

دیباچہ سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ کتاب کا آغاز اس نے خود اپنے شوق سے کیا، قرائن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ فردوسی فطرتاً شاعر تھا، اس کے ساتھ نسل کا مجوسی یعنے شاہان ایران کا ہم قوم تھا۔ **دقیقی** نے شاہنامہ کی جو بنیاد ڈالی تھی اور جس قدر شعر لکھ لئے تھے۔ اس کے چرچے ہر جگہ پھیل گئے تھے اور اس سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ اس کتاب میں قبولیت کا کس قدر مادہ ہے۔ یہ اسباب اس بات کیلئے کافی تھے۔ کہ فردوسی نے خود اپنے شوق سے **شاہنامہ** لکھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن چونکہ ایک عظیم الشان کام تھا۔ اور اعانت کے بغیر انجام نہیں پا سکتا تھا سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت تھی کہ تاریخ کا مستند سرمایہ ہاتھ آئے حسن اتفاق یہ کہ فردوسی کے وطن ہی میں ایک شخص کے پاس یہ سرمایہ موجود تھا۔ اور وہ فردوسی کا مخلص دوست تھا۔ اس کو یہ حال معلوم ہوا۔ تو اس نے یہ کتاب لاکر فردوسی کو دی۔ چنانچہ فردوسی دیباچہ میں لکھتا ہے۔

بہ شہرم یکے مہربان دوست بود
تو گفتی کہ با من بیک پوست بود

مرا گفت خوب آمد ایں رائے تو
بہ نیکی خرامد مگر پائے تو

نوشتہ من ایں نامۂ پہلوے
بہ پیش تو آرم نگر نغنوی

شو، ایں نامۂ خسرواں باز گوے
بدیں جوے نزد مہاں آبروے

چو آورد ایں نامہ نزدیک من
برافروخت ایں جان تاریک من

فردوسی اگرچہ جیسا کہ نظامی سمرقندی نے لکھا ہے۔ رئیس زادہ اور خوشحال تھا تاہم جب اس نے **شاہنامہ** لکھنا شروع کیا۔ تو علم دوست امراء نے قدر دانی کا اظہار کرنا چاہا لیکن منصور بن محمد نے جو طوس کا حاکم تھا۔ ایسی فیاضی کا اظہار کیا۔ کہ فردوسی تمام لوگوں سے بے نیاز ہو گیا۔

بدیں نامہ چوں دست کردم دراز	یکے مہترے بود گردن فراز
جواں بود از گوہر پہلوان	خردمند و بیدار روشن رواں
مرا گفت کز من چہ آید ہمے	کہ جانت سخن بر گراید ہمے
بچیزے کہ باشد مرا دسترس	بکوشم۔ نیازت نہ آرم بکس

افسوس کہ منصور چند روز کے بعد مر گیا۔ فردوسی نے اس کا بہت پُر درد مرثیہ لکھا۔

شاہنامہ کے قدردان

حسین قتیب۔ علی دیلم۔ بودلف اور فضل ابن احمد کا نام بھی فردوسی کے قدردانوں کی فہرست میں داخل ہے۔ نظامی سمرقندی نے لکھا ہے کہ "حسین قتیب طوس کا عامل تھا" (غالباً منصور کے مرنے کے بعد مقرر ہوا ہوگا۔) اس نے فردوسی کے دہات کی مال گزاری معاف کر دی تھی۔[1]

فضل ابن احمد سلطان محمود کا وزیر تھا۔ جس کے ہٹنے کے بعد حسن میمندی اس منصب پر ممتاز ہوا۔ فضل کا تذکرہ بھی فردوسی نے شاہنامہ میں کیا ہے۔

نظامی عروضی کا بیان ہے کہ علی دیلمی شاہنامہ کا مسودہ صاف کیا کرتا تھا اور بودلف راوی تھا یعنی شاہنامہ حفظ یاد رکھتا تھا۔ اور جلسوں اور صحبتوں میں لوگوں کو سناتا تھا۔ لیکن شاہنامہ میں فردوسی نے ان دونو کا نام اس انداز سے لیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ فردوسی کے سرپرست اور مربی تھے۔ کاتب اور راوی نہ تھے۔

ازاں نامور نامداران شہر	علی دیلم و بودلف راست بہر

بودلف کی نسبت قاضی نور اللہ شوستری کا قیاس ہے کہ یہ وہ بودلف ہے جو ایک محتشم رئیس تھا۔ جس کے نام پر اسدی طوسی نے **گشتاسپ نامہ** لکھا ہے۔ اور دیباچہ میں اس کی مدح و ثنا کی ہے۔

ملک بودلف شہریار زمیں	جہاندار ارّانی پاک دیں
بزرگی کہ با آسماں ہمسر است	زنسل براہیم پیغمبر است

خوش اعتقاد دیباچہ نویسوں نے لکھا ہے۔ کہ فردوسی نے جب شاہنامہ لکھنے کا ارادہ کیا تو شیخ محمد معشوق طوسی کی خدمت میں جو ایک مشہور صاحبدل تھے حاضر ہوا۔ اور اُن سے اپنا خیال ظاہر کیا۔ انہوں نے کہا تم اس کام کو شروع کرو۔ خدا تم کو

[1] چہار مقالہ نظامی سمرقندی ۱۲

کامیاب کرے گا" فردوسی تو کامیاب نہیں ہوا لیکن شاہنامہ کی کامیابی میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔

شاہنامہ کا ماخذ

شاہنامہ کا تاریخی مواد

سر جان مالکم[1] صاحب اپنی تاریخ صفحہ ۱۵۶ میں لکھتے ہیں۔
"قرن اول کے تمام مؤرخین لکھتے ہیں۔ کہ چونکہ ایرانیوں نے عرب کے حملے کے روکنے میں نہایت پامردی دکھائی تھی۔ اس لئے پیروان اسلام اس قدر برافروختہ تھے۔ کہ انہوں نے ایران کی تمام قومی یادگاروں کو برباد کر دیا۔ شہروں کو آگ لگا دی۔ آتشکدے برباد کر دیئے۔ موبدوں کو قتل کرا دیا۔ ہر قسم کی کتابیں عموماً برباد کر دیں۔ کتب خانوں کے مالکوں کو قتل کر دیا۔ یہ متعصب عرب قرآن کے سوا اور کچھ نہیں جانتے تھے۔ اور نہ جاننا چاہتے تھے۔ موبدوں کو مجوس کہتے تھے۔ اور ان کو جادوگر سمجھتے تھے۔ یونان اور روم کی کتابوں سے قیاس ہو سکتا ہے کہ اس طوفان میں ایران کی کس قدر کتابیں بچی ہوں گی قریباً چار سو برس گزر گئے۔ اور کسی نے ایرانیوں کی تاریخ لکھنے پر توجہ نہیں کی۔ سب سے پہلی کوشش اس کے متعلق جو کی گئی وہ سامانیوں نے کی۔ مورخین کو اس میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ منصور ثانی نے ابتدا کی۔ بعض کہتے ہیں کہ دقیقی نے شاہنامہ لکھنا اسمٰعیل کے زمانہ میں شروع کیا جو سلسلۂ سامانیہ کا پہلا تاجدار تھا۔ غرض چونکہ سلاطین سامانی اپنے آپ کو بہرام چوبین کے خاندان سے سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے اسلاف کا نام زندہ کرنا چاہا۔"

مالکم صاحب ایک مدت تک ایران میں رہے ہیں۔ فارسی زبان میں اُنکو پوری مہارت تھی۔ اسلامی تاریخ کی طرف خاص توجہ تھی۔ ان سب باتوں کے ساتھ اُن کی تحقیقات کا یہ عالم ہے کہ اتنی لمبی چوڑی عبارت میں ایک حرف بھی صحیح زبان سے نہ نکلا۔ مالکم صاحب کے تعصب کے جواب دینے کا یہ موقع نہیں۔ البتہ تاریخی حیثیت سے یہ امر قابل بحث ہے کہ فردوسی نے جب شاہنامہ لکھنا چاہا۔ تو ایران کا تاریخی ذخیرہ کس

[1] سر جان مالکم صاحب ایک مدت تک ایران میں انگریزی سرکار کی طرف سے سفیر تھے۔ انہوں نے ایران کی تاریخ قدیم و جدید پر ایک کتاب انگریزی میں لکھی۔ مرزا حیرت دہلوی نے اس کا ترجمہ کیا جو بمبئی میں ۱۸۷۲ء میں چھاپا گیا۔

قدر موجود تھا۔ عام خیال یہ ہے کہ مسلمانوں میں علوم و فنون کی تدوین سنہ ۱۴۳ھ سے شروع ہوئی اور درحقیقت اسلامی علوم و فنون کے متعلق اس سے پہلے کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ غیر قوموں کے علوم و فنون کا ترجمہ اس سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔ ہشام بن عبد الملک جو سنہ ۱۰۵ھ میں تخت نشین ہوا۔ اور جو سلاطین بنی اُمیہ کا گل سرسبد تھا سب سے پہلے اس نے غیر قوموں کی تاریخ کی طرف توجہ کی۔ اس کا میر منشی جبلہ بن سالم تھا۔ اس نے فارسی زبان کی بہت سی کتابیں ترجمہ کیں جن میں سے جنگ رستم و اسفندیار اور داستانِ بہرام چوبیں بھی تھی[1]۔ شاہانِ عجم کے علمی ذخیرے جو فتوحات میں ہات آئے تھے۔ ان میں ایک کتاب تاریخ تھی۔ یہ ایران کی نہایت مفصل اور مبسوط تاریخ تھی جس میں سلطنتوں کے حالات کے ساتھ حکومت کے قواعد اور آئین عہد بعہد کے علوم و فنون تعمیرات، وغیرہ کے مفصل حالات تھے۔ ایک خاص جدت یہ تھی کہ تمام سلاطین کی تصویریں بھی تھیں۔ اور تصویروں میں ان کی خاص وضع قطع، لباس، زیورات، اور تمام خصوصیات کو بعینہٖ دکھایا تھا۔ ہشام نے اس کتاب کا ترجمہ کرایا۔ چنانچہ سنہ ۱۱۳ھ میں یہ ترجمہ تیار ہوا۔ مؤرخ مسعودی نے کتاب الاشراق[2] میں لکھا ہے۔ کہ میں نے سنہ ۳۰۳ھ میں بمقام اصطخر یہ کتاب دیکھی سلطنت فارس کے متعلق جس قدر کتابیں فارسی میں موجود ہیں۔ یہ سب سے زیادہ مفصل ہے"۔ دولت عباسیہ نے آغاز ہی سے ایران کے علوم و فنون کے ترجمہ کی طرف توجہ کی، ان میں سے تاریخی کتابیں حسب ذیل ہیں:۔

خدائی نامہ[3]۔ یہ نہایت مفصل تاریخ تھی اور اس قدر مقبول عام تھی کہ بہرام ابن مروان شاد نے جو دولت عباسیہ کا مترجم تھا جب اس کتاب کو بہم پہنچانا چاہا تو بیس مختلف نسخے اس کو ہات آئے۔ عبد اللہ بن المقفع نے اس کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں کیا اور اس کا نام تاریخ ملوک الفرس رکھا۔

آئین نامہ۔ یہ بھی نہایت مفصل کتاب ہے۔ علامہ مسعودی نے کتاب التنبیہ والاشراف (صفحہ ۱۰۴) میں لکھا ہے۔ کہ یہ بہت ضخیم کتاب اور کئی ہزار صفحوں میں ہے۔

---

[1] کتاب الفہرست صفحہ ۱۱۷۔ [2] کتاب مذکور مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۰۶۔۱۰۳۔ [3] خدائی نامہ کا ذکر تاریخ حمزہ اصفہانی مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۹۸ و ۱۶ و ۲۴ اور کتاب الفہرست صفحہ ۱۱۸ میں ہے۔

عبد اللہ بن المقفع نے اس کا ترجمہ کیا۔

سیر ملوک الفرس۔ مترجمہ عبد اللہ بن المقفع

سیر ملوک الفرس۔ مترجمہ محمد جہم البرمکی

سیر ملوک الفرس۔ مترجمہ زادویہ بن شاہویہ الاصفہانی

سیر ملوک الفرس[1]۔ مترجمہ محمد بن بہرام الاصفہانی

سبکران۔ پہلوی زبان میں تھی۔ مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ اہل عجم اس کتاب کی نہایت عزت کرتے تھے۔[3] عبد اللہ بن المقفع نے اس کا ترجمہ کیا۔

تاریخ دولت ساسانی۔ مترجمہ ہشام بن قاسم الاصفہانی۔ اصلاح[2] دادہ بہرام بن مردان شاہ موبد نیشاپور۔

کارنامۂ نوشیرواں

شہرزاد و پرویز

کارنامۂ اردشیر بن بابک — اردشیر نے اپنے حالات اور واقعات خود لکھے تھے۔[4]

کتاب التاج

بہرام و نرسی نامہ

کارنامہ — نوشیرواں کے حالات

مزدک نامہ

ان کتابوں کے علاوہ سلاطین ایران کے عہد نامے، توقیعات اور فرامین مہیا کیے گئے اور ان کا ترجمہ کیا گیا۔ مثلاً وصیت نامۂ نوشیرواں بنام ہرمز، عہد نامۂ اردشیر بابکاں بنام شاپور، کسریٰ و مرزبان کا مکالمہ، نوشیرواں کا خط سرداران فوج کے نام، نوشیرواں اور جواسپ کے مراسلات۔

جب تاریخ ایران کا اس قدر ذخیرہ فراہم ہو چکا۔ تو مورخین اسلام نے ان کی مدد سے خود مستقل تصنیفیں کیں چنانچہ محدث طبری۔ علامہ مسعودی، ابوحنیفہ دینوری۔ یعقوبی حمزہ اصفہانی وغیرہ نے ایران کی مبسوط اور مفصل تاریخیں لکھیں۔ جو یورپ کی بدولت آج

۱؎ ان چاروں کتابوں کا ذکر تاریخ حمزہ اصفہانی صفحہ ۸ میں ہے ۲؎ ان دونوں کتابوں کا ذکر تاریخ حمزہ اصفہانی صفحہ ۹ میں ہے

۳؎ مروج الذہب مسعودی مطبوعۂ یورپ صفحہ ۱۶۲ جلد اول۔ ۴؎ ان چاروں کتابوں کا ذکر فہرست ابن الندیم صفحہ ۲۱۵ میں ہے۔

چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ یہ تمام کتابیں فردوسی کے زمانہ سے پہلے تصنیف ہو چکی تھیں ان واقعات کے بعد، مالکم صاحب کی رائے کو پڑھو کہ "مسلمان چار سو برس تک ایران کی تاریخ سے ناواقف تھے۔ اور سب سے پہلی کوشش سامانیوں کے دور میں ہوئی۔"

یہ تمام کتابیں عربی زبان میں تھیں، فارسی میں اس وقت تک ترجمہ کے سوا کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی گئی تھی۔ غالباً سب سے پہلی کتاب جو تاریخ ایران پر لکھی گئی وہ ابوعلی محمد ابن احمد البلخی کی تصنیف تھی جس کا نام اس نے شاہنامہ رکھا تھا۔ اسی بنا پر کشف الظنون میں اس کو شاہنامۂ قدیم لکھا ہے۔

ابوریحان بیرونی نے آثار الباقیہ[۱] میں لکھا ہے۔ کہ مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے۔ کہ میں نے اس کتاب کا سرمایہ کتب مندرجۂ ذیل سے فراہم کیا۔ سیر الملوک عبداللہ بن المقفع۔ سیر الملوک محمد بن جہم البرمکی۔ سیر الملوک ہشام بن القاسم۔ سیر الملوک۔ بہرام شاہ بن مردان شاہ۔ سیر الملوک بہرام اصفہانی تصانیف بہرام مجوسی۔

غرض جب دقیقی نے شاہنامہ لکھنے کا ارادہ کیا تو تاریخ عجم کا بہت بڑا ذخیرہ عربی و فارسی میں تیار ہو چکا تھا۔ دقیقی نے سامانیوں کی فرمائش سے یہ کام شروع کیا تھا۔ سامانیوں کا کتب خانہ اُس زمانہ میں تمام عالم میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ شیخ بوعلی سینا جب اوّل اوّل اس کتب خانہ میں داخل ہوا تو اس پر حیرت چھا گئی۔ چنانچہ اس نے اقرار کیا ہے۔ کہ میں نے اتنا نادر اور عظیم الشان کتب خانہ نہ اس سے پہلے کبھی دیکھا تھا نہ اس کے بعد دیکھا" دقیقی کے لئے یہ تمام تاریخی ذخیرہ مہیا کیا گیا ہوگا۔ اور چونکہ سلطان محمود غزنوی، سامانیوں ہی کا دست پرورد اور اُن کو مٹا کر اُن کا جانشین بنا تھا۔ اس لئے ہر طرح قرین قیاس ہے۔ کہ وہ سب سامان محمود کو ہاتھ آیا ہوگا۔ اور فردوسی کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا ہوگا۔ یہ محض قیاس نہیں بلکہ مورخین کی تصریح سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ کشف الظنون میں ہے۔

تاریخ الفرس لبعض قدماء اهل فارس وقد کان معظما عند العجم لانه من اخبار اسلافهم وسیر ملوکهم وهو اصل الشهنامه وغیرها ونقله ابن

تاریخ ایران بعض قدمائے ایران کی تصنیف ہے عجمی اس کتاب کی اس لئے بہت عزت کرتے تھے کہ اس میں اُن کے آبا و اجداد اور سلاطین کے حالات تھے اور یہی کتاب شاہنامہ وغیرہ کا ماخذ ہے۔ ابن المقفع نے اس کو

۱ دیکھو کتاب مذکور مطبوعۂ یورپ صفحہ ۹۹۔

المقفع من الفھلویۃ الی العربیہ پہلوی زبان سے ترجمہ کیا۔
غالباً یہ وہی **خدائی نامہ** ہے۔ جس کا ذکر اوپر ہو چکا۔
صاحب مجمع الفصحاء لکھتے ہیں۔

"از جملہ نامہائے قدیم جاسپ نہاد کتاب است کہ در ذکر خسروان ایران بودہ دیگر آئین بہمن است۔ در احوال بہمن۔ دیگر داراب نامہ است۔ دیگر دانش افزائے نوشیروانی کہ جامع آں بزرگ مہر حکیم بودہ، و باستان نامہ و دانشور نامہ۔ و خرد نامہ و حکیم ابوالقاسم محمد بن منصور **فردوسی** آثار افعال ملوک عجم را ازاں نامہا بدست آوردہ۔"

ان تمام قرائن اور تصریحات سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ فردوسی کا ماخذ زیادہ تر ایران کی وہ تاریخیں ہیں، جو عربی میں ترجمہ ہو گئی تھیں لیکن فردوسی کا قومی غرور اعرب کے احسان کو گوارا نہیں کرتا۔ فردوسی کا دعوے ہے کہ قدیم زمانہ کی ایک نہائت مبسوط تاریخ ایران کی موجود تھی۔ لیکن مرتب اور مدون نہ تھی۔ موبدوں یعنی مذہبی پیشواؤں کے پاس اس کے مختلف اجزا تھے۔ ایک رئیس دہقان نے ہر جگہ سے بڈھے بڈھے پرانے موبد جمع کئے اور اُن پراگندہ اجزا کو زبانی روائتوں کی مدد سے ترتیب دے کر ایک مکمل کتاب تیار کرائی۔

شاہنامہ کے ماخذ کے متعلق خود فردوسی کا بیان

یکے نامہ بد از گہ باستان — فراواں بدو اندراں داستان
پراگندہ در دست ہر موبدے — ازو بہرہ بردہ ہر بخردے
یکے پہلواں بود دہقاں نژاد — دلیر بزرگ و خردمند و راد
زہر کشورے موبدے سال خورد — بیاورد وایں نامہ را گرد کرد
بپرسیدشاں از نژاد کیال — وزاں نامداراں فرخ گواں
بگفتند پیشش یکایک مہاں — سخنہائے شاہان و گشت جہاں
چو بشنید ازیں شاں سپہبد سخن — یکے نامور نامہ افگند بن

فردوسی کا بیان ہے کہ اسی کتاب کو دقیقی نے نظم کرنا شروع کیا تھا۔ لیکن چونکہ ناتمام چھوڑ گیا۔ میں نے اس کی تکمیل کی۔

فردوسی کے بیان کے مطابق شاہنامہ کی اصلی بنیاد اسی کتاب پر قائم کی گئی۔ لیکن جستہ جستہ داستانیں اور ذریعوں سے بھی فراہم ہوئیں۔ رستم و شغاد کا قصہ جہاں شروع کیا ہے۔ تمہید میں لکھا ہے کہ احمد بن سہل کے دربار میں ایک بڈھا تھا۔ جو سام نریمان

کی اولاد سے تھا۔ اس کے پاس سلاطین ایران کی تاریخ تھی، اور رستم کی اکثر داستانیں اس کو زبانی یاد تھیں۔ شغاد کا قصہ میں نے اس سے لے کر نظم کیا۔

یکے پیر بُد نامش آزاد سرو	کہ با احمد سہل بودے بہ مرو
کجا نامۂ خسرواں داشتے	تن و پیکر پہلواں داشتے
بہ سام نریماں کشیدش نژاد	بسے داشتے رزم رستم بیاد
بگویم سخن آنچہ زو یافتم	سخن را یک اندر دگر بافتم

فردوسی کا دعویٰ ہے، ہم کو انکار کی کوئی وجہ نہیں لیکن یہ امر غور طلب ہے۔ فردوسی نے خود تیسری جلد میں دقیقی کے اشعار کے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔

یکے نامہ دیدم پُر از داستاں	سخنہائے آں پُر منش راستاں
فسانہ کہن بود و منثور بود	طبائع ز پیوند او دور بود
گذشتہ برو سالیاں دو ہزار	گر ایدوں کہ برتر نیاید شمار
گرفتم بگوئیندہ بر آفریں	کہ پیوند را راہ داد اندریں

تیسرے شعر میں صاف تصریح ہے کہ کتاب مذکور دو ہزار برس کی تصنیف تھی یہ ظاہر ہے کہ دو ہزار برس پہلے ایران کی جو زبان تھی وہ فردوسی کے زمانے کی زبان نہ تھی بلکہ ژندی یا اُس کے قریب قریب ہو گی جو سنسکرت سے ملتی جلتی ہے، اور جو پہلوی زبان سے بھی بہت مختلف ہے۔ اس لئے یہ ثابت ہونا ضرور ہے۔ کہ فردوسی اس زبان سے واقف تھا یا کوئی شخص ترجمہ کرتا جاتا تھا لیکن تذکرد ل اور خود فردوسی کے بیان میں اس کی کوئی شہادت موجود نہیں۔

شاہنامہ کے ماخذ کے متعلق، دیباچہ میں اور چند روایتیں مذکور ہیں۔ واقعہ نگاری کے فرض کے لحاظ سے ہم اُن کو بھی نقل کرتے ہیں لیکن جہاں اُن میں بدیہی غلطی ہے ہم اس کی تغلیط کر دیں گے۔

سامانیوں کو، ایران کی تاریخ کے مرتب کرنے کا ہمیشہ خیال رہا۔ اِن میں سے **نوشیرواں** کو سخت شغف تھا چنانچہ تمام اطراف و دیار میں قاصد بھیج کر ہر جگہ سے تاریخی ذخیرے جمع کئے، یزدگرد نے اپنے زمانہ میں ان سب کو **دانشور دہقان** کے حوالہ کیا کہ کیومرث سے لے کر خسرو پرویز کے زمانہ تک مکمل اور مرتب تاریخ تیار کرے

دانشور نامی کو ہر دانش کے روسا میں تھا۔ اور نہایت صاحب حوصلہ اور فاضل شخص تھا۔ اس نے ان تمام ذخیروں کو عمدگی سے ترتیب دے کر ایک مبسوط اور جامع تاریخ تیار کی۔

عربوں کے حملہ میں یہ کتاب حضرت عمر کی خدمت میں پیش کی گئی۔ آپ نے اس کا ترجمہ سنا اور فرمایا کہ یہ صرف خرافات کا مجموعہ ہے دیکھنے کے قابل نہیں۔ غرض یہ کتاب لوٹ میں تقسیم ہو کر حبش تک پہنچی۔ بادشاہ حبش نے اس کا ترجمہ کرایا۔ وہاں سے ہندوستان پہنچی۔ یعقوب لیث نے اپنے زمانہ حکومت میں اس کو ہندوستان سے منگوا کر ابو منصور عبدالرزاق بن عبداللہ فرخ کو حکم دیا کہ اس کا ترجمہ کیا جائے۔ چنانچہ تاج بن خراسانی ہروی، یزداں داد شاپور سیستانی، ماہوی بن خورشید نیشاپوری، سلیمان طوسی ان سب نے مل کر ۳۶۰ھ میں اس کا ترجمہ کیا۔ یہی کتاب سامانیوں کو ہاتھ آئی۔ اور ان کے حکم سے دقیقی نے اس کو نظم کرنا شروع کیا۔

اس روایت کا یہ حصہ کہ کتاب حبش گئی۔ وہاں ترجمہ ہو کر پھر ہندوستان پہنچی ہندوستان سے ایران میں آئی، صریح غلط اور بیہودہ ہے، باقی واقعات صحیح ہوں تو عجب نہیں یعنی ایران کی کوئی قدیم تاریخ جو یزدگرد کے عہد میں تیار ہوئی تھی، یعقوب لیث کے زمانہ میں پہلوی سے فارسی میں ترجمہ کی گئی ہو۔

دیباچہ کی دوسری روایت یہ ہے۔ کہ نوشیرواں کے خاندان کا ایک شخص سلطان محمود کے زمانہ میں تھا۔ اس کا نام خور فیروز تھا۔ اور فارس میں سکونت رکھتا تھا۔ زمانہ کے انقلاب سے آوارہ وطن ہو کر غزنین پہنچا یہاں آ کر چرچا سنا کہ سلطان محمود تاریخ عجم کا شیفتہ و دلدادہ ہے۔ اس کے وطن میں یہ کتاب موجود تھی۔ چنانچہ وہاں سے منگوا کر سلطان کی خدمت میں پیش کی۔ اور مورد انعام ہوا۔

تیسری روایت یہ ہے۔ کہ جب تمام ملک میں سلطان محمود کے شوق کے چرچے پھیلے تو بادشاہ کرمان نے ایک شخص کو جس کا نام آذر برزین تھا۔ اور شاپور ذوالاکتاف کے خاندان سے تھا۔ اور اس وجہ سے تاریخ ایران کا بڑا سرمایہ اس کے پاس تھا اس کو سلطان محمود کی خدمت میں بھیجا۔

شاہنامہ کی وقعت تاریخ کے لحاظ سے اگرچہ اس میں شک نہیں کہ شاعرانہ رنگ آمیزیوں نے شاہنامہ کو عام نظروں میں تاریخی درجہ سے گرا دیا ہے۔ تاہم ایران کی کوئی مفصل

قدیم تاریخ اس سے زیادہ صحیح نہیں مل سکتی۔

ملکم صاحب بھی تاریخ ایران میں اعتراف کرتے ہیں۔

"کتاب فردوسی اگرچہ افسانہ وخیالات شاعری بسیار دارد لیکن تقریباً جمیع اخبارے کہ در تاریخ قدیم ایران و توران در ملک آسیا الشیا، یافت میشود دراں مندرج است"۔

مالکم صاحب نے نہایت تفصیل کے ساتھ شاہنامہ کے واقعات کا یونانی مورخین کے بیان سے مقابلہ کیا ہے۔ اور اکثر جگہ دونوں میں تطبیق دی ہے۔ علامہ ثعلبی نے جو سلطان محمود کا معاصر تھا۔ ایران کی قدیم تاریخ پر ایک بسوط کتاب لکھی ہے اس نے بھی جا بجا شاہنامہ کا حوالہ دیا ہے۔ تاریخی حیثیت سے شاہنامہ کے متعلق مفصل بحث کرنا ہمارا موضوع نہیں، البتہ اس قدر جتانا ضروری ہے کہ شاہنامہ کی بے اعتباری کی بڑی وجہ جو آج کل خیال کی جاتی ہے۔ وہ اس کے دور از کار افسانے ہیں مثلاً دیو سفید مار ضحاک۔ جام کیخسرو وغیرہ وغیرہ لیکن اولاً تو چند واقعات کی بنا پر تمام کتاب کو غلط نہیں کہہ سکتے ہیرو ڈوٹس کو تمام یورپ تاریخ کا آدم مانتا ہے لیکن اسکی تاریخ میں ہزاروں واقعات فرضی اور وہمی ہیں۔ اور خود یورپ کو اس کا اعتراف ہے دوسرے ایرانیوں کی قدیم تاریخ میں واقعات اسی طرح مذکور تھے۔ اس لئے فردوسی کا صرف یہی فرض تھا کہ اُن واقعات کو بعینہٖ نقل کر دے۔ علامہ ثعلبی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے۔ کہ یہ تمام افسانے گو بالکل بے سروپا اور خلاف عقل ہیں لیکن چونکہ ایران کی تاریخ میں بہ تواتر بیان ہوتے چلے آتے ہیں۔ اس لئے ہمارا صرف اس قدر فرض ہے کہ جوں کا توں اُن کو نقل کر دیا جائے۔ علامہ موصوف کے یہ الفاظ ہیں (ذکر قصہ زال وسیمرغ)

وانا اوردمن عصل ہذہ الحکایۃ ولولا شہرتہا بکل مکان وفی زمان وعلی کل لسان وجربہا مجری مایستطاب وبلہی بہ الملک عند الارق لما کتبتہا قد کانت العجائب کثیرۃ فی ذالک الزمان الاول کبلوغ عمر الواحد من اہلہ الف سنۃ وکطاعۃ الجن والشیاطین الملوک ۔۔۔۔ وغیرہا مما یطول ذکرہ (جلد اوّل صفحہ مطبوعہ یورپ)

اسی طرح ہفت خوان رستم کے ذکر میں لکھا ہے کہ یہ سب لغویات ہیں۔

ابوریحان بیرونی آثار الباقیہ میں لکھتا ہے۔

ل۵ صفحہ ۱۰۰ مطبوعہ یورپ ۱۲

ولهم في التواريخ القسم الاول واعمار الملوك وافاعيلهم المشهورة عنهم ما يستنفر عن استماعه القلوب و تمجه الاذان ولا تقبله العقول۔

ایرانیوں نے پہلے زمانے کی جو تاریخ لکھی ہے اُس میں سلاطین کی عمروں اور اُن کے کارناموں کے متعلق ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جن کے سننے سے دل اچٹتا ہے۔ کان اُن کو برداشت نہیں کرسکتے۔ عقل ان کو قبول نہیں کرتی۔

بعض یورپین مؤرخین کے نزدیک شاہنامہ کی بے اعتباری کی وجہ یہ ہے کہ اس کے واقعات یونانیوں کی تاریخ سے اکثر جگہ مخالف ہیں لیکن اس عقدہ کو علامہ ثعلبی نے بہت پہلے حل کردیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ہمارے پاس ایران کی تاریخ کے متعلق دو ماخذ ہیں۔ ایرانی اور یونانی۔ ہم جانتے ہیں کہ دونو میں اختلاف ہے لیکن یہ مسلم مسئلہ ہے۔ کہ گھر کا حال گھر والا خوب جانتا ہے۔ اس لئے ہم نے یونانیوں کے مقابلہ میں ایرانیوں کا زیادہ اعتبار کیا"

محققین یورپ کی رائے یورپ نے نہائت جد وجہد سے اسلام کے قبل کی ایرانی تصنیفات کثرت سے ڈھونڈھ کر نکالیں، اور اُن میں سے اکثر کو چھاپ کر شائع کیا چنانچہ پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب کی پہلی جلد میں ایک خاص عنوان قائم کیا ہے "پہلوی لٹریچر" اس کے ذیل میں ان تمام کتابوں کی فہرست اور ان کے حالات لکھے ہیں۔ ان میں بعض کتابیں اسلام سے پانسو، چھ سو برس پہلے کی تصنیف ہیں۔ ان میں سے جو کتابیں شاہانِ عجم کی تاریخ ہیں۔ اُن کا بیان حرف بہ حرف فردوسی سے مطابق ہے۔ انہیں میں ایک کتاب کارنامک ارتخشتر ہے۔ جو پہلوی زبان میں ہے اور ۶۰۰ئہ یعنی زمانہ اسلام سے کسی قدر پہلے کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب اصل پہلوی زبان میں مع جرمنی ترجمہ کے شائع کی گئی ہے۔ اس کی نسبت **براؤن** صاحب لکھتے ہیں۔ "جب اس کتاب کا شاہنامہ سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ **فردوسی** نے بڑی ایمانداری برتی ہے۔ اور ہماری نظر میں اسکی وقعت یہ دیکھ کر اور بڑھ جاتی ہے کہ جن کتابوں سے اس نے شاہنامہ لکھا ہے۔ اُن سے ترتیب وار مطابقت پائی جاتی ہے" **جرمن** کے مشہور فاضل پروفیسر نولڈکی نے شاہنامہ کے ماخذ اور اس کی تاریخی حیثیت پر ایک مستقل کتاب جرمن زبان میں لکھی ہے۔ اس کے اقتباسات کا ترجمہ مسٹر براون نے انگریزی میں کیا ہے۔ اور اپنی کتاب کی جلد اول میں شامل کیا ہے۔ ہم

اس کے بعض ضروری مقامات کا ترجمہ نقل کرتے ہیں۔

تاریخ و قدامت

اوستا میں شاہنامہ کی فصلوں کا اتنا ذکر آچکا ہے۔ کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب اوستا تصنیف ہوئی تو اس زمانہ میں ان قومی فسانوں کی بڑی بڑی باتیں لوگوں کو معلوم تھیں۔ اُن کی قدامت کا صرف یہی ایک ثبوت نہیں ہے کیونکہ نولدکی نے دکھلا دیا ہے۔ کہ یونانی مصنفوں کی کتابوں میں بھی جو انہوں نے شاہان ایران کے بارے میں لکھی ہیں۔ ان بہادروں کا تذکرہ موجود ہے۔ خاص کر ٹی سی۔ ایس[1] کی کتاب میں جو پانسو برس قبل حضرت مسیح، آرٹا یزرک سیز[2] نی من کا طبیب دربار تھا۔ اور اُس نے اپنی کتاب ایرانی تصانیف کی مدد سے لکھی ہے۔ یہ واقعات بار بار بیان ہوئے ہیں بلکہ کبھی ایک خاندان سے منسوب ہوئے ہیں کبھی دوسرے سے۔ مثلاً سائرس[4] ایکی می ھ[5] مین کے پہلے بادشاہ کو جو واقعات میڈیا[6] والوں سے لڑنے میں پیش آئے وہ اردشیر ساسانی اور اس کی پارتھیوں[7] کی جنگ کے حالات سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ اسی طرح عقاب، سیمرغ اور ہماشاہ پسند پرندوں کا ایکی می نیز[8] زال اور اردشیر کا محافظ ہونا اسی طور پر نوذر کیانی اور پیروز ساسانی کو تورانی دشمنوں سے قارن کے خاندان کے دو شخصوں کا بچانا اور اسی قبیل سے دارا اور پیروز کی ملتی جلتی سرگذشتیں ہیں جو قابل غور ہیں

یات کار زریران

زریاد ریس[9] برادر ہسٹاس پیس[10] اور شاہزادی اوداتس[11] کا قصہ ہم تک اے تھی نیس[12] سے پہنچا ہے۔ یہ قصہ اُس نے سکندر کی اس تاریخ سے لکھا ہے جو اس کے دیوان چاریز[13] نے تصنیف کی تھی۔ یہی داستان سب میں پرانی پہلوی کتاب یات کار زریران[14] میں بیان ہوئی ہے۔ جو پانسو برس قبل حضرت عیسےٰ کے لکھی گئی تھی، یہ چھوٹی مگر ضروری کتاب سب میں قدیم فارسی کتاب ہے جس میں بہادری کے قصے درج ہیں۔ گو اس میں ایک ہی قصہ ہے مگر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے اُن کل کہانیوں پر عبور ہے۔ اسی کتاب کو شاہنامۂ گشتاسپ یا پہلوی شاہنامہ کہتے ہیں۔

[1] Ctesias [2] Artaxerxes [3] Mnemon [4] Cyrus
[5] Achhaemeniane [6] Medes [7] Parthians.
[8] Achaememes [9] Zariatras [10] Hystaspes.
[11] Odates [12] Athenaeus [13] Charas [14] Yat Kar! Zarian

نولدکی کہتا ہے۔ کہ "اگر ہم کو سراسر دھوکا نہ ہوا ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قصے میں وہ رُوح موجود ہے۔ جس کا وجود کئی اور قوموں کے بہادری کے قصوں میں موجود ہے خلاصہ حال سب کو معلوم ہے۔ اس کے خاص خاص حصوں کو کوشش کر کے زینت دی گئی ہے۔ اور اس ڈھانچ میں تھوڑی سی کمی بیشی اور ترتیب سے کم وبیش ایک مسلسل اور پوری داستان تیار ہو سکتی ہے۔ اس قصے کے ضروری اجزا عربی کے اس مختصر ترجمہ میں موجود ہیں جو طبری نے کیا ہے۔ اور جو شاہنامہ کے بیان سے بالکل مطابق ہے۔ بعض جگہ تو لفظ بہ لفظ وہی ہے۔ اور اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ اُسی عام قدیمی روائت سے لیا گیا ہے۔ جو شاہنامہ کا ماخذ ہے"۔

اس نئی ترتیب سے جس کی طرف نولدکی نے اشارہ کیا ہے وہ اضافہ اُور اصلاح مراد ہے۔ جس سے مختلف حصے ایک دوسرے کا پیوند ہو کر ایک دلکش داستان بن جائیں۔ اور کمی سے یہ غرض ہے۔ کہ وہ باتیں اور الفاظ جو مسلمانوں کو ناگوار ہیں نہ آنے پائیں جیسا فردوسی اور اوروں نے کیا ہے۔

شاہنامہ کے ساسانی حصہ کے متعلق ہمارے پاس ایک پہلوی کتاب کارنامک ارتخشتر پاپکان اصلی پہلوی اور جرمن میں موجود ہے جب اس کتاب کا شاہنامہ سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی نے بڑی ایمانداری برتی ہے اور ہماری نظر میں اُس کی وقعت یہ دیکھ کر اور بڑھ جاتی ہے۔ کہ جن کتابوں سے اُس نے شاہنامہ لکھا ہے۔ اُن سے ترتیب وار مطابقت پائی جاتی ہے۔ کارنامک غالباً ۶۰۰ء میں تصنیف ہوئی اور اگاتھی اس کا جو ۵۸۰ء میں تھا۔ شاہان ایران کی تاریخوں کا ساسان پاپک اور اردشیر کے حالات میں حوالہ دینا اس بات کا زائد ثبوت ہے کہ شاہنامہ کے مختلف قصے اس زمانہ کی پہلوی کتابوں میں پائے جاتے تھے۔

فردوسی کے شاہنامہ پر جو دیباچہ تیمور کے پوتے بائسنقر کے حکم سے ۱۴۲۵ء میں لکھ کر لگایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دہقان دانشور کا پورا صحیح نسخہ اس ساری داستان کا کیومرث سے لیکر خسرو پرویز یعنی ۶۲۷ء تک کا یزدجرد ثانی آخری ساسانی فرمانروا کے عہد میں تیار ہو چکا تھا۔ اس پر نولدکی لکھتا ہے۔ کہ یہ کتاب خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو مگر عرب مورخوں کے ترجموں کا، فردوسی سے خسرو پرویز کی وفات تک مطابق ہونا

اور بعد کو مختلف۔ اس بارہ خاص میں اُس کی صداقت کا ثبوت ہے۔ اور اس کی انتہا درجہ کی ہمدردانہ کوشش اور حق پسندی سے پایا جاتا ہے۔ کہ وہ بادشاہ کی سرپرستی اور نگرانی میں تصنیف ہوئی تھی"۔

اس پہلوی **خدائی نامہ** جس کا حمزہ اور مصنف فہرست وغیرہ اور دیگر عرب مؤرخوں نے ذکر کیا ہے۔ ابن المقفع نے آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں عربی میں ترجمہ کیا اور اس ذریعہ سے تمام عربی دانوں کو اس کا حال معلوم ہوگیا۔ مگر نہایت افسوس ہے۔ کہ یہ ترجمہ ضائع ہوگیا۔ اسی طرح وہ فارسی نثر کا ترجمہ جو ۹۵۷ء میں ابو المنصور المعمری کے حکم سے ہوا تھا۔ اور ہرات سیستان شاہ پور اور طوس کے چار پارسیوں نے ابو منصور ابن عبدالرزاق حاکم طوس کے لئے کیا تھا جیسا کہ البیرونی اور نولدکی نے لکھا ہے۔ اسکی بنا پر **دقیقی** نے ایک شاہنامہ نوح ابن منصور سامانی بادشاہ کے لئے جو ۹۹۷-۹۶ء تک رہا۔ فارسی نظم میں لکھنا شروع کیا تھا۔ مگر سلطنت گشتاسپ اور زردشت کی آمد کے متعلق چند ہی ہزار شعر لکھنے پایا تھا کہ اُسے ایک ترکی غلام نے مار ڈالا۔ یہ **فردوسی** ہی کا حصہ تھا کہ چند سال بعد اُس نے اس قومی فسانے کو جو دقیقی نے شروع کیا تھا۔ ساٹھ ہزار اشعار میں جس میں دقیقی کے اشعار بھی شامل ہیں تکمیل کو پہنچایا۔ اتنا کہنا یہاں اور ضروری ہے۔ کہ شاہنامہ قوم کا پورا پورا افسانہ ہے۔

داستانِ اردشیر اس داستان کی جتنی کہانیاں شاہنامہ اور **کارنامک پہلوی** میں پائی جاتی ہیں حسب تفصیل ذیل ہیں:-

(۱) ساسان جو بہمن دراز دست کی پانچویں پشت میں تھا۔ پاپک شاہ فارس کے ہاں مویشی چرانے پر نوکر ہے۔ پاپک خواب دیکھتا ہے کہ ساسان نسل شاہی سے ہے۔ اُس سے بلطف و خوشی پیش آتا ہے۔ اپنی بیٹی کی اُس سے شادی کرتا ہے اور اردشیر اُس کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔

(۲) پاپک اردشیر کو متبنّے کرتا ہے۔ اس کے جوان ہونے پر اُس کی دلاوری عقلمندی اور شاہانہ خوبیوں کا تذکرہ اردوان (آخری بادشاہ اشکانی) تک پہنچتا ہے۔ وہ اردشیر کو طلب کرتا ہے۔ خاطر و مدارات سے پیش آتا ہے۔ ایک روز اردوان کے بیٹے کے ساتھ شکار کو جاتا ہے۔ اور وہ اردشیر کے مارے ہوئے شکار کو اپنا بتلاتا ہے۔ اس پر

بے قدر ہو کر میر آخور اصطبل شاہی مقرر ہوتا ہے۔

(۳) اردوان کی ایک معتمد ہوشیار اور نازنین پرستار اردشیر پر ترس کھاتی ہے اور دو تیز رفتار گھوڑے مہیا کر کے اس کے ساتھ فارس کو بھاگ جاتی ہے۔ اردوان تعاقب کرتا ہے۔ مگر یہ سن کر کہ شوکت خسروی ایک خوب صورت مینڈھے کی شکل میں اردشیر تک پہنچ گئی ہے۔ واپس آتا ہے۔

(۴) اردشیر اشکانیوں وغیرہ سے لڑتا ہے۔ اردوان اور اس کے بیٹے کو شکست دیتا ہے اور خود کردوں سے زک اٹھاتا ہے۔

(۵) داستان ہفتان بوخت (ہفتواد) اور کرم کرمانی مع جنگ مِتھرک (امسرک)

(۶) اردوان اپنی بیٹی (زوجہ اردشیر) کو موت کا حکم سناتا ہے۔ ایک موبد جس کا نام ابرسام ہے۔ اس کی جان بچاتا ہے۔ اس کے پیٹ سے شاہو پیدا ہوتا ہے۔ اور باپ اس بچہ کو لے جاتا ہے۔

(۷) اردشیر ہندوستان کے حاکم کید یا کیت سے یہ سن کر کہ ایران کی بادشاہت اس کے یا اس کے دشمن مِتھرک کے گھرانے میں جائے گی۔ مِتھرک کا استیصال کرتا ہے۔ اسکی ایک لڑکی قتل عام سے بچ کر کسانوں میں پرورش پاتی ہے۔ شاہو اُسے دیکھ کر اس پر عاشق ہوتا ہے۔ اپنی شادی اور اپنے بیٹے ہرمز کی پیدائش کو اپنے باپ اردشیر سے چھپاتا ہے اور ہرمز کو سات برس کی عمر میں چوگان کے میدان کی بہادری دیکھکر اردشیر پہچان لیتا ہے۔

ہر متنفس جس نے **کارنامک** اور **شاہنامہ** کا یہ حصہ ساتھ ساتھ پڑھا ہے۔ اس بات کا اقرار کرے گا کہ شاہنامہ پورا چربہ کارنامک کا ہے۔ اس لئے کہ جزئیات میں بھی اختلاف نہیں ہے۔ ہمارے اس خیال کو کہ فردوسی نے جن قدیم کتابوں سے شاہنامہ لکھا ہے۔ ان سے الگ نہیں گیا۔ پہلوی کے قصہ زریر اور شاہنامہ کے مقابلہ سے اور بھی تقویت ہو جاتی ہے۔ یہ امر اتفاقی ہے۔ کہ ان حصّوں کا ہم اصل کتابوں سے مقابلہ کر سکے مگر ہم وثوق سے کہ سکتے ہیں۔ کہ اور مقامات پر بھی جہاں ہم کو جانچ پڑتال کے ذریعے حاصل نہیں ہیں۔ وہاں بھی فردوسی نے ادنیٰ بات بھی قدیم ماخذوں کے خلاف نہیں لکھی ہوگی یہاں ہم داستان اردشیر کی دونو روائتوں میں سے صرف دو ایک باتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ اوّل ہم اس کی پیدائش کا ذکر کرتے ہیں۔

کارنامک

سکندر رومی کی وفات پر ایران میں ۲۴۰ مختلف گروہوں کے لوگ حکمران تھے۔ اردوان ان سب میں سربرآوردہ تھا۔ اور اصفہان، فارس اور قرب وجوار کے حصہ پر قابض تھا۔ پاپک محافظ سرحد اور اردوان کی طرف سے فارس کا گورنر تھا۔ اور اصطخر میں رہتا تھا۔ اس کے کوئی بیٹا نہ تھا جس سے اس کا نام چلتا، ساسان پاپک کا گوالا تھا۔ اور ہمیشہ اپنے گلوں میں رہتا تھا۔ مگر وہ دارا ابن دارا کی اولاد میں تھا۔ اور سکندر کے برے زمانہ میں وہ بھاگ کر گڈریوں میں جا ملا تھا۔ پاپک کو یہ بات معلوم نہ تھی، ایک رات اُس نے خواب میں دیکھا کہ ساسان کے سر سے سورج نکلا ہے اور اس نے تمام عالم کو منور کر دیا۔ دوسری رات دیکھا کہ ساسان ایک سپید ہاتھی پر جس پر قیمتی جھول پڑی ہوئی ہے سوار جا رہا ہے۔ اور تمام کشور کے لوگ اس کے ارد گرد ہیں۔ اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور دعائیں دیتے ہیں تیسری رات اُس نے دیکھا کہ آتش فروبہ گشنسپ اور مہتر، ساسان کے گھر میں روشن ہے، اور ساری دنیا میں اُجالا پھیلا ہوا ہے۔ ان خوابوں سے گھبرا کر اُس نے تعبیر دینے والوں اور دانشمندوں کو بلایا اور اُن سے تینوں خواب بیان کئے معبروں نے کہا کہ یا تو وہ شخص جسکو آپ نے خواب میں دیکھا ہے یا اس کی اولاد میں سے کوئی شخص تمام دنیا کا بادشاہ ہوگا۔ کیونکہ سورج اور قیمتی جھول والا ہاتھی، زور، طاقت اور فتح کی علامت ہیں۔ آتش فروبہ سے مراد وہ لوگ ہیں۔ جو مذہب سے خوب واقف ہیں۔ اور اپنے ہمسروں میں ممتاز ہیں آتش گشنسپ سے جنگجو اور جرگوں کے سردار اور آتش برجین مہر سے دنیا کے کاشتکار مراد ہیں پس بادشاہت اُسے یا اُس کی اولاد کو ملے گی" پاپک نے یہ تقریر سُن کر سب کو رخصت کیا اور ساسان کو بلا کر اُس سے پوچھا۔ "تم کس خاندان اور نسل سے ہو۔ تمہارے بزرگوں اور بڑھوں میں سے کوئی بادشاہ ہوا ہے"، ساسان نے کہا کہ اگر جان بخشی ہو تو عرض کروں پاپک نے اجازت دی۔ ساسان نے اپنا راز افشا کر دیا۔ اور سارا حال بتلا دیا۔ پاپک یہ سُن کر خوش ہوا اور کہا کہ میں تمہاری حالت بہتر کر دوں گا۔ اور اس کے حکم دیتے ہی پورا لباس شاہی آیا اور ساسان کو عطا ہوا جب ساسان نے کہا کہ پہنو، اُس نے پہن لیا۔ وہ پاپک کے حکم سے چند روز

لہ شاہنامہ میں اسطرح لکھا ہوا ہے ۱۲

عمدہ غذائیں کھاتا رہا جس سے اُس کے جسم میں طاقت آگئی۔ پاپک نے پھر اپنی لڑکی سے اُس کی شادی کردی۔ اور قسمت کی یاوری سے وہ حاملہ ہوگئی۔ اور اُس سے بخت نشتر پیدا ہوا۔
فروبہ۔ فرہ باگ یا فرن باگ کی جگہ فردوسی نے خرہ یہ لکھا ہے۔ کارنامک کی عبارت جہاں ساسان کی آمد کا ذکر ہے۔ بڑی روکھی پھیکی ہے۔ فردوسی نے اپنے زور قلم سے اُس میں جان ڈال دی ہے۔ اور یہ منجملہ اُن مقامات کے ہے جو فردوسی نے نہائت دلکش پیرایہ میں لکھی ہیں۔
اشعار فردوسی متعلق قصہ بابک و ساسان۔

چو دارا بہ رزم اندروں کشتہ شد
همہ دودہ را روز برگشتہ شد

پسر بد مر اورا یکے شاد کام
خردمند و جنگی و ساساں بہ نام

ازاں لشکر روم بگریخت اوی
بدام بلا در نیا ویخت اوی

بہ ہندوستاں در بزاری بمرد
ز ساساں یکے کودکے ماند خرد

بریں هم نشاں تا چهارم پسر
همے نام ساسانش کردے پدر

چو کہتر پسر سوئے بابک رسید
بد شت آمد و سر شباں را بدید

بدو گفت مزدور ت آید بکار
کہ ایدر گزارد بہ بد روزگار

بہ پذرفت بدبخت را سر شباں
همے داشت بارنج روز و شباں

شبے خفتہ بد بابک روزیاب
چناں دید روشن روانش بخواب

کہ ساساں بہ پیل ژیاں بر نشست
گرفتہ یکے تیغ ہندی بدست

بہ دیگر شب اندر چو بابک بخفت
همے بود با نغزش اندیشہ جفت

چناں دید در خواب کاتش پرست
سہ آتش فروزاں ببردے بدست

چو آذر گشسپ و چو خراد و مہر
فروزاں چو بہرام و ناہید و مہر

همہ پیش ساساں فروزاں بدے
بہر آتشے عود سوزاں بدے

سر بابک از خواب بیدار شد
روان و دلش پر ز تیمار شد

کسانیکہ در خواب دانا بدند
بداں دانش اندر توانا بدند

بہ ایوان بابک شدند انجمن
بزرگان فرزانہ و رائے زن

چو بابک سخن بر کشاد از نہفت
همہ خواب یکسر بدیشاں بگفت

پر اندیشہ شد زاں سخن رہنمائے
نہادہ بدو گوش پاسخ سرائے

سرانجام گفت اے سرافراز شاہ — بہ تاویل ایں کرد باید نگاہ
کسے را کہ دیدی تو زینساں بخواب — بہ شاہی برآرد سر از آفتاب
گرایدوں کہ ایں خواب ازو بگذرد — پسر باشدش کز جہاں برخورد
چو بابک شنید ایں سخن گشت شاد — بر اندازہ شاں یک بیک ہدیہ داد
بفرمود تا سر شباں از رمہ — بر بابک آمد بروز دمہ
بیامد دماں پیش او با گلیم — پر از برف پشمیں و دل پر ز بیم
بپرداخت بابک ز بیگانہ جائے — پدر شد پرستندہ و رہنمائے
ز ساساں بپرسید و بنواختش — بر خویش، نزدیک بنشاختش
بپرسیدش از گوہر و از نژاد — شباں زو بترسید، و پاسخ نداد
ازاں پس بدو گفت کائے شہریار — شباں را بجاں گر دہی زینہار
بگویم ز گوہر ہمہ ہرچہ ہست — چو دستم بہ پیماں بگیری بہ دست
چو بشنید بابک زباں برکشاد — ز یزداں نیکی دہش کرد یاد
بہ بابک چنیں گفت ازاں پس جواں — کہ من پور ساسانم اے پہلواں
چو بشنید بابک فرو ریخت آب — ازاں چشم روشن کہ او دید خواب
بیاورد پس جامۂ پہلوی — یکے اسپ با آلت خسروی
یکے کاخ پرمایہ او را بساخت — ازاں سر شبانی سرش بر نواخت
بدو داد پس دختر خویش را — پسندیدہ و افسر خویش را

کارنامک پہلوی اور شاہنامہ کے بیان میں بہت خفیف فرق ہے جو عموماً تاریخی واقعات میں ہوتا ہے۔

مسٹر براؤن نے اور بھی چند داستانیں کارنامک اور شاہنامہ کی مطابقت دکھانے کے لیئے درج کی ہیں لیکن ہم نے طول کے لحاظ سے قلم انداز کیا۔

فردوسی کی وقعت شاعری کی حیثیت سے

عام اتفاق ہے کہ ایران میں اس درجہ کا کوئی شاعر آج تک نہیں پیدا ہوا۔ انوری اُن شعرا میں ہے جن کو لوگوں نے فردوسی کا ہمسر قرار دیا ہے۔ چنانچہ مشہور ہے۔

در شعر سہ تن پیمبرانند — ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را — فردوسی و انوری و سعدی

لیکن خود انوری کہتا ہے کہ فردوسی ہمارا خداوند ہے۔ اور ہم اُس کے بندے ہیں۔

آفریں بر روان فردوسی — آں ہمایوں نژاد و فرخندہ
آں نہ اُستاد بود و ما شاگرد — آں خداوند بود و ما بندہ

نظامی کہتے ہیں

سخن گوئے پیشینہ دانائے طوس — کہ آراست زلف سخن چوں عروس

علامہ ابن الاثیر نے مثل السائر کے خاتمہ میں لکھا ہے۔ کہ "عربی زبان باوجود اس وسعت و کثرت الفاظ کے شاہنامہ کا جواب پیش نہیں کر سکتی، اور درحقیقت یہ کتاب عجم کا قرآن ہے"

یورپ کے فضلا بھی جو زبان فارسی سے واقف ہیں عموماً فردوسی کی کمال شاعری کے معترف ہیں۔ مسٹر گور اوسلی نے تذکرۃ الشعراء میں فردوسی کو ہومر سے تشبیہ دی ہے۔ اگرچہ ساتھ ہی یہ ناتواں بینی بھی ظاہر کی ہے کہ "وہ اگرچہ دراصل ہومر کا ہمسر نہیں ہو سکتا، لیکن ایشیاء میں اگر کوئی ہومر ہو سکتا ہے۔ تو وہی ہے"

لیکن تعجب اور سخت تعجب ہے کہ مسٹر براؤن جو آج کل فارسی دانان یورپ میں سب سے ممتاز ہیں۔ فردوسی کے کمال شاعری کے منکر ہیں۔ وہ اپنی کتاب لٹریری ہسٹری آف پرشیا میں لکھتے ہیں۔ کہ "فردوسی کے بعد جو شعراء پیدا ہوئے وہ شاعرانہ خیالات اور شوکت الفاظ دونو حیثیت سے فردوسی سے بالاتر ہیں۔ شاہنامہ سبعہ معلقہ کی بھی برابری نہیں کر سکتا" صاحب موصوف کو اس پر حیرت ہے کہ شاہنامہ تمام اسلامی دنیا میں اس قدر کیوں مشہور عام ہو گیا۔ پھر خود اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ "شاہنامہ میں مسلمانوں کے اسلاف کی فخریہ داستانیں ہیں۔ اس لئے جب قوم نے اس کا سکہ جما دیا"

ہم ان سب باتوں کے جواب میں صرف یہ کہتے ہیں۔

حریف کاوش مژگان خوں ریزش نہ زاہد — بدست آور رگ جانی و نشتر را تماشا کن

اب ہم شاہنامہ کے اوصاف کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ شاہنامہ کی خصوصیات

(۱) اسلام کا خاصہ ہے کہ جہاں جہاں گیا ملک کی زبان سرے سے بدل دی یا اس

قدر اس کو مغلوب کر لیا کہ وہ مستقل اور آزاد زبان نہیں رہی۔ اسلام سے پہلے مصر و شام میں قبطی اور سریانی بولی جاتی تھی، اسلام کے ساتھ تمام ملک کی زبان عربی ہوگئی یہاں تک کہ آج عیسائی یہودی وغیرہ بھی عربی زبان کے سوا اور کوئی زبان نہیں بول سکتے۔ ایشیائے کوچک اور قسطنطنیہ میں ترک گئے تو ملکی زبان ترکی ہوگئی، کابل اور قندھار کی اصلی زبان پشتو ہے لیکن خواص فارسی بولتے ہیں۔ جو اسلامی حکمرانوں کی زبان تھی، ایران اور ہندوستان سخت جان تھے۔ جہاں ملک کی اصلی زبان قائم رہی لیکن عربی الفاظ اس کثرت سے داخل ہو گئے۔ کہ ان کی آمیزش کے بغیر فارسی یا اردو لکھنا چاہیں تو لزوم مالا یلزم کی محنت اٹھانی پڑتی ہے۔ پہلی خصوصیت

ایران میں ابتدا ہی سے عربی نہایت شدت سے مخلوط ہو گئی تھی، عباس مروزی نے مامون الرشید کی مدح میں جو قصیدہ لکھا، اس کے چار شعر آج موجود ہیں جن میں نصف سے زیادہ عربی الفاظ ہیں۔ رودکی اور ابوشکور بلخی وغیرہ کا کلام عربی الفاظ سے بھرا پڑا ہے سلطان محمود کے زمانہ میں ایک فاضل نے شاہنامہ کے جواب میں عمر نامہ ایک کتاب نثر میں لکھی تھی، وہ ہماری نظر سے گذری ہے۔ اس کا بھی یہی حال ہے اسی زمانے میں شیخ بوعلی سینا نے حکمت علائیہ فارسی زبان میں لکھی اور قصد کیا کہ خالص فارسی میں لکھی جائے لیکن عہدہ برآنہ ہو سکا۔ فردوسی کی قدرت زبان دیکھو۔ کہ ساٹھ ہزار شعر لکھ کر ڈال دیئے اور عربی الفاظ اس قدر کم ہیں کہ گویا نہیں ہیں، اگرچہ اس خصوصیت کا موجد دقیقی ہے۔ لیکن کل ہزار شعر اور صرف چند معمولی واقعات ہیں۔ بخلاف اس کے فردوسی نے ہر قسم اور ہر طرح کے سینکڑوں گوناگوں مطالب ادا کئے۔ اور زبان کے خالص ہونے میں فرق نہ آنے پایا۔ عربی کے جو الفاظ خال خال آئے ہیں۔ اکثر وہ ہیں۔ جو خاص مصطلح الفاظ ہیں۔ مثلاً دین میمنہ میسرہ قلب سلاح عنان وغیرہ وغیرہ، یہ الفاظ اس طرح اس زبان میں شائع تھے جس طرح آجکل اردو میں جج، کلکٹر، ٹکٹ۔ اسٹیشن وغیرہ ہیں کہ ان کے بجائے اگر کوئی شخص اور الفاظ استعمال کرے تو ناموزوں معلوم ہوں گے۔

حیرت وہاں ہوتی ہے۔ جہاں فلسفیانہ اصطلاحیں آتی ہیں۔ اور وہ اس بے تکلفی سے سادی فارسی میں اُن کو ادا کرتا جاتا ہے۔ کہ گویا روزمرہ کی باتیں ہیں۔ بوعلی سینا نے بھی حکمت علائیہ میں یہ کوشش کی لیکن اس کا نمونہ دیکھو، ابطال غیر متناہی کے استدلال میں لکھتا ہے۔

پُسی و پسی بالطبع است چنانکہ اندر شمار است یا بعرض چنانکہ اندر اندازہ است کہ از ہر کدام سو کہ خواہی آغاز کنی و ہرچہ اندر روئے پیشی و پسی است بالطبع باوے مقدار است کہ اور ابہرہ ہا بہرجا کہ بودند ہمہ بیک جائے حاصل و موجود بود وے متناہی است۔"

غور کرو اس کوشش کے ساتھ کس قدر عربی الفاظ اب بھی باقی رہ گئے اور جن عربی الفاظ کا فارسی میں ترجمہ کیا وہ اس قدر نامانوس اور بیگانہ ہیں کہ عبارت معمّا ہو کر رہ گئی۔

عبارت کا مطلب یہ ہے کہ دو چیزوں میں جب تقدم و تاخر ہوتا ہے۔ تو دو طریقے سے ہوتا ہے۔ بلاواسطہ جس طرح ایک عدد، دو پر مقدم ہے۔ یا بواسطہ جس طرح مسافت میں آگا پیچھا ہوتا ہے۔ کہ گو ایک حصہ کو مقدم اور دوسرے حصہ کو مؤخر کہتے ہیں لیکن جہاں سے چاہیں مسافت کو شروع کر سکتے ہیں۔ اب قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی چیز میں بالطبع تقدم و تاخر ہوگا ضرور ہے کہ اس میں مقدار ہو اور مقدار کے تمام اجزا مرتب ہوں۔ یہ بھی ضرور ہے۔ کہ ایسی چیز متناہی ہو۔

غور کرو بو علی سینا کی عبارت سے کیا کوئی شخص یہ مطلب سمجھ سکتا ہے!

فردوسی نے آغاز کتاب میں مخلوقات کی پیدائش کی ابتداء، عناصر کا وجود، اُن کی ترتیب اور انقلابات لکھے ہیں۔

از آغاز باید کہ دانی درست	سرِ مایۂ گوہراں از نخست
کہ یزداں زناچیز چیز آفرید	بداں تا توانائی آمد پدید
وزو مایۂ گوہر آمد چہار	برآوردہ بے رنج و بے روزگار
نخستیں کہ آتش ز جنبش دمید	زگرمیش پس خشکی آمد پدید
وزاں پس ز آرام سردی نمود	ز سردی ہماں باز ترسی فزود
چو ایں چار گوہر بجائے آمدند	زبہر سپنجی سرائے آمدند
گیا رُست با چند گونہ درخت	بزیر اندر آمد سراں شاں زبخت
ببالد ندارد جز ایں نیروئے	نپوید چو پویندگاں ہر سوئے
نگہ کن بریں گنبد تیز گرد	کہ درماں ازوی ست و زوی ست درد
نہ گشت زمانہ بفرسایدش	نہ ایں رنج و تیمار بگزایدش
نہ از گردش آرام گیرد ہمے	نہ چوں ما تباہی پذیرد ہمے

یونانیوں کے نزدیک آفرینش کی ابتدا اور اس کی تاریخ یہ ہے۔ کہ خدا نے مادہ پیدا کیا۔ مادہ سے عناصر پیدا ہوئے۔ حرکت سے آگ پیدا ہوئی۔ آگ کی گرمی نے یبوست پیدا کی جس سے خاک کا وجود ہوا، پھر سکون کی وجہ سے رطوبت پیدا ہوئی۔ رطوبت نے پانی پیدا کیا۔ اس طرح چار عنصر پیدا ہوئے۔ پھر نباتات کا وجود ہوا جن میں صرف نمو کی قوت ہے۔ متحرک بالارادہ نہیں۔

آسمان کی نسبت یونانیوں کا خیال تھا کہ وہ ابدی ہیں، اور امتداد زمانہ سے ان میں تغیر اور زوال نہیں ہو سکتا، فردوسی نے ان مسائل کو ایسے سادہ اور صاف الفاظ میں ادا کیا ہے۔ کہ معمولی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اور یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ ان میں فلسفیانہ اصطلاحیں ہیں لیکن درحقیقت سب فلسفہ کے خاص الفاظ ہیں۔ ان کے مقابل کے عربی الفاظ دیکھو۔

سرمایہ	مادّہ	توانائی	وجود
گوہر	عنصر	جنبش	حرکت
آرام	سکون	پوینده	متحرک بالارادہ
گشت	دوران	فرسودن	تغیر
تباہی	فنا		

اس طرح اور بہت سے الفاظ ہیں۔ ہم نے صرف نمونہ دکھایا ہے۔

(۲) ایشیائی تاریخوں کے متعلق عام شکائت ہے کہ ان میں بجز جنگ و خونریزی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ یعنی وہ حالات بالکل نہیں ہوتے جن سے اس زمانہ کے ملکی معاملات اور قوم کی تہذیب و معاشرت کا حال کھل سکے۔ یہ شکائت بہت کچھ صحیح ہے لیکن شاہنامہ اس سے مستثنےٰ ہے۔ شاہنامہ اگرچہ بظاہر صرف رزمیہ نظم معلوم ہوتی ہے۔ لیکن عام واقعات کے بیان میں اس تفصیل سے ہر قسم کے حالات آتے جاتے ہیں۔ کہ اگر کوئی شخص چاہے تو صرف شاہنامہ کی مدد سے اُس زمانہ کی تہذیب و تمدن کا پورا پتہ لگا سکتا ہے۔ بادشاہ کیونکر دربار کرتا تھا۔ امرا کس ترتیب سے کھڑے ہوتے تھے۔ عرض معروض کرنے کے کیا آداب تھے۔ انعام و اکرام کا طریقہ کیا تھا۔ بادشاہ اور امراء کا درباری لباس کیا ہوتا تھا؛ فرامین اور توقیعات کیونکر اور کس چیز پر لکھے جاتے تھے۔ نامہ و پیام کا کیا انداز تھا

دوسری خصوصیت

مجرموں کو کیوں کر سزائیں دی جاتی تھیں۔ بادشاہی احکام پر کیونکر نکتہ چینی کی جاتی تھی وغیرہ وغیرہ۔
شادیوں کے کیا مراسم تھے۔ جہیز میں کیا دیا جاتا تھا۔ عروسی کی کیا کیا رسمیں تھیں۔
دُولھا اور دُلہن کا کیا لباس ہوتا تھا۔ پیش خدمت، غلام، اور لونڈیوں کی وضع اور انداز کیا تھا
خط وکتابت کا کیا طریقہ تھا۔ کس چیز سے ابتداء کرتے تھے۔ خاتمہ کی کیا عبارت ہوتی
تھی۔ خطوط کس چیز پر لکھے جاتے تھے۔ اُن کو کیونکر بند کرتے تھے۔ کس چیز کی مہر لگاتے تھے۔
مالگزاری کے ادا کرنے کا کیا دستور تھا۔ زمینوں کی کیا تقسیم تھی، مالگزاری کی مختلف
شرحیں کیا تھیں، ٹیکس کیا کیا تھے۔ کون کون سے لوگ ٹیکس سے معاف ہوتے تھے۔
یہ تمام باتیں شاہنامہ سے بہ تفصیل معلوم ہوتی ہیں۔ نمونہ کے طور پر ہم چند مثالیں
نقل کرتے ہیں۔

(۱) بیژن کی مہم میں کیخسرو نے رستم کو زابل سے بلایا ہے۔ اور اُس کے لئے باغ میں
دربار کیا ہے۔ دربار میں تختِ زریں بچھایا گیا ہے۔ اس پر ایک مصنوعی درخت نصب
ہے۔ جس کا سایہ بادشاہ پر پڑتا ہے۔ درخت چاندی کا ہے۔ یاقوت کی شاخیں ہیں، موتیوں
کے خوشے دانے ہیں۔ زرین ترنج اور سیب پھلے ہوئے ہیں۔ جو مجوّف ہیں۔ اور اُن کے
اندر مُشک کا بُرادہ ہے۔ ہوا جب چلتی ہے۔ تو مُشک جھڑتی ہے۔ اسی کے قریب قریب
وہ فرش تھا۔ جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایران کی فتح میں آیا تھا۔ ان تمام باتوں کو فردوسی
نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

در باغ بگشادہ سالار بار	نشستنگہے ساخت بس شاہوار
بفرمود تا تاج زرین و تخت	نہادند زیر گل افشاں درخت
درختے زدند از بر گاہ شاہ	کجا سایہ گستر و بر تاج و گاہ
تنش سیم و شاخش ز یاقوت زر	برو گونہ گوں خوشہ ہائے گہر
عقیق و زبرجد ہمہ برگ و بار	فرہشتہ از شاخ چوں گوشوار
ہمہ بار زرین ترنج و بہی	میان ترنج و بہی بُد تہی
بدو اندروں مشک سودہ بمے	ہمہ پیکرش سفتہ بر سان نے
کرا شاہ برگاہ بنشاندے	بر او باد ازاں مشک بفشاندے
بیاید نشست او بہ زرینہ تخت	بسر برش ریزندہ مشک از درخت

ہمہ مے گساراں بہ پیش اندرا   ہمہ بر سراں افسر از گوہرا
ہمہ طوق بر سینہ و گوشوار   بہ بر بر ہمہ جامۂ زرنگار

(۲) افراسیاب نے جب اپنی بیٹی فرنگیس کی شادی سیاوش سے کی ہے۔ اور فرنگیس سیاوش کے گھر آئی ہے۔ تو اُس کی مہمانی اور عروسی کے ساز و سامان کو اسطرح بیان کیا ہے۔

بہ گنج آنچہ بُد اندروں نامدار   گزیدند زربفت چینی ہزار
زبرجد طبقہا و فیروزہ جام   پُر از نافۂ مشک و پُر عود خام
دو افسر پُر از گوہر گوشوار   دو یارہ، یکے طوق و دو گوشوار
ز گستردنیہا شتروار شصت   ز زربفت پوشیدنیہا سہ دست
یکے تخت زریں و کرسی چہار   سہ نعلیں زریں زبرجد نگار
پرستندہ سی صد بہ زریں کلاہ   زخویشاں نزدیک صد نیک خواہ
پرستار با جام زریں دو بیست   تو گفتی بہ ایواں دروں جائے نیست
ہمے صد طبق مشک و صد زعفران   ہمے رفت گلشہر با خواہران

اسفندیار کا تابوت رستم نے روانہ کیا تھا۔ تابوت کے مراسم دیکھو۔

یکے نغز تابوت کرد آہنیں   بگسترد فرشے ز دیبائے چیں
در اندود یک روئے آہن بہ قیر   پراگند بر قیر مشک و عبیر
وزاں پس کہ پوشید روشن برش   ز پیروزہ بر سر نہاد افسرش
چہل اشتر آورد رستم گزیں   ز بالا فرو ہشتہ دیبائے چیں
یکے اشترے زیر تابوت شاہ   چپ و راست اشتر پس اندر سپاہ
پشوتن ہمے رفت پیش سپاہ   بریدہ فش و دُم اسپ سیاہ
بر و بر نہادہ نگونسار زیں   ز زیں اندر آویختہ گرز کیں
ہماں نامور خود و خفتان اوے   ہماں ترکش و مغفر جنگجوئے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں کسی امیر کا جنازہ نکلتا تھا۔ تو لوہے کے تابوت میں رکھ کرسے جاتے تھے۔ تابوت کے ایک رُخ کو سیاہ رنگ سے رنگ دیتے تھے پھر اُس پر مشک و عنبر چھڑکتے تھے۔ میت کو کپڑے پہناتے تھے۔ اور سر پر تاج رکھتے تھے۔ تابوت کو اونٹ پر محمل میں رکھتے تھے۔ اور اُس کے دائیں بائیں اور بہت سے اونٹ ساتھ ساتھ

چلتے تھے، پیچھے فوج ہوتی تھی میت کی سواری کا گھوڑا ساتھ ہوتا تھا۔ اُسکی ایالی اور دم کاٹ دیتے تھے۔ زین الٹ کر رکھتے تھے، میت کے اسلحہ جنگ زین پر لٹکتے چلتے تھے۔

تیسری خصوصیت

(۳) ایشیائی شعراء کا عام قاعدہ ہے کہ کسی داستان کے بیان کرنے میں حسن وعشق کا کہیں اتفاقی موقع آجاتا ہے۔ تو اس قدر پھیلتے ہیں کہ تہذیب ومتانت کی حد سے کوسوں آگے نکل جاتے ہیں **نظامی** اور جامی جیسے مقدس لوگ اس حمام میں آکر ننگے ہوجاتے ہیں۔ لیکن فردوسی باوجود اس کے کہ اس کو تقدس کا دعویٰ نہیں ایسے موقعوں پر آنکھ نیچی کئے ہوئے آتا ہے۔ اور صرف واقعہ نگاری کے فرض کے لحاظ سے ایک سرسری غلط انداز نگاہ ڈالتا ہوا گزر جاتا ہے۔ بیژن اور منیژہ کی صحبت عیش کو جہاں لکھا ہے، لکھتا ہے۔

نشستندگہ رہ دو مے ساختند	زبیگانہ خرگہ بپرداختند
پرستندگان ایستادہ بپائے	ابا بربط وچنگ ورامش سرائے
بہ دیبا زمیں کردہ طاؤس رنگ	زدینار و دیبا چو پشت پلنگ
چہ از مشک وعنبر چہ یاقوت وزر	سراپردہ آراستہ سربسر
مے سالخوردہ بجام بلور	برآوردہ با بیژن گیو زور
سہ روز سہ شب شاد بودہ بہم	گرفتہ بر او خواب مستی ستم

زال اور رودابہ کے عاشقانہ اختلاط میں زیادہ پھیلا ہے۔ پھر بھی یہ رنگ ہے۔

گرفت آں زماں دست دستاں بدست	برفتند ہر دو بکردار مست
سوئے خانۂ زرنگار آمدند	بداں مجلس شاہوار آمدند
شگفت اندراں ماہ بد زال زر	بداں روئے وبالا وآں موئے وفر
دو رخسارہ چوں لالہ اندر چمن	سر جعد زلفش شکن در شکن
ز دیدنش رودابہ مے نارمید	بہ دزدیدہ در وے ہمے بنگرید
ہمے بود بوس وکنار ونبید	نگر شیر[۱] کو گور را نشکرید

چوتھی خصوصیت

(۴) عام خیال ہے کہ فردوسی بزم اچھی نہیں لکھتا۔ بے شبہ یوسف زلیخا میں اس کی شاعری کا رتبہ بہت گھٹ گیا ہے لیکن یہ اس کے رنج وغم اور دل شکستگی کا زمانہ تھا۔ جب اس کے تمام جذبات افسردہ ہو چکے تھے۔ یوسف زلیخا لکھنے سے اس کا مقصد

[۱] یعنی دیکھو شیر نے گورخر کو پاکر شکار نہیں کیا۔

صرف مذہبی جماعت کو خوش کرنا تھا۔ جو اتنی بات پر فردوسی سے ناراض تھے۔ کہ اس نے مجوسیوں کی مدح و ثنا میں کیوں اس قدر اوقات صرف کی لیکن شاہنامہ میں جہاں جہاں بزم کا موقع آیا ہے۔ شاعری کا چمن زار نظر آتا ہے۔

زال رودابہ پر عاشق ہوا ہے۔ اس کے شوق میں گھر سے نکلا ہے۔ اسکو خبر ہوتی ہے۔ وہ لب بام آکر کھڑی ہوتی ہے۔ زال کوٹھے کے برابر آکر اوپر جانے کی تدبیریں سوچتا ہے۔ رودابہ اپنی چوٹی کھول کر لٹکا دیتی ہے۔ کہ اس کے سہارے چڑھ آؤ، زال زلف کو بوسہ دیتا ہے۔ اور کمند ڈال کر کوٹھے پر اُترتا ہے۔ دونوں مل جل کر بیٹھتے ہیں لطف و محبت کی باتیں ہوتی ہیں۔ شراب کا دور چلتا ہے۔ یہ سماں دیکھو (کس) کس طرح دکھایا ہے۔

سپہبد سوئے کاخ بنہاد روئے	چناں چوں بود مردم جفت جوئے
بر آمد سیہ چشم (زال ۱۲) گل رخ بہ بام	چو سرو سہی بر سرش ماہِ تام
چو از دور دستان (زال ۱۲) سام سوار	پدید آمد آں دختر نامدار
دو بیجادہ (یاقوت یعنی لب ۱۲) بکشاد و آواز داد	کہ شاد آمدی اے جواں مرد شاد
پریروی گفت سپہبد شنود	ز سر شعر گلنار بکشاد زود
کمندی (زال ۱۲) کشاد او ز سرو بلند	کس از مشک زاں ساں نپیچد کمند
خم اندر خم و مار بر مار بود	براں عنبریں تار بر تار بود
فرو ہشت گیسو ازاں کنگرہ	کہ بازید و شد تا بہ بن یکسرہ
پس از بارہ رودابہ آواز داد	کہ اے پہلواں (لنگ آیا ۱۲) بچہ گرد زاد
بگیر ایں سر گیسو از یک سویم (قلعہ ۱۲)	ز بہر تو باید ہمے گیسویم
بداں پروراندم ایں تار را	کہ تا دستگیری کند یار را
نگہ کرد زال اندراں ماہروئے	شگفتی (متعجب ۱۲) بماند اندراں روئ موئے
بسائید مشکیں کمندش بہ بوس	کہ بشنید آواز بوسش عروس
چنیں داد پاسخ کہ ایں نیست داد	چنیں روز خورشید روشن مباد
کمند از رہی بستد و داد خم	بیفگند بالا، نزد، ہیچ دم
بہ حلقہ در آمد سرِ کنگرہ	برآمد ز بن تا بسر یکسرہ
چو بر بام آں بارہ بنشست باز	بیامد پریروے و بردش نماز

(آگے کے اشعار اوپر گذر چکے)

تم کہوگے کہ رودابہ نے زال کو کہیں جوان مرد، کہیں پہلوان بچہ کہ کے خطاب کیا ہے اور خود فردوسی رودابہ کی تعریف میں بالا اور فر وغیرہ الفاظ استعمال کرتا ہے۔ حالانکہ بزم کی لطافت اور نزاکت ان الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ فردوسی کی نکتہ سنجی اور بلاغت شعاری کی دلیل ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ وہ کابل و زابلستان کے محبوب کا ذکر کر رہا ہے۔ لکھنؤ کا نہیں، وہاں کے لوگ آج بھی اپنے پیارے اور چہیتے کی نسبت یہی الفاظ بولتے ہیں، کابل کا معشوق لکھنؤ کی طرح دھان پان نہیں ہوتا بلکہ بالیدہ قامت، پراندام، اور تنومند ہوتا ہے۔ اس لئے بالا اور فر کا لفظ وہاں کے معشوق کی اصلی تصویر ہے۔

بیژن جب افراسیاب کی سرحد میں پہنچا ہے۔ تو گرگین نے اس سے بیان کیا کہ یہاں سے پاس ایک مرغزار ہے۔ جہاں سال میں ایک دفعہ افراسیاب کی بیٹی منیژہ سہیلیوں کے ساتھ سیر کو آتی ہے۔ اور ہفتوں رہتی ہے۔ دیکھو **فردوسی** نے اس موقع پر مرغزار کی بہار اور پریوں کے جھرمٹ کی تصویر کس طرح کھینچی ہے۔

همه بیشه، و باغ و آب روان	یکے جایگاه از در پهلوان
زمین پرنیان و هوا مشک بوئے	گلاب است گوئی مگر آب جوئے
خم آورده از بار شاخ سمن	صنم شد گل و گشت بلبل شمن
خرامان به گرد گلان بر، تذرو	خروشیدن بلبل از شاخ سرو
پری چهره بینی همه دشت و کوه	بهر سو به شادی نشسته گروه
همه دخت توران پوشیده[1] روئے	همه سرو قد و همه مشک بوئے
همه رخ پر از گل، همه چشم خواب	همه لب پر از مے به بوئے گلاب

اخیر شعر پر غور کرو "همه چشم خواب" کے مبالغہ اور بے ساختگی پر متاخرین کے ہزاروں تکلفات اور مضمون آفرینیاں نثار ہیں۔

ایک اور موقع پر ایک پری چہرہ کی تصویر کھینچتا ہے۔

دو ابرو کمان و دو گیسو کمند	به بالا به کردار سرو بلند
دو برگ گلش سوسن مے سرشت	دو شمشاد عنبر فروش از بهشت

[1] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پردہ کی رسم ایرانیوں میں بھی قدیم سے ہے۔

بنا گوش تابندہ خورشید وار	فروہشتہ زو حلقۂ گوشوار
لباں از طبرزد (مصری) زباں از شکر	دہانش مکلل بہ دُرّ و گہر

ان سادہ اور فطری مبالغوں کو دیکھو۔ "لباں از طبرزد زباں از شکر" لیکن یہ نہ سمجھنا کہ وہ مضمون آفرینی اور خیال بندی کے تکلفات سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا، اس انداز میں بھی وہ کسی سے کم نہیں۔

بہ دنبال چشمش یکے خال بود	کہ چشم خودش ہم بہ دنبال بود

سہراب نے جب ایران کی سرحد میں پہنچ کر قلعہ سپید کا محاصرہ کیا ہے۔ تو قلعہ سے ایک عورت مردانہ لباس پہن کر نکلی ہے، اور سہراب سے جنگ آزما ہوئی ہے۔ دیر تک ردّ و بدل کے بعد سہراب نے اس کو گرفتار کیا۔ جھلم چہرے سے ہٹی تو معلوم ہوا کہ عورت ہے۔ سہراب فریفتہ ہوگیا لیکن عورت فریب دے کر نکل گئی۔ سہراب اب سپہگری چھوڑ کر عشق کا دم بھرنے لگا، دیکھو فردوسی اس کے نالہ و زاری کو کسطرح ادا کرتا ہے۔

ہمے گفت ازاں پس دریغا دریغ	کہ شد ماہ تابندہ در زیر میغ
غریب آہوے آمدم در کمند	کہ از بند جست و مرا کرد بند
عجب ہرن میری کمند میں آیا	کہ خود چھوٹ کر نکل گیا اور مجھکو قید میں ڈال گیا
زہے چشم بندے کہ آں پر فسوں	بہ تیغم نہ خست و مرا ریخت خوں
اس شعبدے کو دیکھو کہ اس جادوگر نے	مجھ کو تلوار نہیں ماری لیکن میں قتل ہوگیا
ندانم چہ کرد آں فسوں گر بہ من	کہ ناگہ مرا بست راہِ سخن
بہ زاری مرا خود بباید گریست	کہ دلدار خود را نہ دانم کہ کیست
ہمے گفت و میسوخت از غم بسے	نمے خواست رازش بداند کسے
و لے عشق پنہاں نماند کہ راز	بمُردم نماید ہمے اشک باز
غم جاں برآرد خروش از دروں	اگر چند (ہر چند ۱۲) عاشق بود ذو فنوں

ان شعروں میں عشقیہ شاعری کی تمام ادائیں موجود ہیں۔ استعارات اور تشبیہات کا بھی ہلکا سا رنگ ہے۔ شاعرانہ ترکیبیں بھی ہیں۔ ع کہ از بند جست و مرا کرد بند۔ ع بہ تیغم نہ خست و مرا ریخت خوں۔ یہ سب کچھ ہے لیکن فردوسی اس بات کو نہیں بھولا کہ وہ سہراب کی داستان لکھ رہا ہے۔ محمد شاہ واجد علی شاہ کی نہیں۔ اس لئے فوراً

سہراب تو ہومان کی زبان سے نصیحت کرتا ہے۔ اور دیکھو ایک حوصلہ مند فاتح کی نصیحت کا کیا انداز ہے۔

ازاں کار ہوماں نبودش خبر	کہ سہراب را ہست خوں در جگر
ولے از فراست بدل نقش بست	کہ او را پریشانیے داد دست
بہ دام کسے پائے بند آمدہ است	ز زلفِ بتے در کمند آمدہ است
نہاں مے کند درد خونین دل است	ہوس میرود راہ و پا در گِل است
یکے فرصتے جست و گفتش بہ راز	کہ اے شیر دل گُرد گردن فراز
فریبِ پری پیکرانِ جواں	نخواہد کسے کو بود پہلواں
نہ رسمِ جہانگیری و سروری است	کہ از مہر ملے ہیبایدگر گریست
ز توراں بہ کارے بردں آمدیم	شناور بدریائے خون آمدیم
اگرچند ایں کار باشد بہ کام	ولے ہست در پیش رنجے تمام
بیاید شہنشاہ کاؤس و طوس	چو رستم کہ بر پیر دارد فسوس

(یعنی ہوس میرود ۱۲) (ہر چند ۱۲)

پھر بہت سے ایرانی پہلوانوں کے نام گنا کر کہتا ہے۔

توئی مرد میدان ایں سروراں	چہ کارت بہ عشقِ پری پیکراں
تو کارے کہ داری نہ بُردی بسر	چرا دست، بازی بہ کارِ دگر
بہ نیروے مردی جہاں را بگیر	ز شاہاں بدست آر تاج و سریر
چو کشور بدست تو آید فراز	بہر جائے خوباں برندت نماز
ازاں گفتہ سہراب بیدار شد	دلش بستۂ بندِ پیکار شد
بگفت اے سرِ نامدارانِ چیں	بگفتار خوبت ہزار آفریں
شد ایں گفت تو دارُوے جانِ من	کنوں با تو نوگشت پیمانِ من
جہاں را سراسر چہ خشک وچہ آب	در آرم بفرمانِ افراسیاب
بگفت این و دل راز دلبر بکند	بر آمد بر افرازِ تختِ بلند

دیکھو ایک شجاع دامِ عشق میں اتفاقاً پھنس بھی جاتا ہے۔ تو کس طرح جلد چھوٹ کر نکل جاتا ہے۔ فردوسی نے موقع پا کر عشقیہ شاعری کا کمال بھی دکھلا دیا۔ اور پھر متانت اور شائستگی کا سررشتہ کہیں ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ متاخرین بلکہ نظامی و سعدی کو بھی اتنا

سہارا ہات آجاتا تو خدا جانے کہاں سے کہاں نکل جاتے۔

پانچویں خصوصیت

(۵) شاعری کا اصل کمال واقعہ نگاری اور جذبات انسانی کا اظہار ہے۔ ان دونو باتوں میں وہ تمام شعراء کا پیش رو اور امام ہے۔ وہ جس واقعہ کو لکھتا ہے۔ اُس کے تمام جزئیات اور گرد پیش کے ہر قسم کے حالات اور واقعات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پیدا کرتا ہے۔ پھر اُن کو اس خوبی کے ساتھ ہُوبہُو ادا کرتا ہے۔ کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اور شعرا یا تو واقعہ کے متعلق چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر ڈالنا ضروری نہیں سمجھتے یا سمجھتے ہیں لیکن طبیعت، فطرت شناس نہیں ہوتی۔ اس لئے باریک باتوں پر نظر نہیں پڑتی یا پڑتی ہے۔ لیکن زبان پر قدرت نہیں کہ جوں کا توں ادا کریں اس لئے یا بات کو بدل کر کہتے ہیں۔ یا استعارات وتشبیہات کے دامن میں پناہ لیتے ہیں تم دیکھتے ہو کہ فردوسی استعارہ کے پاس ہو کر نہیں نکلتا، تشبیہیں وہی پاس پاس کی لیتا ہے۔ مجاز کو بہت کم ہات لگاتا ہے۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ وہ ان باتوں میں قاصر ہے بلکہ وہ جانتا ہے کہ یہ چیزیں واقعہ کے چہرہ پر نقاب ڈال دیتی ہیں۔ اور اس کا اصلی خط و خال نظر نہیں آتا، غور کرو۔ یہ لکھنا مقصود ہے کہ خاقان چین ہاتھی پر ہے۔ رستم نے کمند پھینکی اور اس کو گرفتار کر کے ہاتھی سے ٹپک دیا۔ فردوسی اس کو اسطرح ادا کرتا ہے۔

چو از دست رستم رہا شد کمند	سر شہریار اندر آمد بہ بند
ز پیل اندر آورد و زد بر زمیں	بر بستند بازوئے خاقان چیں

نظامی کو اسی قسم کا موقع پیش آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

کمند عدو بند را شہریار	بیند اخت چوں چنبر روزگار

بے شبہ عدو بند کے لفظ سے جملہ کی ترکیب چست ہوگئی "چنبر روزگار" کی تشبیہ نے بھی ندرت پیدا کی۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن سننے والے پر یہ اثر ہوا کہ اصل واقعہ کے بجائے اس کی توجہ الفاظ اور تشبیہ کی طرف متوجہ ہوگئی اور کمند میں گرفتار ہونے کی اصلی حالت سامنے نہ آسکی، یہی نکتہ ہے کہ فردوسی واقعات اور جذبات کے بیان کرنے میں استعارات اور تشبیہات وغیرہ سے بہت کم کام لیتا ہے۔ اور جب اس کو طباعی اور انشار پردازی کا زور دکھانا ہوتا ہے۔ تو دوسرے موقعے تلاش کرتا ہے۔ چنانچہ اسکی تفصیل آگے آتی ہے۔ واقعہ نگاری کے دقیق نکتوں پر اس کی نظر جس طرح پڑتی ہے۔ اس کی ایک دو

مثالیں ہم لکھتے ہیں۔

پہلوان جب جوش شجاعت میں لبریز ہوتا ہے۔ تو اکثر یہ ہوتا ہے۔ کہ لڑائی بھڑائی کچھ نہیں، تنہا بیٹھا ہے۔ لیکن آپ ہی آپ بپھرا پڑتا ہے۔ اور جوش میں آپے سے باہر ہوا جاتا ہے۔ سہراب جب ایرانی فوج کے ایک ایک سردار پر نظر ڈال کر ہجیر سے اُن کا نام و نشان پوچھتا ہے۔ تو اس کی نظر رستم پر بھی پڑتی ہے۔ اور ہجیر سے کہتا ہے۔ یہ کون شخص ہے۔ جس کی یہ حالت ہے کہ

بخود ہر زماں بر خروشدہمے آپ ہی آپ بپھر رہا ہے	تو گوئی کہ دریا بجوشدہمے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا دریا جوش مارتا ہے

ایک جسیم اور تناور پہلوان کبھی تخت پر بیٹھا ہوتا ہے۔ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سارے تخت پر چھایا جاتا ہے۔ اس حالت کو فردوسی نے اس موقع پر جب بار رستم سہراب کے دیکھنے کو گیا ہے۔ اور سہراب تخت پر بیٹھا ہوا اپنے پہلوانوں سے باتیں کر رہا ہے اس طرح ادا کیا ہے۔ ع تو گفتی ہمہ تخت سہراب بود

سہراب نے کیکاؤس کے خیمہ کے پاس جا کر برچھی سے خیمہ کی میخیں اکھاڑ کر پھینک دی ہیں۔ فردوسی اس واقعہ کو اس طرح ادا کرتا ہے۔

ازاں پس بجنبید از جائے خویش خم آورد پشت و سنان ستیغ سرا پردہ یک بہرہ آمد زپائے	بہ نزدیک پردہ سرا رفت پیش بزد تند و برکند ہفتاد میخ زہر سو برآمد دم کرہ نائے

عام شعرا اگر اس واقعہ کو لکھتے تو صرف اس پر قناعت کرتے کہ سہراب نے میخیں اکھاڑ کر پھینک دیں، لیکن یہ خصوصیات کہ "وہ جھک کا جھک کر زور سے نیزہ مارا استرمیخیں اکھاڑ کر پھینک دیں" "خیمہ کا ایک حصہ گر پڑا" نظر انداز کر جاتے، حالانکہ واقعہ کی تصویر کھینچنے کے لئے ان تمام باتوں کا ادا کرنا ضروری ہے۔

اسی تفصیلی واقعہ نگاری کی بدولت ہم کو بہت سے ایسے محاوروں تک رسائی ہوتی ہے۔ جو یوں کبھی عام طریقہ بیان میں نہیں آسکتے تھے۔

مثلاً سہراب نے جب رستم کو گرز مارا ہے۔ تو رستم تلملا جاتا ہے۔ مگر ضبط سے کام لیتا ہے۔ اور سہراب پر ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ اس واقعہ کو اردو کا محاورہ وال حرف اس

لفظ سے ادا کرے گا کہ "پی گیا"۔ فردوسی نے بھی صرف محاورہ سے کام لیا چنانچہ کہتا ہے ع
بہ پیچید و دردا زدلیری بخورد۔ رستم ایک معرکہ میں صرف کمند ہاتھ میں لے کر گیا ہے
حریف سے سوال جواب ہوئے۔ تو اُس نے طنز سے کہا "اس دھاگے کے بل پر بہت
نہ اتراؤ"۔ فردوسی اس طنز یہ محاورہ کو بعینہٖ اسی طرح ادا کرتا ہے۔

بدو گفت ہوماں کہ چندیں مدم	بہ نیروئے ایں رشتۂ شصت خم

واقعہ نگاری کی مثالوں سے تمام شاہنامہ بھرا پڑا ہے۔ ہم نمونہ کے طور پر ایک مختصر لیکن مسلسل داستان یہاں نقل کرتے ہیں۔

یہ وہ موقع ہے کہ سہراب ایک ایرانی پہلوان کو لے کر کیکاؤس کے لشکر گاہ کو دیکھنے چلا ہے۔ فوجیں اپنے اپنے افسروں کے ساتھ الگ الگ ساز و سامان سے آراستہ ہیں۔ سہراب ایک ایک پر نگاہ ڈالتا جاتا ہے۔ اور ہر ایک کا نام و نشان پوچھتا ہے۔ ایرانی پہلوان جواب دیتا ہے۔

بدو گفت کز تو بپرسم ہمہ	ز گردن کشاں وز شاہ و رمہ
سراپردۂ دیبۂ رنگ رنگ	بدو اندروں خیمہ ہائے پلنگ
بہ پیش اندروں بستہ (کمخواب ۱۲) صد ژندہ پیل	یکے تخت پیروزہ بر ساں نیل
یکے زرد خورشید پیکر[1] درفش (فام قوی ۱۲، علم ۱۲)	سرش ماہ زریں، (فیروزہ ۱۲) غلافش بنفش (بنفشی رنگ کا ۱۲)
بہ قلب سپاہ اندروں جائے کیست	ز گردان ایران ورا نام چیست
بدو گفت کاں شاہ ایران بود	کہ بر درگہش پیل و شیران بود
وزاں پس بدو گفت کز میمنہ	سواران بسیار و پیل و بنہ
سراپردہ بر کشیدہ سیاہ	زدہ گردش اندر ستادہ سپاہ
بگرد اندرش خیمہ زاندازہ بیش	پس پشت پیلان و شیران بہ پیش
زدہ پیش او پیل پیکر درفش	بہ نزدش سواراں زرینہ کفش
چہ باشد ز ایرانیاں نام اوے	بگو تا کجا باشد آرام اوے
چنیں گفت کاں طوس نوذر بود	درفشش کجا پیل پیکر بود
بپرسید کاں سرخ پردہ سرائے	یکے لشکرے گشن پیشش بپائے
یکے شیر پیکر درفش بنفش	درافشاں گہر (توی ۱۲) در میان درفش

[1] خورشید پیکر یعنی آفتاب کی صورت۔ ۱۲

پس پشتش اندر سپاہی گراں	ہمہ نیزہ داران جوشن وراں
چنیں گفت کاں فرِّ آزادگاں	سپہدار گودرز کشوادگاں
سپہ کش بود گاہ کینہ دلیر	دو چل پور دارد چو پیل و چو شیر
اب رستم کی باری آتی ہے۔	
دگر گفت کاں سبز پردہ سرائے	بزرگان ایراں بہ پیشش بپائے
یکے تخت پرمایہ اندر میاں	زدہ پیشِ او اختر کاویاں
بر او بر نشستہ یکے پہلواں	ابا فرّ و با سفت و یال گواں
ازاں کس کہ بر پائے پیشش براست	نشستہ بیک سر ازو برتر است
جو شخص سامنے کھڑا ہے	رستم کا قد اس بیٹھنے کی حالت میں بھی نکلا ہوا ہے
بہ ایران نہ مردے بہ بالائے او	کمندے فرو ہشتہ تا پائے او
درفشش ببیں اژدہا پیکر است	براں نیزہ بر شیر زریں سر است
بخود ہر زماں بر خروشد ہمے	تو گوئی کہ دریا بجوشد ہمے
کہ باشد؟ بنام آں سوارِ دلیر	کہ ہر دم ہمے بر خروشد چو شیر
ہجیر نے رستم کا نام بدل کر بتایا۔ سہراب اب اور افسروں کا حال پوچھتا ہے۔	
وزاں پس بپرسید کز مہتراں	کشیدہ سراپردۂ بر کراں
سواران بسیار و پیلاں بپائے	بر آید ہمے نالۂ کرنائے
میانِ سراپردہ تختے زدہ	ستادہ غلاماں بہ پیشش ردہ
ز ایران بگو نام آں مرد چیست	کجا جائے دارد نژادش ز کیست
چنیں گفت کاں پور گودرز گیو	کہ خوانند گُردان ورا گیوِ نیو
ز گودرزیاں بہتر و مہتر است	بہ ایران سپہ بر دو بہرہ سر است
بدو گفت زاں سو کہ تابندہ شد	بر آید یکے پردۂ نیم سپید
ز دیبائے رومی بہ پیشش سوار	ردہ بر کشیدہ فزوں از ہزار
پیادہ سپر دارد نیزہ وراں	شدہ انجمن لشکرے بیکراں
ز دیبا فرو ہشتہ زیبا جلیل	غلام ایستادہ ردہ خیل خیل
نشستہ سپہدار بر تخت عاج	نہادہ براں عاج کرسی ساج

چہ نام است او را ز نام آوراں	سپہبد نژاد است یا سروراں
بدو گفت کورا فرا بر زخواں	کہ فرزند شاہ است و تاج گواں
بدو گفت سہراب کیں در خور است	کہ فرزند شاہ است و با افسر است

واقعہ نگاری جب اس حد تک پہنچ جاتی ہے۔ تو اس کو مرقع نگاری یعنی آج کل کے محاورہ میں سین دکھانا کہتے ہیں۔

چھٹی خصوصیت

جذبات، رزمیہ میں درد و غم کے اظہار کا کم موقع پیش آتا ہے۔ اور آئے بھی تو بلاغت یہی ہے کہ اس کو زیادہ پھیلایا نہ جائے، تاہم کہیں کہیں اس کا موقع پیش آگیا ہے۔ تو فردوسی نے اس میں بھی کمال دکھایا ہے۔ سہراب کے مرنے کی خبر سن کر اس کی ماں کی جو حالت ہوئی ہے۔ اور جس طرح اس نے نالہ و زاری کی ہے۔ اس کو اس طرح ادا کرتا ہے۔

خروشید و جوشید و جامہ درید	بہ زاری براں کودکِ نارسید (نوجوان ۱۲)
برآورد بانگ و غریو و خروش	زماں تا زماں زو ہمے رفت ہوش
فرو برد ناخن دو دیدہ بہ کند (آنکھیں نکال ڈالیں ۱۲)	برآورد و بالا در آتش فگند (دہبادم ۱۲)
مر آں زلف چوں تاب دادہ کمند	بہ انگشت پیچید و از بن بکند
بہ سر بر فگند آتش و بر فروخت	ہمہ موئے مشکیں بہ آتش بسوخت
ہمے گفت کاے جانِ مادر کنوں	کجائی؟ سرشتہ بخاک و بخوں
دو چشمم بہ رہ بود گفتم مگر	ز سہراب و رستم بیابم خبر
چہ دانستم اے پور کآید خبر	کہ رستم بخنجر دریدت جگر
دریغش نیامد ازاں روئے تو	ازاں برز و بالا و بازوئے تو
بپروردہ بودم تنش را بہ ناز	بہ رخشندہ روز و شبانِ دراز
کنوں آں بخوں اندروں غرقہ گشت	کفن بر تنِ پاک او خرقہ گشت
کنوں من کرا گیرم اندر کنار	کہ خواہد بُدن مر مرا غمگسار
پدر جستی اے گُردِ لشکر پناہ	بر جائے پدر گورت آمد براہ
چرا نامدم با تو اندر سفر	کہ گشتی بہ گردان گیتی سمر (مشہور ۱۲)
مرا رستم از دور بشناختے	ترا با من اے پور بنواختے
بنیداختے تیغ آں سرفراز	نکردے جگر گاہت اے پور باز

ہمے گفت و مے خست و مے کند موئے	ہمیزو کفِ دست بر خوب روئے
زخوں او ہمے کرد لعل آب را	بپیش آورید اسپ سہراب را
سرِ اسپ او را بہ بر در گرفت	بماندہ جہانے دراو در شگفت (متعجب ۲)
گہے بوسہ زد بر سرش گہ بروئے	زخوں زیر سمش ہمے راند جوئے
بیاورد آں جامۂ شاہوار	گرفتش چو فرزند اندر کنار
بیاورد خفتان و درع و کمان	ہماں نیزۂ و تیغ و گرزِ گراں
بسر بر ہمے زد گراں گرز را	ہمے یاد کرد آں بر و برز را
بیاورد زین و لگام و سپر	لگام و سپر را ہمے زد بسر

سہراب کی ماں نے جو کچھ کہا ہے۔ کس قدر سچ اور کس قدر پُر تاثیر ہے۔ سہراب کے گھوڑے کو گود میں لینا، اس کے ہاتھ پاؤں چومنا، سہراب کے کپڑوں کو بچہ کی طرح آغوش میں لینا۔ ہتھیاروں کو سر پر مارنا، کس قدر اصلی حالت کی سچی تصویر ہے۔

بیژن، ایرانی پہلوان تھا، افراسیاب کی لڑکی **منیژہ** اس پر عاشق ہو گئی۔ اور چوری سے جا کر گھر میں رکھا۔ جب افراسیاب کو خبر ہوئی۔ تو اُس نے بیژن کو ایک کنوئیں میں قید کر دیا۔ اور منیژہ کو گھر سے نکال دیا۔ منیژہ بیژن کی تیمار داری اور خبر گیری کرتی تھی۔ رستم بیژن کے چھڑانے کو سوداگر بن کر گیا۔ اور توران پہنچ کر تجارت کے سامان پھیلائے منیژہ کو خبر ہوئی دوڑی ہوئی آئی اور رستم سے بیژن کے حالات بیان کئے رستم نے اس خیال سے کہ راز فاش نہ ہو جائے۔ منیژہ کو جھڑک دیا کہ میں بیژن و یژن کو کچھ نہیں جانتا۔ منیژہ دل شکستہ ہو کر کہتی ہے۔

بہ رستم نگہ کرد و بگریست زار	زخواری بیارید خوں در کنار
بدو گفت کاے مہترِ پُر خرد	زتو سرد گفتن نہ اندر خورد
رستم سے کہا کہ اے سردار	اس طرح رکھائی سے جواب دینا آپکے شایاں نہیں
سخن گر نہ گوئی مرانم زپیش	کہ من خود و لے دارم از درد ریش
اگر بات نہیں کرتے تو نہ کرو لیکن مجھ کو ادہر ہٹاتے کیوں ہو	میرا دل تو خود مصیبت سے زخمی ہو رہا ہے
چنیں باشد آئین ایراں مگر	کہ درویش را کس نہ گیرد خبر
کیا ایران کا یہی دستور ہے	کہ لوگ غریبوں سے بات نہیں کرتے

زدی بانگ بر من چو جنگ آوراں — نہ ترسی تو از داورِ داوراں

مجھ کو پہلوانوں کی طرح ڈانٹ بتاتے ہو — تم کو بادشاہوں کے بادشاہ (خدا) کا کچھ ڈر نہیں

منیژہ منم دخت افراسیاب — برہنہ ندیدہ تنم آفتاب

کنوں دیدہ پُر خون و دل پُر ز درد — ازیں در بداں در دو رخسارہ زرد

برائے یکے بیژن شور بخت — فتادم ز تاج و فتادم ز تخت

اختصار اور زور بلاغت کے نکتہ شناس جانتے ہیں، کہ کسی واقعہ کے بیان کرنے میں جب حد سے زیادہ زور دینا مقصود ہوتا ہے۔ تو لمبی چوڑی تمہید اور تفصیل وہ کام نہیں دیتی جو ایک پُر زور مختصر جملہ کام دیتا ہے۔ قرآن مجید میں اوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ، غشیھم من الیم ما غشیھم میں جو بات ہے وہ سینکڑوں جملوں سے ادا نہیں ہو سکتی۔ روم کے فاتح کا مشہور جملہ تم نے سُنا ہوگا "میں آیا، میں نے دیکھا، میں نے فتح کیا" شاہنامہ میں اسکی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ سہراب کی پُر درد داستان اس شعر سے شروع کی ہے۔

کنوں جنگ سہراب و رستم شنو — دگرہا شنودستی ایں ہم شنو

صرف "ایں ہم" نے جو بات پیدا کی وہ ہزاروں تمہید سے نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ رستم افراسیاب کو خط لکھتا ہے۔ اور تمہید کے وسیع مضمون کو ایک مصرعہ میں ادا کرتا ہے۔

دگر نہ بکام من آمد جواب — من و گرز و میدان و افراسیاب

نظامی نے اپنے فخریہ میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں لیکن فردوسی کے دو مصرع سب پر بھاری ہیں۔

بسے رنج بردم دریں سال سی — عجم زندہ کردم دریں پارسی

رستم کی مار دھاڑ ہنگامہ آرائی اور قتال و جدال کا سماں صرف چار مصرعوں میں دکھایا ہے۔

بروز نبرد آں یل ارجمند — بہ شمشیر و خنجر بہ گرز و کمند

برید و درید و شکست و ببست — یلاں را سر و سینہ و پا و دست

صلاح و مشورہ کے لئے لوگ جمع ہوئے ہیں۔ اسی میں کھانا بھی سامنے آگیا ہے۔ لوگ کھا پی کر اُٹھ کھڑے ہوئے، اس کو اس طرح ادا کرتا ہے۔

پئے مشورہ مجلس آراستند — نشستند و گفتند و برخاستند

آٹھویں خصوصیت

(۸) صنائع بدائع شاعری کے زوال کا پیش خیمہ ہیں۔ اس لئے فردوسی کے کلام میں اس کو ڈھونڈھنا نہیں چاہیئے۔ لیکن جو محاسن شاعری ضمناً کسی صنعت میں آجاتے ہیں۔ اس کے کلام میں پائے جاتے ہیں، اور اعلیٰ درجہ پر پائے جاتے ہیں۔ مثلاً لف ونشر مرتب۔

بر روز نبرد آں یلِ ارجمند	بہ شمشیر و خنجر بگرز و کمند
درید و برید و شکست و ببست	یلاں را سر و سینہ و پا و دست

لف ونشر مع طباق و مقابلہ۔

مبالغہ	فرو شد بہ ماہی و بر شد بہ ماہ	بُنِ نیزہ و قبۂ بارگاہ
	ز بس گرد میداں کہ برشد بہ دشت	زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

رزمیہ شاعری

رزمیہ شاعری جس کو انگریزی میں ایپک پوئم کہتے ہیں، شاعری کے انواع میں سے بہترین انواع ہے۔ یورپ کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہومر ہے۔ اس کا کارنامۂ فخر یہی رزمیہ شاعری ہے۔ مہابھارت جس کو ہندو آسمانی کتاب سمجھتے ہیں وہ بھی ایک رزمیہ نظم ہے۔ اور اگر ان دونو کے پہلو میں کسی کو جگہ دی جاسکتی ہے۔ تو وہ **شاہنامہ** ہے۔

رزمیہ شاعری کے کمال کے چند شرائط ہیں۔ واقعہ ایسا مہتم بالشان ہو۔ جس نے دنیا کی تاریخ میں کوئی انقلاب پیدا کر دیا ہو۔ لڑائی کے ہنگامہ کا بیان اس زور شور اور پُر رعب طریقہ سے کیا جائے۔ کہ دل دہل جائیں۔ معرکۂ جنگ کے تمام ساز و سامان اور آلات و اسلحۂ جنگ تفصیل سے بیان کئے جائیں۔ سالارِ فوج اور مشہور بہادر کی لڑائی کے بیان میں لڑائی کے تمام داؤں پیچ ایک ایک کر کے دکھائے جائیں۔ شاہنامہ میں یہ تمام باتیں اعلیٰ درجہ پر پائی جاتی ہیں۔

ہنگامۂ جنگ اور ہل چل	ز لشکر بر آمد سراسر خروش	زمیں پُر خروش و ہوا پُر خروش
	جہاں لرز لرزاں شد و دشت و کوہ	زمیں شد ز نعل ستوراں ستوہ
	درفش از درفش گروہ از گروہ	گسستہ نشد شب بر آمد ز کوہ
	درخشیدنِ تیغہائے بنفش	ازاں سایۂ کاویانی درفش
	تو گفتی کہ اندر شب تیرہ چہر	ستارہ ہمے بر فشاند سپہر
	زمیں گشت جنباں چو ابرِ سیاہ	تو گفتی ہمے بر نتابد سیاہ

بلند آسماں چوں زمیں شد زخاک　　ز ہر سو ہمے بر شدہ چاک چاک
دل کوہ گفتی مدرّد ہمے　　زمیں با سواراں بپرّد ہمے
زبس نعرهٔ نالهٔ کرّنائے　　ہمے آسماں اندر آمد زجائے
چناں تیرہ شد روئے گیتی زگرد　　تو گفتی کہ خورشید شد لاجورد
بزد مہرہ بر کوہ ژندہ پیل　　زمیں جنب جنبان چو دریائے نیل
زگرد سواراں ہوا بست میغ　　چو برق درخشندہ پولاد و تیغ
زجوشِ سواران و آوازِ کوس　　ہوا قیر گوں شد زمیں آبنوس
تو گفتی زمین موج خواہد زدن　　وزاں موج بر اوج خواہد زدن
زبس گرد میدان کہ بر شد بدشت　　زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت
زبس نیزهٔ و گرز و گوپال و تیغ　　تو گفتی ہوا ژالہ بارد ز میغ
زکشتہ ہمہ دشت آورد گاہ　　تن و دست و سر بود و ترک و کلاہ
بجوشید دشت و بتوفید کوہ　　زجوشِ سواران ہر دو گروہ
تو گفتی کہ روئے زمیں آہن است　　زنیزہ ہوا نیز در جوشن است

شاہنامہ میں لڑائی کے سامان اور اسلحۂ جنگ کی اس قدر تفصیل پائی جاتی ہے کہ ہم بہ تفصیل بتا سکتے ہیں۔ کہ آج سے دو ہزار برس پہلے آلاتِ جنگ کیا کیا تھے پہلوان اور بہادر کیا کیا ہتھیار لگاتے تھے۔ لباس جنگ کیا کیا تھے۔ مثلاً لڑائی کے وقت جو باجے استعمال ہوتے تھے، اُن کے یہ نام ہیں۔ بتیرہ۔ گاؤدم۔ خرمہرہ۔ کوس۔ طبل۔ نقارہ کرنائے۔ سرغین۔

اسلحۂ جنگ یہ تھے۔ زرہ۔ جوشن۔ خود۔ مغفر۔ چار آئینہ۔ خفتان۔ ترک۔ بیربان۔ برگستوان۔

آلات اور سامان جنگ یہ تھے۔ گوپال۔ گرز۔ تیغ۔ سپر۔ درقہ۔ خنجر۔ ژوپین۔ ناوک۔ خشت۔ تیر۔ خدنگ۔ کمند۔ سنان۔ نیزہ۔ ژوپن۔ پرتاپ۔ تبرزین۔ دبوس۔ قارورہ۔ شراع۔ عرّادہ۔ رایت۔ علم۔ درفش۔ اختر۔ سراپردہ۔

اقسام فوج۔ قلب۔ میمنہ۔ میسرہ۔ طلایہ۔ ساقہ دیدار۔

اُس زمانہ میں مجموعی فوج کے لڑانے کا فن نہ تھا۔ اس لئے یہ پتہ نہیں لگتا کہ سپہ سالار کس طریقہ سے فوج کو لڑاتے تھے۔ رستم اگرچہ سپہ سالار تھا اور شاہنامہ سرتاپا گویا اُسی کی داستان ہے۔ تاہم کہیں یہ پتہ نہیں لگتا۔ کہ اُس نے فوج کو کیونکر لڑایا۔ طریقۂ جنگ یہ تھا کہ ایک ایک پہلوان میدان میں آتا تھا۔ اور معرکہ آرا ہوتا تھا۔ اِن معرکہ آرائیوں کو فردوسی اس تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ کہ سماں باندھ دیتا ہے۔

لڑائی کے جتنے طریقے تھے۔ یعنی کُشتی لڑنا۔ تلوار چلانا۔ تیر مارنا۔ کمند پھینکنا۔ برچھی چلانا وغیرہ وغیرہ **شاہنامہ** میں سب بہ تفصیل پائے جاتے ہیں۔ اور جس چیز کو جہاں لکھا ہے اس طرح لکھا ہے کہ اس کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔

کمند اندازی

تہمتن ز الوای شد دردمند　　ز فتراک بگشاد پیچان کمند
چو آہنگ رزم یلان داشتی　　کمندی و گرزی گران داشتی
(نام پہلوان کا)
بیامد بغرید چون پیل مست　　کمندی بہ بازو و گرزی بدست
برو گفت کاموس چندین مدم　　بہ نیروی آن رشتۂ شصت خم
برآمیخت کاموس جنگی نبرد　　ہم آورد را دید بازو و برد
بینداخت تیغ پرند آورش　　ہمی خواست از تن گسستن سرش
سر تیغ بر گردن رخش خورد　　ببرید برگستوان نبرد
نیامد تن رخش را زان گزند　　گو پیلتن حلقہ کرد آن کمند
بینداخت و افگند شش اندر میان　　(نام پہلوان) بگسیخت از جای رخش دمان
بہ ران اندر آورد و گردش دوال　　عقابی شدہ رخش با پر و بال
بہ رای و دلیری بیفشرد ران　　گران شد رکیب و سبک شد عنان
ہمی خواست آن خام خم کند　　بہ نیروی تن بگسلاند ز بند
شد از ہوش کاموس و گسست خام　　گو پیلتن رخش را کرد رام
عنان را بہ پیچید و او را ز زین　　نگون اندر آورد و زد بر زمین
دو دست از پس پشت بستش چو سنگ　　بہ خم کمند اندر آورد چنگ

تیر اندازی

تہمتن بہ بند کمر برد چنگ　　گزین کرد یک چوبہ تیر خدنگ
خدنگی برآورد پیکان چو آب　　نہادہ برو چار پر عقاب

بمالید چاچی کماں را بدست — بہ چرم گوزن اندر آمد شکست
ستوں کرد چپ را و خم کرد راست — خروش از خم چرخ چاچی بخاست
چو سوفارش آمد بہ پہنائے گوش — ز چرم گوزناں بر آمد خروش
چو پیکاں ببوسید انگشت او — گزر کرد از مہرۂ پشت او
چو زد تیر بر سینۂ اشکبوس — سپہر آں زماں دست او داد بوس
قضا گفت گیر و قدر گفت دہ — فلک گفت احسن ملک گفت زہ

نیزہ بازی

برآشفت سہراب وشد چوں پلنگ — چو بدخواہ او چارہ جو شد بہ جنگ
عناں برگرائید و برداشت اسپ — بیامد بہ کردار آذر گشسپ
چو آشفتہ شد شیر، تندی نمود — سر نیزہ را سوئے او کرد زود
بدست اندروں نیزۂ جاں ستان — پس پشت خود گردش آنگہ سناں
بزد بر کمر بند گرد آفرید — زرہ بر تنش یک بہ یک بر درید
ز زیں بر گرفتش بہ کردار گوی — کہ چوگاں ز باد اندر آید بروی

کشتی گیری

گرفتند ازاں پس دوال کمر — دو اسپ تگاور بر آوردہ پر
یکے بُد بدست یل اسفندیار — بدست دگر رستم نامدار
بہ نیرو کشیدند زی خویشتن — دو گرد سرافراز و دو پیلتن
ہمے زور کرد ایں براں، آں بریں — نجنبید یک مرد بر پشت زیں
کف اندر دہاں شاں شدہ خون و خاک — ہمہ گبر و برگستواں چاک چاک
چو رستم ورا دید بفشرد راں — بگردن بر آورد گرز گراں
چو تنگ اندر آورد با او زمیں — فرو کرد گرز گراں را بہ زیں

شاہنامہ کا اثر

شاہنامہ کے مقبول عام ہونے کے مخالف بہت سے اسباب جمع تھے۔ سب سے مقدم یہ کہ وہ سرتاپا غیر قوموں کا کارنامہ تھا اور مسلمانوں کا جہاں جہاں ذکر آگیا تھا۔ نہائت حقارت سے اُن کو یاد کیا تھا۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید است کار
کہ تخت کیاں را کنند آرزو — تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

قادسیہ کے معرکہ میں مسلمانوں نے بے نظیر شجاعت کے جوہر دکھلائے تھے۔ فردوسی

نے اس کو بھی منہدم کر کے دکھایا تھا۔ اس بات پر مذہبی گروہ میں عام ناراضی پھیلی چنانچہ اسی زمانہ میں عمر نامہ ایک کتاب لکھی گئی۔ جس کے دیباچہ میں سببِ تالیف یہ بیان کیا ہے کہ چونکہ فردوسی نے ایرانیوں کے جھوٹ سچ قصے لکھ کر ملک میں مشہور کر دیئے اس لئے یہ کتاب حضرت عمر فاروق کے حالات میں لکھی گئی۔ کہ لوگوں کی توجہ اُدھر سے ہٹ جائے۔

چونکہ فردوسی نے سلطان محمود کی ہجو لکھ کر شاہنامہ میں اس کو منضم کر دیا تھا۔ اسی لئے لوگ شاہنامہ کو ہاتھ لگاتے ڈرتے تھے۔ فردوسی چونکہ معتوب شاہی تھا۔ اس لئے بھی اس کی تصنیف مقبول عام نہ ہو سکتی ہوگی۔

یہ سب تھا لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ خراسان سے لے کر بغداد تک در و دیوار سے شاہنامہ کی صدا آنے لگی، تصریر، تحریر، تصنیف تالیف، خلوت و جلوت، کوچہ و بازار، اسکی آواز بازگشت سے گونج اٹھے، لوگ جب کام سے فارغ ہو کر بیٹھتے تو کوئی خوش لہجہ شخص حفظ شاہنامہ کے اشعار پڑھتا، اور شجاعت، جانبازی، دلیری، حب وطن کا اثر تمام مجلس پر چھا جاتا سینکڑوں برس تک، سلاطین و امراء، کی باہمی خط و کتابت میں شاہنامہ کے اشعار جا بجا درج ہوتے تھے، اور دلیری اور بہادری کے موقعوں پر بے ساختہ اسکے اشعار زبان سے نکل جاتے تھے۔ میدانِ جنگ میں رجز کے بجائے شاہنامہ کے اشعار پڑھے جاتے تھے سلجوقیوں کے اخیر فرمان روا طغرل ارسلان نے میدانِ جنگ میں لڑ کر جان دی تو شاہنامہ کے یہ اشعار زبان پر تھے۔

من آں گرز یک زخم بر داشتم چناں ؟ بر خروشیدم از پشت زیں	سپہ را ہماں جائے بگزاشتم کہ چوں آسیا شد، پریشاں زمیں

شاہنامہ ہی کے اثر نے سینکڑوں برس تک، ایران کی شاعری کو غزل سے پاک رکھا، امتداد زمانہ سے جب اُس کا اثر گھٹا۔ اور عشق و عاشقی کے خیالات قوم میں پھیلنے لگے تو دفعۃً تاتاریوں کے طوفان نے مسلمانوں کی خاک تک اڑا دی۔

شاہنامہ کی زبان

شاہنامہ کی زبان، آج کی زبان سے اس قدر مختلف ہے کہ گویا دو زبانیں الگ الگ ہیں۔ اور یہ شاہنامہ کی تخصیص نہیں۔ اُس زمانہ کے شعرا کی عام زبان یہی تھی لیکن چونکہ اور کسی شاعر نے اس قدر الفاظ استعمال نہیں کئے۔ اس لئے فردوسی کی زبان بہ نسبت اور شعرا کے زیادہ بیگانہ اور غیر مانوس معلوم ہوتی ہے۔

ے یہ کتاب میری نظر سے گزری ہے ۱۲

شاہنامہ کی زبان کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ضمیروں کی ترکیب، مثلاً ع

ز شادی رخاں شاں چوگل بردمید

اب یوں کہیں گے رخہائے ایشاں۔

(۲) غیر جاندار چیزوں کی جمع الف و نون سے، مثلاً

اگر عمر باشد مرا سالیاں، یعنی سالہا

(۳) اسم اور فعل کے آخر میں الف زائد، مثلاً ع

سیامک برآمد برہنہ تنا، یعنی تن،

ع۔ بسی روز گیتی بہ پیما بدا

(۴) فارسی الفاظ پر تشدید مثلاً خوشّی۔ زرّ۔ پرّ۔ ہمّ۔ مژہ۔ زرافّت۔ کڑّی۔

(۵) بعض زائد حرف، مثلاً چناں کے بجائے چوناں، اشیا کے بجائے اشیوا، چنیں کے بجائے چونین۔ فرشتہ کے بجائے فریشتہ۔

(۶) درگہے بجائے اندرون، مثلاً۔

بہ جنگ اندروں گرزۂ گاؤ رنگ،

(۷) متحرک بجائے ساکن، اور ساکن بجائے متحرک، مثلاً،

ع۔ بگویم زمادرش و ہم از پدرش ع نیامدت از شیر و زدیو باک،

ع۔ بہ شادی ہمہ جان بر افشاندند۔

(۸) بے کے پہلے الف زائد۔ ع

اَبے او نباشیم در جنگ شاد۔

(۹) دیا بجائے یا

دیا بارۂ رستمِ جنگجوئے   بہ آخر نہد بے خداوند روئے

(۱۰) کجا بہ معنی کہ ع

درفشش کجا پیل پیکر بود۔

(۱۱) ازبر بمعنی بر۔ ع

نشست ازبر کوہ ژندہ پیل۔ یعنی بر کوہ۔

(۱۲) ایچ - معنی ہیچ -

ع - زپیکاں نہ بود ایچ پیدا سرش،

(۱۳) تائے خطاب کا استعمال، مثلاً -

ع - ہزار نت کودک دہم نوش لب، یعنی ہزاراں ترا -

چو آئی خیابان کنت مراد و ہوا است، یعنی کہ ترا -

(۱۴) ورا، بمعنی اورا -

چو رستم ورا دید خیرہ بماند، یعنی چو رستم اورا دید،

(۱۵) ازوی کے بجائے ازدی -

برادر آمد بہ پرسید ازدی بدو گفت گستاخ با من بگوی

(۱۶) ازیرا بجائے ازیں رو -

ع - ازیرا سرت ز آسماں برتر است، یعنی ازیں رو،

(۱۷) آزمائش کے بجائے آزمون -

نہادی برو دست را آزموں شکم بر زمین بر نہادی ہیوں

(۱۸) میم متکلم کا حذف -

اگر من نہ رفتے بہ مازندراں ، یعنی اگر من نہ رفتمے

اِن تصرفات کے علاوہ سینکڑوں الفاظ ہیں۔ جو بالکل متروک ہو گئے۔ یا اُن کی صورتیں بدل گئیں۔ یا اُن کے بجائے اور اور الفاظ استعمال میں ہیں۔ مختصراً چند الفاظ ذیل میں درج ہیں :-

لفظ	معنے	لفظ	معنے
ویژہ	خاص	آذر گشسپ	برق
مر	شمار	آستی	آستین
ابدول	حالا	برسان	بسان
ایدر	اینجا	آغاز	ارادہ
آخر	اصطبل	افسوس	ظلم و ستم
آذین	زینت و آرایش	اند	چند - یا اندک

لفظ	معنے	لفظ	معنے
اندرخور	لائق	بسنده	کافی
انوشه	آفرین	پسیج	قصد و کارسازی
بادسر	مغرور	بگماز	شراب
بارگی وباره	اسپ	پازهر	تریاک
پاژ	خراج	پذیره	استقبال کردن
بخش	حصّه	پدرام	آراسته
تال و مال	ریزه ریزه	پهلوانی	زبانِ پہلوی
تخش	تیر	در	دره کوه، و مرتبه۔ ع
ترک	کلاهِ آهنی		بگفتش به راز این سخن در پدر
ترنگ	صدائے کمان	درخت	دار السیاسته
تلاش	پراگنده	درقه	سپر چرمیں
تنگ آمدن	نزدیک آمدن	دستار	دستر خواں
جوال	ظرفیست کہ از پشم بافند	دست بند	زنان رقاص
چاک	سفیدهٔ صبح	دست حابه	جامه سر و پا
چاک چاک	صدائے زدن شمشیر	دست راست	وزیر اعظم
چرنگیدن	آوازِ گرز	دست وار	عصا
چک	قباله اور دستاویز	دفتر شکستن	دفتر ساختن
سه دیگر	سیوم	وهدار	ساقهٔ لشکر
شارسان	شهر و شهرستان	غو	خروش
شبگیر	صبح	گو	پہلوان
شخودن	خراشیدن	فروریختن از اسپ	فرود آمدن
شکردن	پاره کردن	فزونی	فضیلت و بزرگی
غرم	میش کوهی	فسیله	گله اسپ
غرچه	مخنث و نامرد	فش	دُم و یال اسپ
برتر	بلندی		

لفظ	معنے	لفظ	معنے
قارورہ	آلہ الیست از آلاتِ جنگ	زخم	عبارت
خشت	نیزہ کوچک	زمزم	کلماتِ مُغاں کہ وقتِ
دبوس	گرز		پرستش گویند
درع	پیراہنِ زناں	زی	زمین
سبز در سبز	نام لحنے است	زنہار خوردن	عہد شکستن
ستادہ	خیمہ	زوار	خامِ زندان خانہ
ستارہ	مسہری	ژکیدن	آہستہ زیرِ لب گفتن
ستودان	وخمہ	ماروچ	کج
ستیغ	راست و بلند	صلاب	اصطرلاب
سرسری	فرومایہ	طبرخون	بید سُرخ
سرون	شاخ گاؤ	طُغرل	نوعے از مرغ شکاری
سفت	دوش	قُرطہ	گزنہ
سیب	دنبالہ تازیانہ	کاتوزی	زاہد
دواج	لحاف	کانوشہ	دیگچہ
دیدار	چشم و رخ، و پدیدار گشتن	کشکین	نانِ جویں
رده	صف	کفج	آبِ دہن
رزمہ	بقچہ	کلک	کمان
رستہ	صف زدہ	کنارنگ	بزرگ قوم
رفت آوری	آمد و رفت کردن	کندآور	پہلوان
رنج	رنگ	کوہسر	کوہسار
روزبان	دربان	گردگاہ	تہی گاہ و کمر
روسپی	فاحشہ	گردگان	مرہون
رویک	غلامِ امرد	گریغ	گریز
رہین	مکار	گشن	لسیارہ
زحیر	پیچ و تاب		

معنے	لفظ	معنے	لفظ
بادو فہم	دیر	مہار شتر	مایار
ماہچہ عَلَم	منجوق	طعنہ وظرافت	مزیح
نعرہ	ویلہ	عرض لشکر	سان
دیگ سنگی	ہرکارہ	سنگین وگراں	مدت
ہرزماں	ہزمان	بے باک	ناباک
مانند	ہمانند	صفِ لشکر	سخ
جان	ہوش	ہنوز	نوز
چہار دندان پیشین	یشک	پہلوان	نیو
جانور درندہ		نگہبان	دان

اسدی طوسی

اقلیم سخن (رزم) کا یہ دوسرا تاجدار ہے۔ صاحب آتشکدہ نے اس کو سلطان محمود کی سبعہ سیارہ میں شمار کیا ہے۔

اسدی کا نام علی بن احمد اور کنیت ابو نصر ہے، سلسلۂ نسب شاہان عجم سے ملتا ہے۔ تحصیل علوم کے بعد عراق کا سفر کیا۔ اور ویلمیوں کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ عراق سے آذربایجان آیا، یہاں کا رئیس ابو دلف کرکری تھا۔ اس کا وزیر نہایت قدر دان علم وفن تھا۔ اُس نے اسدی سے کہا کہ فردوسی نے شاہنامہ لکھ کر عجم کو زندہ کیا۔ تم اُسی کے ہم وطن اور ہم فن ہو تم بھی کچھ یادگار چھوڑ جاؤ، اسدی نے گرشاسپ نامہ لکھ کر ہم فنی کا حق ادا کیا۔ چنانچہ ان تمام واقعات کو خود دیباچہ میں لکھا ہے۔

یکے بود سردار دنیا و دین ۔۔۔ گراں مایہ دستور شاہ زمین
بہ من گفت فردوسی پاک مغز ۔۔۔ بداد است داد سخنہائے نغز
بہ شہنامہ گیتی بیار است است ۔۔۔ وزاں نامہ نام نکوخواست است
تو ہم شہری اورا و ہم پیشۂ ۔۔۔ ہم او در سخن چابک اندیشہ
ازاں ہمرہاں نامۂ پاستان ۔۔۔ بہ نظم آر خرم یکے داستان

دولت شاہ نے لکھا ہے۔ اور اور تذکرہ نویسوں نے بھی اس کی تقلید کی ہے۔ کہ فردوسی جب غزنین سے بھاگ کر مختلف شہروں سے گزرتا ہوا۔ وطن میں آیا، اور زندگی کے دن قریب آ گئے۔ تو اسدی کو بلا کر کہا کہ شاہنامہ کا کچھ حصہ ناتمام رہ گیا ہے میرے بعد کون اس کو پورا کر سکے گا۔ اسدی نے کہا۔ جان استاد! کچھ اندیشہ کی بات نہیں ہیں اس خدمت کو انجام دوں گا، چنانچہ ایک رات دن میں چار ہزار شعر لکھ کر فردوسی کو سنائے۔ فردوسی نہایت خوش ہوا۔ اور وہ اشعار شاہنامہ میں داخل کر لئے، یہ وہ اشعار ہیں جہاں عربوں کے حملے اور ایران کی شکست کا ذکر ہے۔

لیکن ہمارے نزدیک، یہ روایت محض فرضی اور غلط ہے۔ نہ شاہنامہ ناتمام رہا تھا نہ اسدی فردوسی کا استاد تھا، نہ فردوسی، اسدی سے ایسی فرمایش کر سکتا تھا۔ نہ ایک رات دن میں اسدی سے چار ہزار شعر لکھے جا سکتے تھے، ان سب پر مستزاد یہ کہ اسدی کے انداز سے، ان اشعار کو مطلقاً مناسبت نہیں۔

شاعری پر اسدی کا ایک احسان یہ ہے کہ قصائد میں جدت کا راستہ نکالا، اکثر قصائد میں مناظرات لکھے ہیں۔ اور یہ اُس کا خاص ایجاد ہے۔ وہ دو چیزوں کو لے کر باہم مناظرہ کراتا ہے۔ ہر ایک کی طرف سے ترجیح کے دلائل پیش کرتا ہے۔ اور بالآخر بادشاہ کی مدح کی طرف گریز کرتا ہے۔ چنانچہ رات دن، زمین آسمان، گبر و مسلم، قوس و رمح، شب و روز کا مناظرہ مجمع الفصحا میں نقل کیا ہے۔

اسدی سب سے پہلا شخص ہے جس نے مصطلحات فارسی پر کتاب لکھی، چنانچہ اس کے خاص ہات کا لکھا ہوا نسخہ ویانا کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ سلگین نے اس کتاب کو چھاپ کر شائع بھی کیا ہے[۲]۔

کلام پر رائے — **اسدی** اگرچہ فردوسی وغیرہ کا ہمعصر ہے لیکن تشبیہات اور مضمون بندی کے لحاظ سے نظامی سے دوش بدوش ہے۔ ایک جنگل کی تعریف میں لکھتا ہے۔

[۱] اسدی نے گرشاسپ نامہ میں فردوسی کا نام جس طرح لیا ہے۔ اس سے قطعی ثابت ہوتا ہے۔ کہ فردوسی اس کا شاگرد نہ تھا، یہ شعر ملاحظہ ہو۔

به شهنامه فردوسی نغز گوے ۔۔۔ که از پیش گویندگان برد گوے

[۲] مسٹر براؤن کی کتاب جلد دوم تذکرہ اسدی ۱۲

چناں تنگ و درہم یکے بیشہ بود
اس طرح کا گھنا جنگل تھا
کہ رفتن دراں کار اندیشہ بود
کہ اُس میں صرف خیال چل سکتا تھا

درختانش سر در کشیدہ بسر
اس کے درخت اس طرح پاس پاس تھے
چو خطِ دبیراں یک اندر دگر
جس طرح خوشنویسوں کی سطریں ہوتی ہیں

ہمہ شاخہا تا بہ چرخ کبود
تمام شاخیں آسمان تک
بہم در شدہ تنگ چوں تار و پود
اسطرح لپٹی ہوئی تھیں جسطرح کپڑے میں تانا بانا ہوتا ہے

تو گفتی سپاہی است در جنگ سخت
یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فوج لڑائی میں معروف
وزو ہست گُردے گر ہر درخت
ہر درخت پہلوان ہے

کماں شاخہاشاں ہمہ گُرز بار
شاخیں، کمان تھیں، گُرز پھل تھے
سپر برگہا و سناں نوک خار
پتے سپر، اور کانٹے برچھیاں تھیں

نتابیدہ اندر روئے از چرخ ہور
آفتاب کبھی اس میں چمکا نہیں تھا
ز تنگی رہش پوست رفتے ز مور
اسقدر گھنا تھا کہ چیونٹی اسمیں چلتی تو اسکی کھال اُتر جاتی تھی

اس قسم کی تشبیہات، اور اس قسم کا مبالغہ، متوسطین بلکہ متاخرین کا انداز ہے۔ بایں ہمہ واقعہ نگاری اور صورت حال کے منظر دکھانے میں اسدی کو فردوسی سے کم پایہ نہیں کہہ سکتے، گرشاسپ نے جہاں اژدہا کو مارا ہے۔ اس موقع پر اژدہا کی تصویر دیکھو۔ کس طرح کھینچی ہے۔ اگلے زمانہ میں اژدہا کی تصویر جو لوگوں کے ذہن میں تھی۔ یہ تھی کہ بیس تیس گز کا لمبا ہوتا ہے۔ آگے دو بڑے بڑے دانت ہاتھی کی طرح نکلے ہوتے ہیں۔ سانس لیتا ہے تو منہ سے شعلے نکلتے ہیں۔ سر پر کانٹے کی طرح بال ہوتے ہیں جسم پر ہاتھی کے کان کے برابر چھپے ہوتے ہیں جن کو کبھی سمیٹ لیتا ہے۔ اور کبھی پھیلا دیتا ہے۔ آنکھیں ستاروں کی طرح دور سے چمکتی ہیں۔

شدہ اندر درہ ہر سوئے بنگرید
بنا گاہ آں اژدر آمد پدید

براں لشتہ او، سینہ سایان گہیں
ز بجہیدنش جنبش اندر زمیں

چو تاریک غارے دہن کردہ باز
دو دندانش چوں شاخ گوزناں دراز

دہان و نفس دود و آتش بہم
دہاں کورہ آہن و شعلہ دم

ز تف دہانش، دل خارہ موم
ز زہر دمش باد گیتی سموم

گرمی ۱۲ پتھر ۱۲

بہ دُود نفس ہر دو چشمش ز نور	درخشاں چو در شب ستارہ ز دوک
گرہ در گرہ خم آدوم تا بہ پشت	ہمہ سرش چوں خار و موہا درشت
پشیزہ پشیزہ تن از رنگ نیل	ازاں ہر پشیزہ بہ پہنا از گوش پیل
گہے چوں سپر برفگندیش باز	گہے ہمچو جوشن کشیدی دراز
چو بر کوہ مو دسے، از تن سنگ رنگ	بفرسنگ رفتے چکاکاک سنگ

غرض شاہنامہ اور سکندر نامہ کی بیچ کی کڑی گرشاسپ نامہ ہے نظامی نے غالباً گرشاسپ نامہ کو سامنے رکھ کر سکندر نامہ لکھا ہے"

منوچہری

دامغان وطن ابوالنجم کنیت احمد نام شصت کلہ لقب اور منوچہری تخلص تھا۔ دولت شاہ نے اس کو بلخی لکھا ہے، چونکہ نہایت دولتمند تھا اس لئے شصت کلہ کے لقب سے پکارا جاتا تھا، امیر منوچہری بن شمس المعالی امیر قابوس بن وشمگیر جو مشہور رئیس اور جرجان کا فرمانروا تھا۔ اور ۳۸۶ھ میں تخت نشین ہوا تھا۔ یہ اس کے دربار میں ملازم تھا۔ اِس مناسبت سے منوچہری تخلص کیا تھا۔ ۴۱۱ھ میں منوچہری نے انتقال کیا تو یہ غزنین میں آیا۔ اور عنصری کی مدح میں قصیدہ لکھا جو اس کے دیوان میں موجود ہے مدح کے چند اشعار یہ ہیں۔

اوستاد اوستادانِ زمانہ عنصری	عنصرش بے عیب و دل بے غش و دینش بے فتن
شعر او چوں طبع او ہم بے تکلف ہم بدیع	طبع او چوں شعر او ہم با ملاحت ہم حسن
کو جریر و کو فرزدق کو ولید و کو لبید	روبہ و عجاج و دیک الجن و سیف ذویزن
گو فراز آیند و شعر اوستادم بشنوند	تا غریزی روضہ بینند و طبیعی نسترن
شعر او فردوس را ماند کہ اندر شعر او	ہر چہ در فردوس ما را وعدہ کردہ ذوالمنن
کوثر است الفاظ عذب او و معنی سلسبیل	لفظ او انہار خمر و وزنش انہار لبن

تذکرہ نویس لکھتے ہیں۔ کہ اس نے عنصری کی شاگردی بھی اختیار کی لیکن یہ بھی خوشامد کا ایک پہلو تھا جس طرح قلعہ میں لوگ بہادر شاہ سے گلستان پڑھنے جایا کرتے تھے۔ بہرحال عنصری نے اسکو دربار شاہی میں پہنچایا۔ اور سلطان محمد ابن محمود کے حضور میں

ترخانی کا منصب ملا یعنی جب چاہتا دربار میں چلا جاتا کچھ روک ٹوک نہ تھی محمد چند روز[1] کی سلطنت کے بعد یعنی ۴۲۱ھ میں گرفتار ہو کر قید ہوا، اور اُس کے بھائی سلطان محمود نے تخت سلطنت پر جلوس کیا، منوچہری کے اکثر قصائد مسعود ہی کے مدح میں ہیں مسعود بھی اس کا نہائت قدردان تھا۔ یہاں تک کہ دربار کے شعرا اس پر رشک کرتے تھے۔ ایک قصیدہ میں منوچہری نے فخر کے لہجہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ تقی کاشی نے خلاصۃ الافکار میں لکھا ہے کہ منوچہری عنصری و عسجدی، کا ہمعصر تھا۔ اور دربار میں عنصری کے سوا اور تمام شعرا یہانتک کہ فردوسی اور فرخی تک اس سے نیچے بیٹھتے تھے لیکن منوچہری کے دیوان میں سلطان محمود کی شان میں کوئی قصیدہ نہیں۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ سلطان محمود کے مرنے کے بعد غزنین میں آیا ہے۔ اور اس لئے فردوسی کا ہم بزم نہیں ہو سکتا تھا۔

منوچہری فطرتاً شاعر تھا۔ نہائت سنی میں لوگ مشکل مشکل طرحیں دیتے تھے۔ اور وہ برجستہ ان طرحوں میں قصیدے اور غزل کہتا تھا[2]۔

دیوان جو آج موجود ہے۔ اس میں تین ہزار شعر ہیں علی قلی خاں ہدائت نے بڑی تلاش سے بہم پہنچایا اور شائع کیا۔ فرانس میں اس کا دیوان نہائت اہتمام اور تکلف سے چھپا ہے۔ فرہنگ بھی ہے۔ اور تمام مشکل اشعار کو حل کیا ہے۔ یہ نسخہ میری نظر سے گزرا ہے۔ اور میں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ منوچہری نے ۴۳۲ھ میں انتقال کیا۔

کلام کی خصوصیت منوچہری کے کلام میں اکثر ایسے خصوصیات ہیں جن سے اس کے معاصروں کا کلام بالکل خالی ہے۔ بلکہ مابعد کے شعرا میں بھی ان کے نمونے خال خال پائے جاتے ہیں۔

(۱) سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شعرائے عرب کی زیادہ تر تقلید کرتا ہے اس نے متعدد قصیدے عربی قصائد کے بحر اور قافیہ میں لکھے ہیں۔ ابو الشیص کا ایک قصیدہ ہے۔

سالقاک واللیل ملقی الجران عذاب بنوح علی غصن بان

منوچہری اس کے جواب میں لکھتا ہے۔

---

[1] مجمع الفصحا [2] مجمع الفصحا بحوالہ لب الباب عوفی یزدی۔

جہانا چہ بد مہر و بد خو جہانی　　　چو آشفتہ بازار بازار گانی

مزہ وہاں آتا ہے۔ جہاں چند شعرائے عرب کے نام لے کر کہتا ہے۔ کہ فلاں شاعر نے خلیفہ اور امیر کی مدح میں زور کے قصیدے لکھے اور ایسے بڑے بڑے صلے حاصل کئے، میں بھی اسی طرح تیرے دربار میں آیا ہوں۔

شنیدم کہ اعشیٰ بہ شہر یمن شد　　　سوے سودۃ بن علی الیمانی
برو خواندہ شعرے بالفاظ تازی　　　بہ شیریں معانی و شیریں زبانی
یکے کارواں اشترکش دادش　　　ہر اشتر بسان (کوہ ۱۲) گُئے از کلانی
سوئے تلوح عمرابناں ہم بدینساں (یعنی توی ۱۲)　　　بیاید منوچہری دامغانی

دیکھو تخلص کس لطف سے کھپایا ہے۔

آخر میں تصریح کی ہے کہ یہ قصیدہ میں نے ابوالشیص کے جواب میں لکھا ہے ساتھ ہی قصیدہ کا مطلع بھی تضمین کیا ہے۔

بداں وزن ایں شعر گفتم کہ گفتہ است　　　ابوالشیص اعرابی باستانی

سالقاک والليل ملتقى الحران　　　غراب ينوح على غصن بان

ابن المعتز کا ایک قصیدہ، سادات علوی کے معارضہ میں ہے۔

ونحن بنو العم اولی بہا

اس قصیدہ پر منوچہری نے قصیدہ لکھا ہے۔ اور لطف یہ کیا ہے کہ عربی ضمیر کی جو ھا ہے اس سے فارسی میں جمع کا کام لیا ہے۔

چو از زلف شب باز شد تابہا　　　فرو مرد قندیل محراب ہا
سپیدہ دم از بیم سرمائے سخت　　　بپوشید بر کوہ سنجاب ہا
بمیخوارگاں ساقی آواز داد　　　فگندہ بزلف اندروں تاب ہا
ببانگ نخستیں از یں خواب خوش　　　بجستیم ما ہمچو طبطاب ہا
منجم ببام آمد از نورے　　　گرفت ارتفاع سطرلاب ہا

فارسی کے اور شعراء کے برخلاف منوچہری کو شعرائے عرب کے اکثر دیوان حفظ یاد تھے اور اس پر فخر کرتا تھا۔ ایک قصیدہ میں حاسد کو خطاب کر کے لکھتا ہے۔

من بسے دیوان شعر تازیاں (عرب ۱۲) دارم زبر　　　تو ندانی خواند الا ھبی بصحنک فاصبحین

یعنی مجھ کو عرب کے بیسوں دیوان ازبر ہیں　　اور تو سبعہ معلقہ کا یہ قصیدہ بھی نہیں پڑھ سکتا

الاھبی بصحنک فاصبحینا　　ولا تبقی خمور الاندرینا

عربی پر اس کو یہ قدرت حاصل تھی کہ اپنے کلام میں عربی قصائد کی طرف اشارے کرتا ہے۔ اور ان کے وہ ٹکڑے جن کے نام سے وہ قصیدے مشہور ہیں بے تکلف تضمین کرتا جاتا ہے۔ ایک قصیدے میں لکھتا ہے۔

امراءالقیس ولبید واخطل واعشی وقیس	برطلل ہا نوحہ کردندے وبر رسم تلی
شاعری عباس کرد وحمزہ کرد وطلحہ کرد	جعفر وسعد وسعید وسید ام القری
آنکہ گفتست آذنتنا آنکہ گفت الاھبی	آنکہ گفت السیف اصدق آنکہ گفت ابلی الھوی

اس شعر میں چار قصیدوں کے مطلعوں کی طرف اشارہ ہے یعنی

آذنتنا ببینہا اسماء　　(سبعہ معلقہ کا قصیدہ ہے)

الاھبی بصحنک فاصبحینا　　(سبعہ معلقہ)

السیف اصدق انباءً من الکتب　　(ابوتمام کا مشہور قصیدہ ہے جو معتصم کی مدح میں عموریہ کی فتح کی تقریب پر لکھا گیا تھا)

ابلی الھوی　　(متنبی کا قصیدہ ہے)

اس کے کلام میں اکثر عربی تلمیحات ہیں یہاں تک کہ محض فارسی داں اس کے کلام سے پورا لطف نہیں اٹھا سکتے، ایک قصیدہ کا مطلع ہے۔

نورہ زیر نگاشت بصحرا دشک دے	تماثیل ہائے عزہ وتصویرہائے مے

عرب میں لیلی وشیریں کے بجائے جن معشوقوں کا نام آتا ہے، لیلے، سلمے، رباب، عزۃ، امیہ، بثینہ، وغیرہ ہیں، عزۃ، کثیر کی معشوق تھی، جو بنوامیہ کے زمانہ کا مشہور شاعر تھا، میہ، ذوالرمہ کی معشوق تھی۔ اسی میہ کو منوچہری نے قافیہ کی ضرورت سے مے کر دیا ہے۔ ایک اور قصیدہ میں لکھتا ہے۔

باد بزیں صناعت بانی کند ہمے	مرغ حزیں روایت معبد کند ہمے

معبد بنوامیہ کے زمانہ کا مشہور مغنی تھا

روایت کردن کے معنے گانے کے ہیں، مرغ حزیں سے بلبل مراد ہے یعنی بلبل معبد کے راگ گاتی ہے۔

زمین محراب داؤد ست ازبس سبزہ بیند ازو	کشادہ مرغکاں برشاخ چوں داؤد حنجرہا

با نظم ابن رومی و با نثر اصمعے — با شرح ابن جنی و با نحو سیبویے
آں جایگاہ کانجمن سرکشاں بود — تو بو فلانی آں دگراں انبہ دبی

(۲) اس کے کلام کی بڑی خصوصیت برجستگی روانی اور شستگی ہے۔ یہ جوہر اگرچہ اس کا عام خاصہ ہے لیکن اس کے ساتھ اور مختلف باتیں جمع ہو گئیں ہیں جن سے اور زیادہ شیرینی اور دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اکثر شگفتہ ردیفیں پیدا کرتا ہے کہیں کہیں ممدوح کے نام کو ردیف کرتا ہے۔ اور وہاں گریز کے موقع پر ممدوح کے نام سے خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، بعض جگہ کئی کئی شعر تنسیق الصفات[1] کی صنعت میں لکھتا جاتا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریشم پر موتی ڈھلکتے چلے آتے ہیں۔

ماہ رمضان رفت و مرا رفتن آں بہ — عید رمضاں آمد و المنۃ للہ
بر آمدن عید و برون رفتن روزہ — ساقی بدہم بادہ بر باغ و بہ سبزہ
بر نہ بکفِ دستم آں جام چو کوثر — جامِ دگر آور بکف دست و گرنہ
من مے نخورم تا نبود بر دو کفم جام — یا ساتگنی بر سرِ خوانم نہ نہی سہ
چوں مے دہی نوش ہمے گوئی و ہمی باش — چوں مے نخورم جام ہمے گیر و ہمے جہ

دلم اے دوست تو دانی کہ ہوائے تو کند — لب من خدمتِ خاکِ کفِ پائے تو کند
رائگاں مشک فروشی نکند ہیچ کسے — در کند، ہیچ کسے زلف دوتائے تو کند
چہ دعا کردی جاناں کہ چنیں خوب شدی — تا چو تو چاکرِ تو نیز دعائے تو کند
از لطیفی کہ توئی اے بت و از شیرینی — ملک مشرق ہمہ است گر رائے تو کند
ایں جہاں کرد برائے تو خداوند جہاں — واں جہاں نیز برانم کہ برائے تو کند
صنما! از تو دلم ہیچ شکیبا نہ شود — اگر امروز شود بیشک فردا نہ شود
تجربت کردم و دانا شدم از کارِ تو من — تا مجرب نہ شود، مردم دانا نہ شود
نہ کشم ناز ترا و نہ دہم دل بہ تو ہم — تا مرا آشتی و مہرِ تو پیدا نہ شود
گوئی از دو لب من بوسہ تقاضا چہ کنی — وام خواہی نہ بود کہ بتقاضا نہ شود
بہ مدارا اوّل تو نرم کنم، و آخر کار — بہ درم نرم کنم گر بہ مدارا نہ شود
وگر ایں عاشق نومید شود از درِ تو — از درِ خسرو شاہنشہ دنیا نہ شود

[1] تنسیق الصفات کی مثال گھوڑے کی تعریف میں آئے گی۔

صنما گر و سرم چند ہمے گردانی	زشتی از روئے نکو زشت بود گردانی
یا بکن آنکہ شب و روز ہمے وعدہ دہی	یا مکن وعدہ ہر آں چیز کہ مے نتوانی
دلِ من بُردی و از خویشتنم دور کنی	بر نیاید صنما! کار بدیں آسانی
مہربانی نہ کنی بر من و مہرم طلبی	نہ دہی دادِ من و دادِ زمن بستانی
بیوفائی کنی و نادان سازی تن خویش	نیستی اے بت یکبارہ بدیں نادانی
از تو مارا نہ کنارہ نہ پیام و نہ سلام	مکن اے دوست کہ کیفر بری و درمانی
مکن اے دوست کہ بیداد نشانی نگذاشت [برگشت]	عدل باز آمدہ با بو الحسن عمرانی
نوروز روزگار و نشاط است و ایمنی	پوشیدہ ابر دشت و دیبائے ارمنی
خیل بہار خیمہ بصحرا بروں زند	واجب کند کہ خیمہ بصحرا بروں زنی
بر گل ہمے نشینی و بر گل ہمے خوری	بر خُم ہمے خرامی و بر دن[۱] ہمے دنی
دُر است نا خریدہ و مشک است [رائگاں]	ہرچند بر فشانی و ہرچند بر چنی
شاخ بنفشہ بر سرِ زانو نہادہ سر	مانندہ مخالفِ بوسہل زوزنی
باد نوروزی ہمے در بوستاں ساحر شود	تا بہ سحرش دیدۂ ہر گلبنے ناظر شود
باد ہمچوں دزد گرد ہر سرے دیبار ہا	بوستاں آراستہ چوں کلبۂ تاجر شود
نوبہار ایں جامۂ صد رنگ پوشد تا مگر	دوستارہ و دستاں خواجہ بوطاہر شود

منوچہری مناظرِ قدرت کا نقشہ نہایت خوبی سے کھینچتا ہے۔ صحرا، سبزہ، بادل سیلاب، ہوا۔ وغیرہ وغیرہ کے اوصاف اکثر قصائد کی تمہید میں لکھے ہیں۔ اور اس خوبی کر لکھے ہیں۔ کہ اگر اس قسم کے اشعار الگ جمع کر دیئے جائیں۔ تو نیچرل شاعری کا ایک عمدہ مجموعہ تیار ہو جائے گا۔

ایک قصیدہ میں سفر کا حال لکھتے لکھتے آب و ہوا کے طوفان کا حال لکھا ہے۔ اس موقعہ پر ہوا کے جھونکے، بجلی کی چمک، بادلوں کی گرج، پانی کے سیلاب کا نقشہ دیکھو کس طرح کھینچتا ہے۔

بر آمد بادے از اقصائے بابل	ہبوبش خارہ در و بارہ افگن
تو گفتی کز ستیغ [چوٹی ۱۲] کوہ سیلی	فرو بارد ہمے احجار صد من [قلعہ ۱۲]

۱؎ دن یعنی خم شراب دنی، دنیدن سے مشتق ہے۔ جس کے معنے اکڑ کے چلنے کے ہیں۔

ز روے بادیہ برخاست گردے	کہ گیتی کرد ہمچوں خز ادکن
چناں کز روے دریا بامداداں	بخار آب خیزد (کہرا ۱۲) ماہ بہمن (پالا ۱۲)
برآمد زاغ رنگ و مارپیکر	یکے میغ از ستیغ کوہ قارن
چناں چوں صد ہزاراں خرمن تر	کہ عمداً در زنی (بادل ۱۲) آتش بہ خرمن
بجستے ہر زماں از تیغ برقی	کہ کردے گیتی تاریک روشن
خروشی بر کشیدے تند تندر (کڑک ۱۲)	کہ موئے مردماں کردے چو سوزن
توگفتی نائے رومی ہر زمانے	بگوش اندر دمیدے یک دمیدن
بلرزیدے زمیں از زلزلہ سخت	کہ کوہ اندر فتادے زو بگردن
توگفتی ہر زمانے ژندہ پیلے	بلرزاند زرنج پشتگان تن
فرو بارید بارانے زگردوں	چناں چوں برگ گل بارد زگلشن
و یا اندر تموزی مہ ببارد	جراد منتشر بربام و برزن
زصحرا سیلہا برخاست ہر سو	(ٹڈی ۱۲) دراز آہنگ و پیچاں (گلی وکوچہ ۱۲) و زمین گن
چوہنگام عزائم زی معزم	تبک (بیک ۱۲) خیزند ثعباناں (اژدہا ۱۲) زمکمن
نماز شامگاہاں گشت صافی	ز روئے آسماں ابر معکن

بہار کی تعریف شعرائے ایران کا ایک عام موضوع ہے جس پر ابتدا سے آج تک سب طبع آزمائیاں کرتے آئے ہیں۔ لیکن قدماء اور متاخرین میں سے کسی نے منوچہری کی طرح نیچر کی تصویر نہیں کھینچی، اس نے سینکڑوں جگہ بہار کا نقشہ دکھایا ہے۔ اور ہر جگہ گویا فطرت کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ وہ اور شعرا کی طرح صرف گل و بلبل پر قناعت نہیں کرتا، بلکہ ایک ایک پتے، پھول، پھل، شاخ، درخت، اور ان سب سے بڑھ کر جانوروں اور پرندوں کی صورت اور حالت دکھاتا ہے۔

پرندوں کی حالت

کبکان بے آزار کہ بر کوہ بلند اند	بے قہقہ یکبار ندیدم کہ بخندند
جز خار بنان[1] جا بنگہ خود نہ پسند ند	بر پہلو از یں نیمہ بداں نیمہ بدندند[2]

[1] خار بنان۔ خارزار

[2] دندند۔ مے خرامند۔

ہر ساعتکی سینہ بمنقار بر زنند
چوں جزع[1] بر دسینہ و چوں بُسد[2] منقار

شبگیر (وقت صبح ۱۲) ز گل فاختگاں بانگ بر آرند
پارۂ سیہ (یعنی ہلال ۱۲) شبہ از بر گردن بنگارند
گوئی کہ سحرگاہ ہمے خواب گزارند
از غالیہ بے آنکہ ہمے غالیہ دارند

صد بار بروزی در پرہا[3] بشمارند
چوں نیم و بیری کہ غلط کردہ[4] باشمار

ہر ساعتکی بط سخنے چند بگوید
در آب کند گردن و در آب بروید
در آب جہد جامہ و گر بار بشوید
گوئی کہ مگر چیزے در آب بجوید

چوں سینہ بجنباند و یک لخت بپوید
از ہر سر پرش بجہد صد دُرِ شہوار

آمد نوروز دہم از بامداد
باز جہاں خرم و خوب ایستاد
آمدنش فرخ و فرخندہ باد
مُرد زمستان و بہاراں بزاد

ز ابر سیہ روے سمن بوئے راد
گیتی گردید چو دار القرار

بر روئے گل شرخ بیار استند
کبکاں بر کوہ بتک خواستند
زلفکِ شمشاد بپیراستند
فاختگاں ہمبرِ بنشاستند

بلبلکاں زیر ستا خواستند
(زیر و بم ۱۲)
نائے زناں بر سر شاخ چنار

طوطیگان بر گلگان تاختند
گورخراں میمنہا ساختند
آہوکاں گوش برافراختند
زاغان گلزار بپرداختند

بے دلکان در پے دل تاختند
باژکان چنگل و فنند ھار

مُرغ نہ بینی کہ چہ خواند ہمے
دشت نہ بینی بچہ ماند ہمے
میغ نہ بینی کہ چہ راند ہمے
دوست نہ بینی چہ ستاند ہمے

[1] جزع مہرہ سلیمانی کو سفید و سیاہ باشد [2] بُسد۔ یاقوت [3] کہتا ہے کہ قمریاں اس طرح بار بار اپنے پروں کو گنتی ہیں۔ (کھوسی ہیں) اس طرح کہ نو آموز حساب داں بار بار حساب بھول جاتا ہے۔ اور ہر کاغذ کو الٹتا ہے [4] اشمار۔ شمار۔

باغ بستان را بنشاند ہمے
بر سمن و نسترن و لالہ زار

کردہ گلو پر ز باد قمری سنجاب پوش
بلبلکان با نشاط قمریکان با خروش

کبک فرو ریختہ مشک بسوراخ گوش
در دہن لالہ مشک در دہن نحل نوش

سوسن کافور بوئے گلبن گوہر فروش
از مہ اردی بہشت دہر بہشت برین

چوک ز شاخ درخت خویشتن آویختہ
ابر بہاری ز دور اسپ بر انگیختہ

زاغ سیہ پر و بال غالیہ آمیختہ
وز سم اسپ سیاہ لولو تر ریختہ

در دہن لالہ باد ریختہ و بیختہ
ریختہ مشک سیاہ بیختہ در ثمین

سرو سماطی کشید بر دو لب جوئبار
مرغ نہاد آشیاں بر سر شاخ چنار

چوں دو رده چتر سبز در دو صف کارزار
چوں سپر خیزراں بر سر مرد سوار

گشت زنگاریں تدرو پنہاں در کشت زار
ہمچو عروسی عزیز در بن دریائے چین

گوئی بط سفید جامہ بصابوں زدہ است
بر گل تر عندلیب گنج فریدوں زدہ است

کبک دری ساق پائے در قدح خوں زدہ است
لشکر چین در بہار در کہ ہاموں زدہ است

لالہ سوئے جوئبار خرگہ بیروں زدہ است
خرگہ او سبز گوں خیمہ او آتشین

بادل جب برستے ہیں تو کبھی قطرہ افشانی ہوتی ہے۔ کبھی ننھی ننھی پھوار پڑتی ہے۔ کبھی جھڑی لگ جاتی ہے، سبزہ پر، مختلف قسم کے پھولوں پر، تالاب کی سطح پر، بوندوں کے پڑنے سے طرح طرح کی صورتیں پیدا ہو کر ہر ایک کا الگ الگ سماں نظر آتا ہے۔ منوچہری نے ایک موقع پر تشبیہات کے پیرائے میں اس کی تصویر کھینچی ہے۔

آں قطرہ باراں بیں از ابر چکیدہ
آویختہ چوں ریشہ دستارچہ سبز
یا ہمچو زبر جد گوں یک دستہ سوسن

گشتہ سر ہر برگ ازاں قطرہ بہ آثار
سیمیں گرہے بر سر ہر ریشہ دستار
اندر سر ہر سوسن یک لولوئے شہوار

وان قطرۂ باران کہ فرو بارد شبگیر
گوئی بہ مثل بیضۂ کافور ریاحی
وان قطرۂ باران کہ فرود آید از شاخ
گوئی کہ مشاطہ ز بر فرق عروساں
وان قطرۂ باران کہ چکد از بر لالہ
پنداری بتخالہ خردک بدمیداست
وان قطرۂ باران کہ بر افتد بہ سر خوید
وان دائرہ ہا بنگر اندر شمر آب
چوں مرکز پرکار است آں قطرۂ باران
ہر گہ کہ ازاں دائرہ انگیزد باران
گوئی علمی از سقلاطون سپید است
وانگہ کہ فرو بارد باراں بہ قوت
گردد شمر ایدون چو یکے دام کبوتر

بر طرف چمن بر دو رخ سرخ گلنار
بر بیرم حمرا بہ پراگندستش عطار
بر تازہ بنفشہ نہ بتعجیل بہ ادرار
باورد ہمے ریزد باریک بہ مقدار
گرد و طرف لالہ ازاں باراں بنگار
بر گرد عقیقین دو لب دلبر عیار
چوں قطرۂ سیماب بر افتادہ بہ زنگار
ہر گہ کہ دراں آب چکد قطرۂ امطار
واں دائرہ آب بسان خط پرکار
وز باد در و چین و شکن خیزد ہر بار
وز باد جہندہ متحرک شدہ بسیار
گیرد شکن آب دگر صورت و آثار
دیدار زیک حلقہ بسے سیمیں منقار

سراپا نگاری

حلیہ نگاری یعنی کسی خاص چیز کا سراپا لکھنا اور اس کے تمام اوصاف کا بیان کرنا منوچہری اس کا گویا موجد ہے۔ قصائد میں شعرا بادشاہ کی مدح کے ساتھ تلوار، گھوڑے وغیرہ کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ عبد الواسع جبلی اور عرفی شیرازی اس میدان میں سب سے آگے ہیں لیکن ان کے ہاں محض خیالی باتیں ہیں۔ بخلاف اس کے منوچہری نے تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ اس کے ساتھ اکثر صنعت تنسیق الصفات کا التزام کیا ہے۔ اور وہاں اسکی قدرت زبان کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہ بے تکلف موزوں اور متناسب الفاظ کا انبار لگاتا چلا جاتا ہے۔

گھوڑا

جند اسپے مخملی بر کبے تازی نژاد
رام زین و کش خرام و خوش عنان و تیز گام
پشت اوی و دست وے گوش اوی و گردنش
گاہش اندر شیب تازم گاہ تازم بر فراز
دیر خواب و زود خیز و تیز سیر و دور بیں
سخت پائے و ضخم ران و راست دست و گرد سم

نعل او پروین نشان و سم او خارا شکن
پیچ نورد و راہ جوی و سیل بر و کوہ کن
چوں کمان و چوں رماح و چوں سنان و چوں مجن
چوں کسے کو گاہ بازی بر نشیند بر رسن
خوش عنان و کش خرام و پاک زاد و نیکخوی
تیز گوش و پہن پشت و زم چرم و خورد موی

ابر سیر و بادہ گرد و رعد بانگ و برق جہ — کوہ کوب و سیل بُرد و شخ نورد و راہ جوی
گور ساق و شیر زہرہ یوز تاز و عزم تگ — پیل گام و گرگ سینہ رنگ تاز و گرگ پوی
تیز چشم آہن جگر فولاد دل کیمخت لب — سیم دنداں چاہ بینی نادہ کام و لوح روی
نیزۂ و گرز و کمند و ناچخ و تیر و کماں — گردن و گوش و دم و سم و دہان و ساق اوی
ببر جہ، باد گزر، یوز دو، و کوہ فرار — غیر تگ، پیل قدم، گور دو آہو پروانہ
گوش و پہلو و میان و کتف و جبہہ و ساق — تیز فربی و نزار و قوی و پہن و دراز
رہ، بُرو شخ شکن، و شیر دل، و بیر عناں — خوش رو، و سخت سم و پاک تن، و جنگ آغاز

منوچہری نے اگرچہ کوئی مثنوی نہیں لکھی جس سے واقعہ نگاری کی ترقی کا قدم آگے بڑھتا لیکن اکثر قصائد کی تمہید میں وہ واقعہ نگاری کا پیرایہ ڈھونڈھ لیتا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی مسلسل داستان لکھ رہا ہے، ان موقعوں پر اس کی قوت بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض مداحی کے لئے قصیدہ نہیں کہتا۔ بلکہ زبان کی ترقی دینے کو پیش نظر رکھتا ہے۔ ایک قصیدہ میں عرب کے انداز پر قافلہ کی روانگی، محبوب کی رخصت، اور سفر کے حالات لکھے ہیں۔

الا یا خیمگی خیمہ فرد ہل — کہ پیش آہنگ بیروں شد زمنزل
بتیرہ زن بزد طبل نخستیں — شتر باناں ہمے بندند محمل
نماز شام نزدیک است امشب — مہ و خورشید را بینم مقابل
ولیکن ماہ دارد قصد بالا — فرو شد آفتاب از کوہ بابل
چناں دو کفۂ زریں ترازو — کہ ایں کفّہ شود زاں کفّہ مائل
نگار من چو حال من چناں دید — بیارید از مژہ باران و وابل (جھڑی ۱۲)
بیامد او فتاں خیزاں برِ من — چو آں مرغے کہ باشد نیم بسمل
دو ساعد را حمائل کرد بر من — فرو آویخت از من چوں حمائل
چو برگشت از من آں معشوق مشوق — نہادم صابری را سنگ بر دل
نگہ کردم بہ گرد کارواں گاہ — بہ جائے خیمہ و جائے رواحل (کجاوہ ۱۲)
نہ وحشی دیدم آنجا و نہ انسے — نہ راکب دیدم آنجا و نہ راجل (پیادہ ۱۲)
نجیب خویش را دیدم بہ یکسو (گھوڑا ۱۲) — چو دیوے دست و پا اندر سلاسل

کشادم ہر دو زانو بندش از بند	چو مرغے کش کشاید از حبائل
بر آوردم زمامش از بنا گوش	فرو ہشتم ہویدش تا بہ کاہل
چو مساحی کہ پیماید زمیں را	بر پیمودم بپایئے او مراحل
ہمے رفتم شتاباں در بیاباں	ہمے کردم بیک منزل دو منزل
ہمے بگداخت برف اندر بیاباں	تو گوئی دارد دشس بیماری سل
چو پاسے از شب دیر نارہ بگزشت	بر آمد شعریاں از کوہِ موصل
رسیدم من فرار کارواں تنگ	چو کشتی کو رسد نزدیک ساحل
جرس دستاں گوناگوں ہمیزد	بساں عندلیبے از عنادل
زنوک نیزہ ہائے نیزہ داراں	شدہ وادی چو اطراف سنابل
نہیب خویش را گفتم سبکتر	الا یا دستگیر مرد فاضل
بچر کِت عنبریں بادا چراگاہ	بچم کِت آہنین بادا مفاصل
بیاباں در نورد و کوہ بگذار	منازلہا بکوب و راہ بگسل
فرود آور بدرگاہ وزیرم	فرود آوردن اعشی بہ باہل

اقسامِ سخن میں سے منوچہری کے مسمطات مشہور ہیں۔ وہ درحقیقت اس طرز کا موجد ہے۔ اور خود بھی اس کو اس پر ناز ہے۔ چنانچہ کہتا ہے۔

طاؤس مدیح عنصری خواند	دُرّاج مسمطِ منوچہری

ان مسمطات میں اکثر جگہ واقعہ نگاری کے نئے نئے اسلوب اختیار کئے ہیں۔ ایک مسمط[۱] میں انگوروں کے پھلنے اور اُن سے شراب کھینچنے کو ایک حکائت کے پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ یعنی انگور ایک عورت ہے۔ اُس نے لڑکیاں جنی ہیں۔ انگور والا خوش ہے۔ کہ یہ میری لڑکیاں ہیں۔ اکثر آ آ کر دیکھتا ہے۔ اور خوش ہوتا ہے۔ اتفاق سے اُسے باہر جانا پڑا۔ آ کر دیکھا تو بچوں کے سُرخ سفید، چہرے سیاہ ہو گئے ہیں۔ اور اُن کے پیٹ نکل آئے ہیں۔ اس کو سخت رنج ہوا کہ یہ لڑکیاں بدکار نکلیں۔ لڑکیوں نے عذر خواہی کی، لیکن اُس نے نہ مانا اور ان کے گلے کاٹ ڈالے، اسی طرح شراب کھینچنے کی اخیر حالت تک حکائت کے پیرایہ میں بیان کی ہے۔

۱؎ مسمط میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔ جن میں سے پانچ مصرعوں کے قافیے متحد ہوتے ہیں۔

شاخِ انگور کہن دخترکاں زاد بسے ‌ ‌ کہ نہ از درد بنالید و نہ برزد نفسے
ہمہ را زاد بیک دفعہ نہ پیش و نہ پسے ‌ ‌ نہ ورا قابلۂ بود نہ فریاد رسے
ایں چنیں آساں فرزند نزیدست کسے
کہ نہ دردے بگرفتش متواتر نہ تبے

چوں نگہ کرد براں دخترکاں مادرِ پیر ‌ ‌ سیر بودند یکایک چہ صغیر و چہ کبیر
کرد شاں مادرِ ابستر ہمہ از سبز حریر ‌ ‌ نہ خورش داد مراں بچگاں را ہیچ و نہ شیر
نہ شغب کردند آں بچگان نہ ہیچ نفیر
بچۂ گرسنہ دیدی کہ ندارد شغبے

بچگانش بنہاد اندرتنِ خویش بر آب ‌ ‌ نہ جہیدند و نہ جستند ازاں بستر خواب
گرد کردند سرِین، محکم کردند بقاب ‌ ‌ رویہا یکسرہ کردند بہ زنگار خضاب
دادشاں رزبان پیوستہ شراب چو گلاب
نشد از جانب شاں غائب روز و نہ شبے

گفت پندارم کیں دخترکاں آنِ من اند ‌ ‌ چوں دل و چوں جگر و چوں تن و چوں جانِ من اند
تا بباشند دریں رز درِ مہمانِ من اند ‌ ‌ رز فردوسِ من است ایشاں رضوانِ من اند
تا دریں باغ و دریں خان و دریں ان من اند
دارم اندر سرِ شاں سبز کشیدہ شطبے

در چو بگشاد بداں دخترکاں کرد نگاہ ‌ ‌ دید چوں زنگی ہر یک را دو روئے سیاہ
جائے جائے بچہ تاباں چو زہرہ و ماہ ‌ ‌ بچۂ سرخ چو خوں و بچۂ زرد چو کاہ
سرنگونسار ز شرم و ز دستیرہ زگناہ
ہر یکے با شکمِ حاملۂ و با ناز بسے

رزبان را بہ دو ابروئے در افتادہ گرہ ‌ ‌ گفت لاحول ولاقوۃ الا باللہ
ایں بلائے بچگان در حقِ من آمدہ زہ ‌ ‌ ہمہ آبستن گشتند بیک شب کہ دمہ
نیست یکتن بمیاں ہمگان ایدر بہ
ایں چنیں زانیہ باشد بچۂ ہر عنبے

دختراں رز گویند کہ ما بے گنہیم ‌ ‌ ما تنِ خویش بدستِ بنی آدم نہ دہیم

ماہمہ سر بسر آلستن خورشید و مہیم ۔۔۔ ما توانیم کہ از خلق جہاں دور جہیم

نتوانیم کہ از ماہ و ستارہ برہیم
ز آفتاب و مہ ماں سود ندارد دہر سے

روز ہر روزی خورشید بتابد بر ما ۔۔۔ خویشتن در فگند بر تن ما د سر ما
چوں شب آید برود خورشید از محضر ما ۔۔۔ ماہتاب آید و بر چپید در پیکر ما

ویں دو تن دور نہ گردند ز بام و در ما
نکنند ہیچ کس ایں بے ادباں را ادبے

منوچہری کی خصوصیات میں ایک بڑی چیز تشبیہ کی صنعت ہے۔ جہاں کسی منظر یا حالت کا بیان کرتا ہے۔ سینکڑوں نئی تشبیہیں پیدا کرتا جاتا ہے۔ اور یہ اس کا خاص انداز ہے۔ اس بہتات کے ساتھ کوئی تشبیہ جدت سے خالی نہیں ہوتی۔ اس زمانہ تک خیالی اور فرضی تشبیہیں پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ اس لئے عموماً تمام شعرا محسوسات اور مادیات سے تشبیہ دیتے تھے لیکن وہی چند مفرد تشبیہیں تھیں۔ جو بار بار ادا ہو کر مبتذل ہو گئی تھیں۔ منوچہری کی اکثر تشبیہیں مرکب ہیں۔ اور اسکے ساتھ خاص جدت ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

آفتاب کا صبح کے وقت بتدریج طلوع ہونا۔

بکردار چراغ نیم مردہ ۔۔۔ کہ ہر ساعت فزوں گردد ش روغن

یعنی آفتاب کی روشنی اس طرح آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہے۔ کہ جس طرح ایک چراغ جو بجھ چلا تھا۔ اس میں کوئی شخص بتدریج تیل ڈالتا جاتا ہے۔

زمین کا بھونچال سے لرزنا۔

تو گفتی ہر زمانے زندہ پیلے ۔۔۔ بلرزاند زرنج پشہ گاں تن

یعنی زمین بھونچال سے اسطرح جنبش میں ہے جس طرح ہاتھی مچھروں کی اذیت دینے سے جھرجھریاں لیتا ہے۔

ہلال ۔۔۔ چناں چوں دو سر از ہم باز کردہ ۔۔۔ ز زر سرخ یک دست آور نجن

یعنی پہلی رات کا چاند اس طرح نظر آتا ہے۔ کہ گویا کسی نے طلائی کڑے کے دونوں سرے کھول دیئے ہیں۔

بید کے پتے ۔۔۔ واں برگہاے بید تو گوئی کسے بہ قصد ۔۔۔ پیکانہاے بہن زبرجد کند ہمے

بید کے پتے ایسے معلوم ہوتے ہیں۔ کہ گویا کسی نے دانستہ زمرد کے پیکاں چوڑے بنائے ہیں۔

ہُدہُد اور اسکی کلغی	بو بو یک پیکے نامہ زدہ اندر سر خویش		نامہ گہ باز کند گہ شکند بر شکنا	

ہُدہُد گویا نامہ بر ہے۔ جس نے خط کو اپنی پگڑی میں گھونس لیا ہے۔ کبھی اس کو کھولتا ہے۔ کبھی تہ کر کے لپٹ لیتا ہے۔

ہُد ہُد اکثر اپنی کلغی کو پھیلا دیتا ہے۔ اور پھر سمیٹ لیتا ہے۔

مناظر قدرت کے اشعار جو اوپر گزرے ہیں۔ ان میں بھی اکثر تشبیہات ہیں، ان کو بھی سامنے رکھنا چاہیئے۔

پانچویں اور چھٹی صدی

پانچویں صدی کے آغاز میں اگرچہ شاعری کی ترقی کی رفتار گھٹ گئی جس کی وجہ یہ تھی۔ کہ اس صدی کے وسط میں **غزنوی** حکومت کا زوال شروع ہو چلا تھا۔ اور نئی طاقتیں ابھی شباب تک نہیں پہنچی تھیں۔ لیکن صدی کے ختم ہوتے ہوتے جبکہ غزنوی سلطنت کا زور سلجوقیہ کی طرف منتقل ہو گیا، دفعتہً بحر سخن میں طوفان آگیا، سلجوقیہ کا پہلا فرماں روا رکن الدین طغرل بک تھا۔ جو محرم ۴۲۹ھ میں بمقام نیشاپور مسند نشین ہوا۔ اس سلسلہ نے اگرچہ صرف ۱۶۲ برس کی عمر پائی۔ لیکن اتنی ہی تھوڑی مدت میں جو باتیں اس نے حاصل کیں، تاریخ اسلام کو، اس سے گوناگوں اور وسیع تعلقات ہیں۔ اول تو اس سلطنت نے جو وسعت پیدا کی، ابتدائے اسلام سے آج تک کبھی کسی عہد میں نہیں ہوئی تھی۔ اسی کے ساتھ عدل و انصاف اور امن و امان کا یہ حال تھا کہ خراسان سے شام تک ایک رہرو تن تنہا سونا اچھالتا جاتا تھا۔ اور کوئی خبر پرساں نہیں ہوتا تھا۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ ایران، عراق، روم میں جو بڑی بڑی پُر زور سلطنتیں قائم ہوئیں۔ سب کی سب اسی سلسلہ کی شاخیں تھیں، ترکوں سے پہلے جو سلاطین شاہانِ روم کہلاتے تھے۔ اسی خاندان کی ایک شاخ تھے۔ سلاطین خوارزم شاہیہ جن کی شوکت و شان محتاج بیان نہیں۔ اُن کا مورث اول، یعنی **نوشتگین** اسی خاندان کا غلام در غلام تھا۔ **اتابکوں** کے متعدد خاندان جن میں سے **نور الدین** زنگی، سلطان صلاح الدین کا آقا **قزل ارسلان**، ظہیر فاریابی کا ممدوح، اور **اتابک ابوبکر بن سعد** زنگی شیخ سعدی کا مربی اور سرپرست تھا سب

اسی خاندان کے غلام، یا خدمتگار تھے۔

سلجوقیہ کی اوج شباب کا زمانہ **ملک شاہ** اور **سنجر**ؒ کا زمانہ ہے۔ اور یہی دور، فارسی شاعری کا معراج شباب ہے۔ سلجوقی شعرا کی فہرست نہائت وسیع ہے جن میں سے چند نام یہ ہیں **امیر معزی، ارزقی، لامعی**، فخرالدین اسعد، شہابی خراسانی، **عبدالواسع جبلی انوری، حسن غزنوی**، رضی الدین نیشاپوری، **ادیب صابر**، علی باخرزی۔ فتوحی مروزی، فرقدی، کافی ہمدانی، **نظامی عروضی، نظامی گنجوی**، شمس الدین خراسانی **سوزنی**، ابوالمعالی، (مجمع الفصحار کے دیباچہ میں اور بہت سے نام لکھے ہیں۔)

اِس دور کی چند خصوصیات لحاظ کے قابل ہیں۔

اِس عہد تک شاعری نے اگرچہ بے انتہا ترقی کر لی تھی، لیکن یہ ترقی صرف مضمون اور فن کی حیثیت سے تھی۔ شاعری کی زبان اب تک ٹکسالی نہ تھی، شاعری کی بنیاد سامانی حکومت میں قائم ہوئی۔ اور غزنویہ کے عہد میں اوج ترقی تک پہنچی، ان خاندانوں کے پایۂ تخت، بخارا اور غزنین تھے، جہاں کی مادری زبان، ترکی یا افغانی تھی، شعرا جس قدر تھے من حیث الاغلب سب کے سب انہیں مقامات کے رہنے والے تھے۔ جو ایران کے اصلی مرکز یعنی شیراز اصفہان و نیشاپور سے دُور تھے۔ **فرخی**، سیستانی تھا، **عنصری** بلخ کا رہنے والا تھا۔ **منوچہری** دامغان سے تعلق رکھتا تھا، **عسجدی** اور **دقیقی** مرو کے رہنے والے تھے۔ **سلجوقیہ** نے نیشاپور کو پائے تخت قرار دیا۔ اِس تعلق سے اُن لوگوں میں شاعری پھیلی جو ایران کی زبان کے اصلی مالک تھے۔ اسی کا اثر ہے کہ اس عہد کے شعرا کی زبان زیادہ لطیف شیریں، اور محاورات اور مصطلحات سے لبریز ہے۔

اِس عہد میں فارسی زبان کی ترقی کی ایک اور وجہ یہ ہوئی کہ اب تک، تمام اسلامی سلطنتوں کی علمی اور دفتری زبان عربی تھی۔ سلطان محمود اپنے ملکی اور قومی خصوصیات کا دلدادہ تھا۔ تاہم دفتر کی زبان اس کے عہد میں بھی عربی ہی رہی، فرامین اور توقیعات تک اسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ لیکن الپ ارسلان سلجوقی جب تخت نشین ہوا تو اُس نے حکم دیا کہ دفتر کی زبان فارسی کر دی جائے۔ چنانچہ دولت شاہ سلجوقی نے طبقۂ اول کے

لہ ملک شاہ ۴۶۵ھ میں تخت نشین ہوا ۴۸۵ھ میں وفات پائی۔ اس کے بعد سنجر نے اپنے بھائیوں کی طرف سے نیابۃً بیس برس تک اور پھر مستقل حکومت کی اور ۵۵۲ھ میں انتقال کیا۔

شعرا کا جہاں ذکر شروع کیا ہے تفصیل سے اس واقعہ کو لکھا ہے، یہ ظاہر ہے کہ فارسی زبان جس کے عنصر میں ترقی کا مادہ موجود تھا سلطنت کی زبان بن کر کس قدر ترقی کر گئی ہوگی۔

سلطان سنجر کی قدردانی اور فیاضی نے پھر وہی محمودی دربار قائم کر دیا۔ **امیر معزی** کو ملک الشعراء کا خطاب ملا اور بڑے بڑے شعرا پائے تخت کے شاعر قرار پائے دولت شاہ لکھتا ہے۔

اما از شعرائے بزرگ کہ در دورِ سلطان سنجر بودہ اند و مدح سلطان گفتہ اند۔ و صلہ و تربیت یافتہ، ادیب صابر است و رشید وطواط و عبدالواسع جبلی و فرید کاتب، و انوری خاورانی، و ملک عماری، و سوزنی و سید حسن غزنوی و مہستی دبیرہ کہ محبوب سلطان و ظریفہ روزگار بودہ[1]

سنجر کی شاعرانہ مذاق اور قدردانی کی داستانیں اکثر تذکروں میں مذکور ہیں، ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شاعری کی قدر و قیمت اس کے دربار میں کیا تھی۔

ایک دفعہ ارکان دولت کے ساتھ، عید کا چاند دیکھنے نکلا، سب سے پہلے ہلال پر اسی کی نظر پڑی، خوشی سے اچھل پڑا، سب کو انگلی کے اشارے سے بتایا۔ ساتھ ہی حکم دیا کہ کوئی شاعر فی البدیہہ ہلال کی تعریف میں شعر سنائے۔ معزی اس وقت تک دربار میں امیدواری کرتا تھا؛ موقع پا کر اس نے برجستہ کہا۔

اے ماہ چو ابروان یاری، گوئی نعلے زدہ از زر عیاری، گوئی	یا ہچو کمان شہریاری، گوئی در گوش سپہر گوشواری، گوئی

یعنی اے چاند، تو ابروئے معشوق ہے، یا بادشاہ کی کمان، یا سونے کا نعل، یا آسمان کے کان کا آویزہ۔

سنجر نے اسپ خاصہ اور پانچہزار درہم عطا کئے۔ معزی نے پھر برجستہ کہا۔

چوں آتش خاطر مرا شاہ بدید چوں آب یکے ترانہ از من بشنید	از خاک مرا بر زبر ماہ کشید چوں باد یکے مرکب خاصم بخشید

سنجر نے ہزار دینار کے عطیہ کے ساتھ حکم دیا کہ شاہی لقب اس کے خطاب میں شامل کیا جائے۔

چونکہ سنجر کا لقب معز الدین تھا۔ اس لئے **معزی** لقب ملا جو آج تخلص ہو کر مشہور ہے۔

[1] دولت شاہ ذکر عمعق بخاری ۱۲

ایک دفعہ سلطان **سنجر**، گیند کھیل رہا تھا، اتفاق سے گھوڑے نے شوخی کی، اور سنجر گھوڑے سے گر گیا۔ **معزی** نے برجستہ یہ رباعی پڑھی۔

شاہا ادبے کن، فلک بد خو را	کو چشم رسانید رخ نیکو را
گر گوے خطا کرد بہ چوگانش زن	ور اسپ خطا کرد بہ من بخش او را

یعنی اے بادشاہ! آسمان کو ذرا تنبیہ کر دیجئے۔ اُس نے آپ کو نظر لگا دی، اگر گیند کی خطا ہے تو چوگاں سے اُس کو ماریئے، اور گھوڑے کا قصور ہے تو میرے حوالہ فرمایئے اخیر کا مصرع دو پہلو رکھتا ہے۔ سنجر نے گھوڑا معزی کو عنایت کیا، معزی نے دوبارہ رباعی پیش کی۔

رفتم بر اسپ تا بہ جرمش بکشم	گفتا کہ نخست بشنو ایں عذر خوشم
نے گاؤ زمینم کہ جہاں بر گیرم	نے چرخ چہارمیں کہ خورشید کشم

یعنی میں نے گھوڑے کو سزا دینی چاہی، اس نے کہا کہ پہلے میرا عذر تو سُن لیجئے۔ میں کچھ گاؤ زمین تو نہیں کہ عالم کا بار اٹھاؤں، نہ چوتھا آسمان ہوں کہ آفتاب کو لئے پھروں مطلب یہ کہ **سلطان** سنجر کا بار اٹھانا گاؤ زمین اور آفتاب کا کام ہے۔

مہستی ایک مشہور شاعرہ تھی، جس کی حاضر جوابیاں اور ظریفانہ فقرے، مشہور عالم ہیں۔ سنجر کی شاعرانہ صحبتوں میں وہ بھی شریک ہوا کرتی تھی، ایک دفعہ مجلس عیش قائم تھی **مہستی** بھی موجود تھی، کسی کام سے باہر نکلی تو دیکھا برف پڑ رہی ہے، واپس آئی، سنجر نے پوچھا ہوا کا کیا رنگ ہے۔ مہستی نے فی البدیہہ رباعی پڑھی۔

شاہا فلکت اسپ سعادت زین کرد	وز جملہ خسرواں ترا تحسین کرد
تا در حرکت، سمند زرین نعلت	بر گل نہ نہند پائے، زمین سیمین کرد

یعنی آسمان نے اس غرض سے کہ آپ کے گھوڑے کے پاؤں خاک پر پڑنے نہ پائیں۔ زمین پر چاندی بچھا دی، سنجر نہایت محظوظ ہوا، اور اسی دن سے مہستی سنجر کے مقربین میں داخل ہو گئی۔

غزنوی خاندان نے بھی اس عہد میں سنبھالا لیا۔ **بہرام شاہ** جو سلطان محمود کی چوتھی پشت میں تھا۔ اور ۵۱۲ھ میں تخت نشین ہوا تھا۔ نہایت شان و شوکت کا بادشاہ اور نہایت علم دوست اور مربی فن تھا۔ تاریخ فرشتہ میں اس کا تذکرہ ان لفظوں سے شروع کیا گیا ہے۔

او پادشاہے بود، ذی شوکت، وصاحب حشمت، با علماء فضلاء بسیار نشستے، وصحبت ایشاں دوست داشتے، وہر کسے را بقدر علمش رعائت کردے، لہذا فضلائے آں روزگار باسم شریفش کتب ساختہ اند وتصنیفات پرداختہ اند۔

کلیلہ دمنہ جس کا ترجمہ پہلوی زبان سے عبداللہ ابن المقفع نے عربی میں کیا تھا۔ بہرام شاہ کے حکم سے فارسی زبان میں ترجمہ کی گئی، اور یہ پہلا دن تھا کہ ایران اور ہندوستان میں اس کا عام رواج ہوا۔ بہرام شاہ ہی کو یہ فخر نصیب ہوا کہ **حکیم سنائی** نے جو تعلقات دنیوی سے آزاد ہو چکے تھے۔ اپنی کتاب **حدیقہ** اس کے نام پر لکھی (بہرام شاہ نے ۵۴۷ھ میں وفات پائی)

ان سلاطین کے علاوہ، اور بڑے بڑے دربار تھے جہاں شاعری کی تربیت کی جاتی تھی۔ ان میں سب سے زیادہ علم دوست طغان شاہ سلجوقی تھا۔ چہار مقالہ میں لکھا ہے۔

آل **سلجوق** ہمہ شعر دوست بودند، اما ہیچکس شعر دوست تر از طغان شاہ الپ ارسلان نبود۔ محاورت ومعاشرت او ہمہ با شعرا بود و ندیمان او ہمہ شعرا بودند، چوں امیر عبداللہ قریشی وابوبکر **ازرقی** وابو منصور **یوسف** وشجاعی **فوی** واحمد بدیہی وحقیقی ونسیمی اینہا مرتب خدمت بودند وآیندہ وروند بسیار بودند"

اسی طرح شروان شاہ کے دربار کا ملک الشعراء **خاقانی** اور خوارزم شاہ کا **رشید الدین** وطواط تھا۔

بہرام شاہ کے عہد کا یہ کارنامہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ تصوف اور اخلاقی شاعری کا سنگ بنیاد اسی عہد میں رکھا گیا۔ اور صدی کے ختم ہونے سے پہلے پہلے یہ عمارت گویا انجام کو پہنچ گئی۔ چنانچہ اس کی تفصیل حکیم سنائی، اوحدی، اور خواجہ فرید الدین عطار کے حالات میں آئے گی۔

فلسفیانہ شاعری

فلسفیانہ شاعری بھی اسی دور کی یادگار ہے، فلسفہ کے خیالات سب سے پہلے حکیم ناصر خسرو نے اشعار میں ادا کئے۔ لیکن وہ محض فلسفہ ہی فلسفہ تھا۔ شاعری نہ تھی۔ برخلاف اس کے اس عہد میں **عمر خیام** نے فلسفیانہ مسائل اور خیالات کو اس انداز

سے ادا کیا کہ ظاہر میں آدمی کو اس میں صرف شاعری نظر آتی ہے، حالانکہ وہ فلسفیانہ نازک مسائل ہیں۔ جو دلکش اور دلفریب پیرایہ میں ادا کر دیئے گئے ہیں۔

اس عہد تک، شاعری میں عشق و عاشقی کی رُوح نہ تھی، مثنوی، رزم پر محدود تھی قصائد کا مقصود مداحی تھا، تشبیب میں معشوق کا جو ذکر کرتے تھے، وہ صرف عرب کے قصائد کا اتباع تھا۔ ساقی اور حسین بچوں کا ذکر کرتے تھے۔ تو اُس سے محض تفریح مقصود ہوتی تھی۔ جس طرح امرار کے ہاں، نازگیٔ نظر کے لئے پیش خدمت اور غلام حسین اور خوشرو رکھے جاتے تھے۔ اس عہد میں **نظامی** نے عشقیہ شاعری کی جداگانہ صنف قائم کر دی، عرب و عجم میں، عاشقی میں جو نامور تھے یعنی مجنوں و فرہاد، ان کے حالات میں مثنویاں لکھیں۔ عشقیہ شاعری

صرف عاشقانہ جذبات اور خیالات پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ بزم اور عاشقانہ خیالات کے اظہار کے لئے مستقل لٹریچر پیدا کر دیا۔ جس پر آگے چل کر متاخرین نے بڑی بڑی عمارتیں قائم کیں، غزل گوئی کی ایجاد گو **سعدی** سے منسوب ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اِس صنم کدہ کے آذر **نظامی** ہی ہیں۔

قصائد کی صنف کو چنداں ترقی نہیں ہوئی، مضامین میں تو کسی قسم کی جدت پیدا نہیں ہوئی، مداحی، خوشامد، مبالغہ پہلے سے بھی بڑھ گیا، البتہ لفظی صناعیاں کمال کے درجہ کو پہنچ گئیں۔ عبدالواسع جبلی، اور رشید الدین وطواط نے الفاظ پر اس قدر قابو پیدا کر لیا کہ جس نوع، جس ترکیب، جس انداز کے الفاظ چاہتے ہیں۔ اُن کا انبار لگا دیتے ہیں قصیدے کے قصیدے ہیں۔ جن میں تمام الفاظ ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ جس کو اصطلاح میں صنعت طباق کہتے ہیں۔ بعض قصیدوں میں التزام کر لیا ہے۔ کہ الف کا حرف جو سب سے عام حرف ہے نہ آنے پائے، باوجود اس کے یہ قصائد ایسے برجستہ اور رواں ہیں۔ کہ جب تک بتا نہ دیا جائے کہ اِس میں اس صنعت کا التزام کیا گیا ہے۔ اس طرف خیال بھی منتقل نہیں ہو سکتا اکثر قصیدوں میں یہ التزام ہے کہ ہر مصرع میں پانچ پانچ چھ چھ الفاظ ہیں۔ اور پہلے مصرع میں جس قدر الفاظ آئے ہیں۔ دوسرے مصرع کے تمام الفاظ کے ہموزن، بلکہ ہم قافیہ ہیں، باوجود اس کے کسی قسم کا تکلف نہیں معلوم ہوتا۔

عبدالواسع جبلی نے مسجع کو ۹ قافیوں تک پہنچایا جس سے وہ صورت پیدا ہو گئی جس کو عوام **بحر طویل** کہتے ہیں، مثلاً

یا صاحبی ایش الخبر، زاں سروقد سیمبر، کز عشق او گشتم سمر، تشنہ لب و خستہ جگر، بر کندہ جان افگندہ سر، با کام خشک و چشم تر، کردہ ز غم زیر و زبر، دنیا و دین، و جان و تن، یہ ایک مصرع ہے۔

یہ قاعدہ ہے کہ جب بارش اچھی ہوتی ہے۔ تو جو اور گیہوں کے ساتھ مختلف قسم کی زہریلی گھاس اور خار دار درخت اور بوٹے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ شاعری کے چمن میں، ہجو کا خار زار اسی عہد کی یادگار ہے۔ جس کے چمن آرا **انوری** اور **سوزنی** ہیں ہم اس دَور کے چند مشہور شعرا کا تذکرہ لکھتے ہیں۔

حکیم سنائی

مجدود نام، ابوالمجد کنیت، سنائی تخلص، غزنین وطن تھا۔ ابتدا میں شاعری کا پیشہ کرتے تھے۔ چنانچہ بہرام شاہ کی مدح میں بہت سے قصائد لکھے۔ جو دیوان میں موجود ہیں۔ لیکن پھر خدا نے توفیق دی اور توبہ کی، توبہ کا سبب ایک دلچسپ قصہ ہے بہرام شاہ ہندوستان کی مہم پر جارہا تھا حکیم سنائی نے چاہا کہ اس تقریب سے قصیدہ مدحیہ لکھ کر پیش کریں۔ قصیدہ تیار کرکے، دربار کے قصد سے چلے، راہ میں ایک حمام تھا۔ یہاں ایک پاگل رہا کرتا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ شراب خانوں سے شراب کی تلچھٹ مانگ لایا کرتا اور پی کر مست پڑا رہتا۔ اسی لئے اس کو لائے خوار کہتے تھے۔ **حکیم سنائی** حمام کے برابر سے نکلے، تو غنغنانے کی آواز سنی، ٹھیر گئے، دیکھا تو **لائے خوار** ساقی سے کہ رہا ہے۔ کہ ابراہیم شاہ کے اندھے پن کے صدقہ میں ایک پیالہ دینا، ساقی نے کہا کیا لغو بکتے ہو، ابراہیم شاہ نہائت عادل بادشاہ ہے، پاگل نے کہا، ابھی غزنین کے انتظام سے عہدہ برآ نہیں ہوا۔ دوسرے ملک کا ارادہ کرتا ہے۔ اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہوگی۔

یہ کہ کر پیالہ اٹھایا اور پی گیا۔ پھر ساقی سے کہا کہ **سنائی** کے اندھے پن کے صدقہ میں ایک پیالہ اور لانا، ساقی نے کہا، سنائی نہائت خوش فکر اور خوش طبع شاعر ہے۔ اُسکی برائی کیوں کرتے ہو؟ پاگل نے کہا اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہوگی کہ دو چار جھوٹ سچ باتیں جوڑ کر، کسی بیوقوف رئیس کے پاس جاتا ہے۔ ادب سے دست بستہ کھڑا ہوتا ہے اور اُس کو سناتا ہے، قیامت میں اگر سوال ہوا کہ دربار میں کیا لایا ہے۔ تو

کیا جواب دیگا۔

حکیم سنائی پر یہ اثر ہوا کہ اسی وقت سب چھوڑ چھاڑ گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گئے، اور یہ رتبہ حاصل کیا کہ یا تو بہرام شاہ کے دربار میں جھٹی کرتے تھے۔ یا بہرام شاہ نے اپنی بہن کو اُن کے عقد نکاح میں دینا چاہا اور انہوں نے انکار کیا، چنانچہ بہرام شاہ کو جواب میں لکھا۔

من نہ مرد زن و زر و جاہم	بخدا گر کنم و گر خواہم
گر تو تاجم دہی ز احسانم	بسر تو کہ تاج نستانم

ید بیضا میں لکھا ہے۔ کہ سروپا برہنہ حج کو گئے۔ وہاں سے واپس آکر غزنین میں گوشہ نشینی اختیار کی ننگے پاؤں **غزنین** کے گلی کوچوں میں پھرا کرتے تھے۔ اُن کے عزیزوں کو رحم آتا۔ ان کو اس حالت میں دیکھتے تو بے اختیار رو دیتے۔ یہ ان کو سمجھاتے کہ میری حالت پر رونا نہیں، بلکہ خوشی کرنی چاہیے۔ ایک دن لوگوں نے جوتی لا کر پیش کی، اُن کی خاطر سے پہن لی، لیکن اتنا تعلق بھی اُن کی حالت میں خلل انداز ہوا۔ چنانچہ دوسرے دن جوتی اتار کر پھینک دی اور کہا کہ جو بات مجھ میں کل تھی آج نہیں، امیر خسرو نے اسی واقعہ کی طرف ایک قصیدہ میں اشارہ کیا ہے[1]۔

نیست مدبر آں ترک از خود بدارد کفش از انک	ہر خسگاف از پاشا لیش دین و دولت راد راست

ایک رئیس نے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا۔ اُن کو خبر ہوئی اُسی وقت رئیس کو خط لکھا کہ

ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا گوشۂ دل ایں گوشہ گرفتہ را بہ تفقد ستایش خود خراب نہ کند جسم حقیر ایں بندہ نہ سزائے خشم خداوندی است[2]۔

اِس زمانہ میں شیخ ابو یوسف ہمدانی مشہور مشائخ میں سے تھے۔ حکیم سنائی نے اُن سے بیعت کی، شیخ ابو یوسف، ابوعلی فارمدی کے مرید تھے۔ جو امام غزالی کے پیر ہیں اِس رشتہ سے حکیم سنائی، امام غزالی کے برادر زادہ ہیں۔

حکیم سنائی نے جب حدیقہ تصنیف کی، تو چونکہ اِس میں ایسی باتیں بھی ہیں جو

---

[1] نفحات الانس میں بہرام شاہ کے بجائے سلطان محمود کا نام لکھا ہے۔ اسی بنا پر تاریخ فرشتہ میں اس واقعہ سے انکار کیا ہے، [2] یہ تمام تفصیل دولت شاہ میں ہے ۱۲ [3] نفحات ۱۲

عام عقائد کے خلاف ہیں۔ اس لئے علماء نے سخت مخالفت کی، یہاں تک کہ بہرام شاہ تک شکائت پہنچی، بہرام شاہ نے، دار الخلافۃ بغداد سے استفتا طلب کیا، وہاں کے علماء نے لکھا کہ یہ مسائل قابل اعتراض نہیں حکیم سنائیؒ نے اپنی برأت کے متعلق، ایک خط بھی بہرام شاہ کے نام لکھا۔ عبد القادر بدایونی نے اس خط کو پورا نقل کیا ہے۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس بات پر ناراض تھے کہ حکیم سنائی نے حدیقہ میں بنی اُمیہ کی نہائت برائی لکھی تھی اور اہل بیت کی مدح میں مبالغہ کیا تھا۔ حکیم سنائی نے ان دونو باتوں کو تسلیم کیا۔ اور لکھا کہ آل مروان کی برائی خود احادیث میں آئی ہے لیکن حکیم صاحب، محدث نہ تھے، ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ گو آل مروان کی برائی میں شک نہیں، لیکن حدیثیں جو اُن کی شان میں مذکور ہیں سب وضعی اور جعلی ہیں۔

حکیم سنائی کی وفات میں سخت اختلاف ہے۔ تاریخ فرشتہ میں تاریخ گزیدہ کے حوالہ سے لکھا ہے۔ کہ بہرام شاہ کے زمانہ میں وفات پائی، اسی تاریخ میں بعض فضلا کا قول نقل کیا ہے کہ ۵۲۵ھ میں انتقال ہوا۔ اور اسی سن میں حدیقہ بھی تمام ہوئی تھی۔ دولت شاہ نے ۵۷۶ھ میں لکھا ہے۔ ریاض العارفین میں ۵۴۶ھ ہے۔

نفحات میں لکھا ہے کہ مرتے وقت یہ شعر زبان پر تھا۔

باز گشتم ز انچہ گفتم زاں کہ نیست
در سخن معنی و در معنے سخن

تصنیفات

حکیم سنائی کی تصنیفات میں ایک کلیات ہے۔ جس میں تیس ہزار شعر ہیں، سات مثنویاں ہیں۔ حدیقہ، سیر العباد، کارنامہ بلخ، طریق التحقیق، عشق نامہ، عقل نامہ، بہروز، بہرام احدیقہ چھپ گئی ہے۔ اور ہر جگہ ملتی ہے۔ باقی مثنویاں ناپید ہیں، البتہ سیر العباد کے بہت سے اشعار مجمع الفصحاء میں نقل کئے ہیں، حدیقہ کی بحر اور وہی انداز ہے۔

کلیات میں قصائد، قطعے، غزلیں، رباعیاں سب کچھ ہے۔ اور افسوس یہ ہے کہ ان پھولوں میں ہجو کے کانٹے بھی ہیں۔

حکیم سنائی کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) تشبیب اور قصائد میں انہوں نے گو اپنے اور تمام معاصرین کی طرح کوئی جدت نہیں پیدا کی، لیکن پختگی، برجستگی، اور صفائی میں ان کا کلام، تمام معاصرین سے ممتاز ہے۔ اور قدماء میں بھی، فرخی کے سوا، اس خصوصیت میں کوئی اُن کا ہمسر نہیں، فرخی کے قصیدہ کا جو

جواب لکھا ہے۔ اُس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دوش سرمست نگارینِ من، آں طرفہ پسر	با یکے پیرہنے با کلہے طرفہ بسر
از سرِ کوچہ فرود آمد متواری دار	کردہ از غائت دلتنگی صد گونہ بطر
نرم نرمک ہے آں نرگس پرُ خواب کشاد	ژالہ ژالہ عرق از عارضِ او کردہ اثر
بوسہ برِ دو لبِ من داد پے از پے عذر	اینت شوریدہ نگار اینت شکر بوسہ پسر
شاد ماں گشتم ازیں کار و گرفتمش کنار	ہمچو تنگِ شکر و خرمن گل تنگ ببر
او شدہ خوابے ومن از بوسہ زدن بر دورخش	با دو چشم و دو رخش تا بہ سحر جفت سہر
خود کہ داند؟ کہ دراں نیم شب از مستی او	تاچہ بر داشتم از بوسہ و ہر چیز دگر

یہی مضمون ہے جس کو قاآنی نے زیادہ لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے۔

مست در بستر من خفتہ و رنداں دانند	حالتِ مست کہ در بسترِ ہشیار افتد

خیالات اور طرزِ ادا میں کہیں کہیں جدت بھی پائی جاتی ہے، مثلاً گمر بر، و شیر بر کی طرح میں جو قصیدہ کہا ہے۔ اُس میں ایک قطعہ بند ہے۔

در زینت و در رنگ کلاہ و کمر خویش		زحمت چہ کشی در طلب گوہر و زر بر
ایں اشک من و رنگ رُخ من ببر اے شوخ	ق	ایں را بہ کلہ بر زن و آں را بہ کمر بر

یعنی اے معشوق اپنے کمربند، اور کلاہ کی زینت میں اس قدر زحمت کیوں اٹھاتا ہے۔ میرا آنسو، اور میرے چہرہ کا رنگ، لیکر کلاہ اور کمر پر لگالے کہ زرد گوہر کا کام دیں گے آنسو گوہر اور چہرہ کا رنگ زردی کی وجہ سے زر کے مشابہ ہے۔

(۲) حکیم سنائی پہلے شخص ہیں جس نے تصوف کو شاعری سے روشناس کیا اُس سے پہلے حضرت ابو سعید ابوالخیر کی چند رباعیاں تصوف میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن ان میں صرف جوش عشق کو پُر زور طریقہ سے ادا کیا ہے۔ تصوف کے مسائل، اسرار، اور معارف نہیں۔ بخلاف اس کے حکیم سنائی کی تصنیفات تصوف کی مستقل تصنیفیں ہیں خود حکیم صاحب کو بھی اِس کا دعویٰ ہے۔ چنانچہ حدیقہ میں کہتے ہیں۔

کس نہ گفت ایں چنیں سخن بجہاں	ور کسے گفت، گو بیار و بخواں
زیں نمط ہر چہ در جہاں سخن است	گر یکے در ہزار، آنِ من است
جز ز قرآں گذشتی و ز اخبار	نیست کس را ازیں نمط گفتار

اس دعوی کو اکابر صوفیہ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ مولانا روم فرماتے ہیں۔

ترک جوشے کردہ من نیم خام	از حکیم غزنوی بشنو تمام
عطار روح بود و سنائی دو چشم او	ما از پس سنائی و عطار آمدیم

حدیقہ میں تصوف کے تمام مقامات کو الگ الگ عنوان سے لکھا ہے اور نہائت خوبی سے ادا کیا ہے۔ اس کتاب کے چوتھے حصہ میں جہاں صوفیانہ شاعری پر ریویو ہوگا۔ حدیقہ کے انتخابات درج کئے جائیں گے۔

(۳) قدماء کی شاعری اگرچہ نیچرل شاعری تھی، لیکن طرز ادا شاعرانہ نہ تھا، جس بات کو کہنا چاہتے تھے، صاف بے تکلف، سیدھے سادھے طور پر کہ دیتے تھے، معمولی بات کو انوکھے پیرایہ میں ادا کرنا، یا ایک معمولی واقعہ سے منطقیانہ استدلال پیدا کرنا۔ متوسطین اور متاخرین کا جوہر ہے لیکن اس کے موجد حکیم سنائی ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل آگے آتی ہے۔

(۴) اخلاقی شاعری کی بنیاد بھی حکیم سنائی نے قائم کی، اور گو آگے چل کر اس صنف کو بہت وسعت ہوئی، لیکن اصول اور آئین حکیم سنائی نے قائم کر دیے تھے۔

اخلاقی شاعری کی سب سے ضروری شرط یہ ہے۔ کہ جو بات کہی جائے اُس کے لئے پیرایہ بیان ایسا ڈھونڈا جائے کہ سننے والے کو معلوم ہو کہ اس سے پہلے کسی نے اس کی اصلی حقیقت نہیں ظاہر کی تھی۔ اور یہ کہ وہ جس کام کو معمولی بات سمجھتا تھا۔ وہ نہائت نفرت انگیز اور بدترین افعال ہے۔ اس کے لئے شاعر کو ضرور ہے۔ کہ وہ سامنے کی باتوں سے ایسے نتائج پیدا کرے جو بظاہر بالکل اچھوتے معلوم ہوں۔ اور جس کی طرف خیال نہ گیا ہو۔

مثلاً یہ بات عام ہے کہ طبیب جس چیز کو منع کر دیتا ہے۔ لوگ اس سے پرہیز کرتے ہیں لیکن شریعت کے احکام کی پابندی نہیں کرتے، اب دیکھو حکیم سنائی اس واقعہ سے نصیحت کا کیا پہلو، پیدا کرتے ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ طبیب اکثر پارسی، عیسائی، یہودی ہوتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا کہ جن چیزوں کو طبیب منع کر دیتا ہے۔ اکثر حلال ہوتی ہیں۔ مثلاً حلوا مٹھائی وغیرہ، اور شریعت جن چیزوں کو منع کرتی ہے۔ وہ مضر اور ناجائز ہوتی ہیں، ان باتوں سے انہوں نے اسطرح کام لیا۔

ترا یزداں ہمے گوید کہ در دنیا مخور بادہ — ترا ترسا ہمے گوید کہ در صفرا مخور حلوا

ز بہر دین تو نگذاری حرام از حرمتِ یزداں — ولیک از بہر تن مانی، حلال از گفتۂ ترسا

یعنی خدا نے حکم دیا کہ شراب نہ پیو، اور عیسائی (طبیب) کہتا ہے۔ کہ حلوا نہ کھاؤ، حلوا حلال چیز تھی۔ اُس کو تو تم نے ایک عیسائی کے کہنے سے چھوڑ دیا۔ اور شراب جس کو تم خود بھی ناجائز سمجھتے ہو۔ خدا کے کہنے سے بھی نہیں چھوڑتے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ تم خدا کے حکم کو ایک عیسائی کی بات کے برابر بھی نہیں سمجھتے۔

اِس قدر ہر شخص جانتا ہے۔ کہ انسان مر کر، تمام جھگڑوں سے چھوٹ جاتا ہے۔ اِس سے حکیم **سنائی** نے نصیحت کا یہ پیرایہ پیدا کیا ہے۔

با ہمہ خلق جہاں، اگرچہ ازاں — بیشتر گمرہ و کم ترہ برہ اند

آں چناں زی کہ چو میری برہی — نہ چناں زی کہ چو میری برہند

یعنی لوگوں کے ساتھ اِس طرح پیش آؤ، کہ جب مرد تو تم جھگڑوں سے چھوٹ جاؤ نہ یہ کہ جب تم مرد تو لوگ جھگڑے سے چھوٹیں، یعنی تمہارے افعال سے ہر شخص تنگ آ رہا تھا۔ اس لئے جب تم مروگے تو لوگوں کو نجات ہوگی۔

شراب کی بُرائی کا یہ پہلو ہر شخص جانتا ہے۔ کہ نشہ میں انسان بیہودہ بکتا ہے۔ گالیاں دیتا ہے۔ لڑتا ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ انسان نشہ کی حالت میں فیاض اور کرم گستر بن جاتا ہے۔ اور یہ تعریف کا پہلو ہے، اب دیکھو **شاعر**، اس تعریفی پہلو سے کیونکر شراب کی بُرائی کا یقین دلاتا ہے۔

نکند عاقل مستی، نخورد دانا مے — نہ نہد مردم ہشیار سوئے مستی پے

گر کنی بخشش گویند کہ مے کرد نہ او — ور نہ کنی عربدہ گویند کہ او کرد نہ مے

یعنی شراب ایسی چیز ہے کہ انسان اگر سخاوت بھی کرتا ہے تو لوگ اُس کی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ یہ شراب کا فیض ہے۔

از پے ردّ و قبول عامہ، خود را خر مکن — ز آں کہ نبود کار عامہ، خر خری یا فرفری

گاو را دارند باور در خدائی عامیاں — نوح را باور ندارند از پے پیغمبری

اس قدر سب جانتے ہیں کہ حضرت **موسےٰ** کی قوم نے گوسالہ کی پرستش کی تھی۔ اور آج بھی ہندوؤں کے نزدیک، گائے نہایت مقدس چیز ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ

حضرت نوح کو اُن کی اُمّت نے پیغمبر تسلیم نہیں کیا۔ ان دونو باتوں سے شاعر نے یہ نتیجہ نکالا کہ عوام کا ردّ و قبول کس قدر ناقابل اعتبار ہے، ماننے پر آئے تو گائے کے بچھڑے کو خدا بنا دیا، اور انکار کی طرف جھکے تو حضرت **نوح** کو پیغمبر بھی تسلیم نہیں کرتے۔

اختلاط اور صحبت میں خوبیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی، اس لئے ارباب حال دونو طرف گئے ہیں لیکن اس نکتہ کی طرف کسی کا ذہن نہیں گیا۔ کہ خوبی کا جو پہلو ہے۔ وہ بھی زحمت سے خالی نہیں۔

کسے کش خرد رہنمون است، ہرگز	بہ گیتی رہ و رسم الفت نورزد
کہ صحبت نفاقی است یا اتفاقی	دل مرد دانا ازیں ہر دو لرزد
اگر خود نفاقی است جاں را بکاہد	وگر اتفاقی است ہجراں نیرزد

یعنی اگر صحبت، منافقوں کے ساتھ ہے تو ظاہر ہے کہ سوہان روح ہے۔ اور اگر خاص احباب کے ساتھ ہے تب بھی اس لئے بُری ہے کہ اس حالت میں جدائی کا صدمہ جانگزا ہوگا۔

بہ حرص[1] آز شربتے خورم مگیر از من کہ بد کردم	بیاباں بود و تابستان و آب سرد و استسقا
چوں[2] تو شدی پیر بلندی مجو	کانکہ نہ تو زاد، بلند آں شود
پیر نہ بینی کہ بہ پایاں رسد	سایۂ ہر چیز دو چنداں شود
زشت[3] باشد روئے نازیبا و ناز	سخت باشد چشم نابینا و درد
باد[4] و قبلہ در رہ توحید نتواں رفت راست	یا رضائے دوست باید، یا رضائے خویشتن
سوئے[5] آں حضرت نپوید، ہیچ دل با آرزو	با چنیں گلرخ نخسپد ہیچ کس با پیرہن
ایں[6] جہاں بر مثال مرداریست	کرگساں گرد او ہزار ہزار
ایں مر آں را ہمے کشد، مخلب	آں مر آں را ہمے زند منقار
آخر الامر بہ پرند ہمہ (چنگل)	وز ہمہ باز ماند ایں مردار

(۵) جوش اور سرمستی جو حقیقی شاعری ہے۔ ایشیا کے شعرا میں بہت کم پائی جاتی ہے فارسی شعرا میں **مولانا روم** پر یہ نشہ چھایا ہوا ہے۔ خواجہ حافظ بھی کبھی کبھی بدمست ہو جاتے ہیں لیکن حکیم **سنائی** ان سب کے پیشرو ہیں۔ اشعار ذیل کو پڑھو، اور اُن کے

[1] گناہ کی معذرت [2] بوڑھے جوان کا مقابلہ نہیں کر سکتے ۱۲ [3] بد لیاقت آدمی کو غرور اور زیادہ بدنما ہے [4] یکسوئی [5] مقام وصال میں ترک آرزو [6] دنیا اور طالبانِ دنیا ۱۲

الفاظ، ترکیب، انداز بیان، مضمون ایک ایک چیز کو دیکھو کس طرح، جوش سے لبریز ہیں۔

یا بردا ہمچوں زناں رنگے و بوئے پیش گیر	یا چو مرداں اندر آئے وگوئے در میداں فگن
چوں دو عالم زیر پایت نطع شد پائے بکوب	چوں دو کون اندر دو دستت جمع شد، دستی بزن
سر بر آر از گلشن توحید تا در کوئے دیں	کشتگان زندہ بینی انجمن در انجمن
دے ز دلتنگی زمانے طوف کردم در چمن	یک جہاں جاں دیدم آنجا جستہ از زندان تن
بے طرب خوشدل طیور، وبے طلب جنباں صبا	بے دہاں خنداں درخت وبے زباں گویا چمن
طلب اے عاشقان خوش رفتار	طرب اے شاہدان شیریں کار
تا کے از خانہ، ہاں رہِ صحرا	تا کے از کعبہ، ہیں درِ خمار
در جہاں شاہدے وما فارغ!!	در قدح جرعۂ وما ہشیار
بسکہ شنیدی صفت روم وچین	خیز وبیا ملک سنائیؔ ببین
تا ہمہ دل بینی بے حرص وبخل	تا ہمہ جان بینی بے کبر وکیں
پائے نہ، وچرخ بزیر قدم	دست نہ، وملک بزیر نگیں
رستہ ز ترکیب زمان ومکاں	جستہ ز ترتیب شہور وسنیں
روح امین دادہ بدہنش ہمانکہ	دادہ بمریم زرہ آستیں

(۶) شاعری کے اجزا میں ایک بڑا ضروری جز تمثیل اور تشبیہ ہے شاعر کبھی کوئی اخلاقی دعویٰ کرتا ہے۔ تو دلیل میں اس کو تمثیل پیش کرنی پڑتی ہے۔ کبھی کسی چیز کی اچھائی یا برائی ثابت کرنا، یا کسی چیز کی تصویر اور ہیئت کھینچنا چاہتا ہے۔ تو تشبیہ اور تمثیل کے بغیر چارہ نہیں ہوتا اسی بنا پر اکثر بڑے بڑے شاعر مثلاً سعدیؔ، صائبؔ، کلیمؔ وغیرہ تمثیل میں کمال رکھتے تھے شاعری کی اس صنعت کے موجد بھی حکیم **سنائیؔ** ہی ہیں۔ ذیل کی مثالوں سے معلوم ہوگا کہ اُن کی تمثیلیں کس قدر نادر اور مؤثر ہوتی ہیں۔

ہر خسے از رنگ و رفتارے بدیں رہ کے رسد	درد باید صبر سوز و مرد باید گام زن
ہفتہ ہا باید کہ تا یک پنبہ دانہ ز آب وگل	شاہدی را حلّہ گردد یا شہیدے را کفن
ماہہا باید کہ تا یک مشت پشم از پشت میش	صوفئے را خرقہ گردد یا حمارے را رسن
سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب	لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن
ساعت بسیارے باید کشیدن انتظار	تا کہ در جوف صدف باراں شود در عدن

حصول مقصد کیلئے دیر اور انتظار ضرور ہے

اور جو مقصد جسقدر اہم ہوگا اسی قدر زیادہ دیر ہوگی

قرنہا باید کہ تا یک کودکے از لطفِ طبع
عالمے گویا شود یا فاضلے صاحب سخن

صدق و اخلاص و درستی باید و عمرِ دراز
تا قرینِ حق شود صاحبقرانے در قرن

تو علم آموختی از حرص اینک ترس کاندر شب[1]
چو دزدے با چراغ آید گزیدہ تر برد کالا

چو تن جاں را مزین کن بہ علم و دیں کہ زشت آید[2]
درون سو شاہ عریان و بروں سو اطلس و دیبا

اب ہم حکیم سنائیؒ کے بعض قطعات و قصائد کے اشعار یکجا لکھتے ہیں۔ جس سے اُن کی عام شاعری کا اندازہ ہو سکے گا۔

مکن در جسم و جاں منزل کہ ایں دون ست آں والا
قدم زیں ہر دو بیروں نہ نہ اینجا باش و نہ آں جا

بہر چہ از راہ باز افتی چہ کفر آں حرف چہ ایماں
بہر چہ از دوست وامانی چہ زشت آں نقش چہ زیبا

چو علمت ہست خدمت کن چو بے علماں کہ زشت آید
گرفتہ چینیاں احرام و مکّی خفتہ در بطحا

مرا بارے بحمد اللہ ز راہِ حکمت و ہمت
بسوئے خط وحدت بُرد عقل از خطۂ اشیا

نخواہم لاجرم نعمت نہ در دنیا نہ در جنت
ہمے گویم بہر ساعت چہ در ضرّا چہ در سرّا

کہ یارب مر سنائی را سنائی دہ تو در حکمت
چناں کز وی بہ رشک آید روانِ بو علی سینا

مگر واں عمر من چوں گل کہ در طفلی شوم کشتہ
مگر واں حرص من چوں تل کہ در پیری شوم برنا

بہر چہ از اولیا گفتند ارزقنا و وفقنا
بہر چہ از انبیا گفتند آمنّا و صدقنا

پردہ دارِ عشق داں رسمِ ملامت بر فقیر
پاسبانِ دُر شناس ایں آبِ تلخ اندر بحار

اے بسا غبنا کہ اندر حشر خواہد بُد ازاں کہ
ہست ناقد بس بصیر و نقدہا بس کم عیار

عقلِ جزوی کے تواند گشت بر گیہاں محیط
عنکبوتے کے تواند کرد سیمرغے شکار

کے شود ملکِ دو عالم تا تو باشی ملکِ آں
کے بود اہلِ نثار آں کس کہ برچیند نثار

باش تا کل یابی آنہارا کہ امروز ند جزو
باش تا گل یابی آنہارا کہ امروز ند خار

گوئی کہ بعد ما چہ کنند و کجا روند
فرزندگان و دخترگان یتیم ما

خود یاد ناوری کہ چہ کردند و چوں شدند
آں مادران و آں پدران قدیم ما

آدمی را دو بلا گرد رہے
داند از ہر دو بلا روز بہی

یا کند پُر شکم خویش زناں
یا کند پشت خود از آب تہی

[1] علم زیادہ پُرخطر گناہوں کا سبب ہو سکتا ہے ۱۲

[2] صفائی ظاہری کے ساتھ صفائی باطن بھی مشروط ہے ۱۲

عمرِ خیام بن ابراہیم نیشاپوری

عمر نام، خیام لقب نیشاپور وطن، غالباً آبائی پیشہ خیمہ دوزی تھا۔ جس کی وجہ سے خیام کا لقب ملا، عمر نے جب تحصیلِ علم شروع کی تو دو شخص اس کے ہم سبق تھے۔ ان میں رابطۂ محبت اس قدر بڑھا کہ سب نے عہد کیا کہ ہم میں سے جب کوئی شخص بڑے منصب پر پہنچے گا تو اپنے ساتھیوں کو بھی اپنا ہمسر بنائے گا، اس وقت دنیا کو کیا معلوم تھا کہ یہ مکتب کے لونڈے جو اس وقت ایک خیالی منصوبہ باندھتے ہیں۔ آگے چل کر دنیا کی تاریخ بدل دیں گے۔ ان میں سے ایک کا نام حسن بن علی اور دوسرے کا حسن تھا۔ حسن بن علی نے رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کی کہ الپ ارسلان سلجوقی کا وزیر ہو گیا۔ اور ۴۶۵ھ میں جب الپ ارسلان نے وفات پائی اور ملک شاہ سلجوقی مسند آرا ہوا تو وہ کل سیاہ و سفید کا مالک تھا یہی حسن ہے۔ جو آج نظام الملک (بانی نظامیہ بغداد) کے نام سے مشہور ہے۔ عمر خیام کو جب معلوم ہوا کہ میرا ہم سبق تاج و تخت کا مالک ہے۔ تو اصفہان میں نظام الملک کے پاس آیا، نظام الملک نے بڑے احترام سے خیر مقدم کیا، نظام الملک کو اپنا عہد یاد تھا۔ خود پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں، خیام جو کچھ چاہتا۔ اس کو مل سکتا تھا۔ لیکن ملک قناعت کے شہنشاہ نے صرف معمولی وجہ معاش کی درخواست کی، نظام الملک نے خیام کے وطن نیشاپور میں کم و بیش بارہ سو روپے سالانہ کی جاگیر مقرر کر دی[1]۔ خیام نے اگرچہ صرف معمولی جاگیر پر قناعت کی، لیکن سلاطین و امراء اس سے برابری کا برتاؤ کرتے تھے۔ شمس الملوک خاقان بخاری اس کو تخت پر اپنے برابر بٹھاتا تھا، ملک شاہ سلجوقی دنیائے اسلام کا شہنشاہ اعظم تھا۔ اس سے ندیمانہ تعلقات رکھتا تھا، دولت شاہ سلجوقی نے لکھا ہے کہ سلطان سنجر بھی اس کو اپنے برابر تخت پر بٹھاتا تھا۔ لیکن شہرزوری کی تاریخ الحکماء[2] سے معلوم ہوتا ہے کہ سنجر کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ شہرزوری نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے۔ کہ جس زمانہ میں سنجر شاہزادہ تھا۔ اس کو چیچک نکلی، خیام معالجہ کے لئے طلب ہوا۔ وزیر نے خیام سے پوچھا کہ بیمار کی کیا حالت ہے۔ خیام نے کہا آثار اچھے نہیں، یہ خبر کسی نے سنجر کو پہنچائی۔ اس کو نہایت رنج ہوا۔ اور یہ رنج ہمیشہ قائم رہا۔

[1] دولت شاہ لیکن جاگیر کی آمدنی کی تعیین اور کتابوں سے ماخوذ ہے ۱۲ [2] تاریخ الحکماء شہرزوری ۱۲

سنہ ۴۶۷ھ میں **ملک شاہ** نے ایک عظیم الشان رصد خانہ قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ دُور دُور سے بڑے بڑے ہیئت داں اور منجم بلوائے، ان میں ابو المظفر اسفزاری، میمون بن نجیب واسطی، اور ہمارا نامور خیام بھی تھا۔ ابن الاثیر نے جہاں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے۔ کہ اس رصد خانہ پر بیشمار دولت صرف ہوئی۔ اس رصد سے جو زیچ تیار ہوئی وہ خاص خیام کی تیار کردہ تھی، چنانچہ کشف الظنون زیچ ملک شاہی کے ذکر میں صاف تصریح ہے۔

خیام زیادہ تر فلسفۂ یونان کا درس دیتا تھا۔ اور اسی قسم کے خیالات رکھتا تھا۔ یہ خیالات جب زیادہ پھیلے تو عوام میں سخت برہمی پیدا ہوئی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے اس کو بے دین قرار دیکر قتل کر دینا چاہا، مجبوراً اس نے حج کا ارادہ کیا حرم میں کوئی کسی کو ستا نہیں سکتا حج سے فارغ ہو کر بغداد میں آیا۔ یہاں لوگوں نے نام سنا تو ہر طرف سے ٹوٹ پڑے کہ علوم فلسفیہ سیکھیں، لیکن اس نے انکار کیا اور بغداد سے چل کر وطن میں آیا۔[1]

وفات اس کی وفات کا دلچسپ قصہ ہے، ایک دن بوعلی سینا کی کتاب الشفا مطالعہ کر رہا تھا جب وحدت و کثرت کی بحث آئی تو اٹھ کھڑا ہوا، عادت تھی کہ ہر وقت خلال پاس رکھتا تھا اس کو ورق میں رکھ کر اٹھا، نماز پڑھی، وصیت کی۔ شام تک کچھ نہ کھایا۔ نماز عشا پڑھ کر سجدہ کیا اور کہا اے خدا جہاں تک میرے امکان میں تھا میں نے تجھ کو پہچانا، اس لئے مجھکو بخش دے یہی کہتے کہتے جان نکل گئی۔ مجمع الفصحا میں ہے۔ کہ سنہ ۵۱۷ھ میں وفات پائی۔

دفن کا قصہ اس سے بھی عجیب تر ہے۔ **نظامی عروضی** اس زمانہ کا مشہور شاعر ہے جس کی کتاب چہار مقالہ چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ سنہ ۵۰۶ھ میں میں بلخ گیا۔ معلوم ہوا کہ خیام آجکل یہیں امیر ابوسعید کے مکان پر مقیم ہے۔ میں خدمت میں حاضر ہوا، باتوں باتوں میں خیام نے کہا کہ میری قبر ایسے مقام میں بنے گی کہ ہر سال دو دفعہ، درخت اس پر پھول برسائیں گے مجھ کو تعجب ہوا۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ ایسا بڑا شخص لغو گو نہیں ہو سکتا۔ سنہ ۵۰۳ھ میں میں جب نیشاپور پہنچا تو حکیم موصوف کا چند برس پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ چونکہ مجھ پر شاگردی کا حق تھا۔ ایک آدمی کو ساتھ لیا کہ قبر کا پتہ بتائے۔ وہ قبرستان حیرہ میں لے گیا۔ دیکھا تو باغ کی دیوار کے نیچے قبر ہے۔ سرھانے امرود اور زرد آلو کے درخت ہیں شگوفہ جھڑ کر اس قدر ڈھیر ہو گئے ہیں کہ قبر ڈھک گئی ہے مجھکو حکیم موصوف کا قول یاد آ گیا اور بے اختیار آنسو نکل پڑے۔[2]

---

[1] تاریخ الحکماء جمال الدین قفطی ۱۲ [2] چہار مقالہ ذکر منجم ۱۲

فضل و کمال

خیام کو آج زمانہ شاعری کی حیثیت سے جانتا ہے لیکن وہ فلسفہ میں بوعلی سینا کا ہمسر اور مذہبی علوم اور فن ادب و تاریخ میں امام فن تھا، جمال الدین قفطی نے تاریخ الحکما میں اس کا نام ان القاب سے شروع کیا ہے۔ امام خراسان و علامۃ الزمان شہرزوری تاریخ الحکماء میں لکھتے ہیں۔ کان تلو ابی علی فی اجزاء علوم الحکمۃ وکان عالما باللغۃ والفقہ والتواریخ۔ حافظہ کا یہ حال تھا۔ کہ ایک دفعہ اصفہان میں ایک کتاب نظر سے گزری، سات دفعہ اس کا مطالعہ کیا، نیشاپور میں واپس آیا تو ساری کتاب زبانی لکھوا دی۔ اصل سے مقابلہ کیا گیا تو خفیف فرق نکلا[1]۔

ایک دفعہ وزیر عبد الرزاق کے ہاں علمی صحبت تھی، ابوالحسن غزالی جو اس زمانہ میں فن قرأت کے امام تھے۔ وہ بھی موجود تھے۔ اتفاق سے خیام بھی آنکلا عبد الرزاق نے خیام کو آتا دیکھکر کہا۔ علی الخبیر سقطنا یعنے واقف کار آگیا مسئلہ زیر بحث کو خیام کے آگے پیش کیا۔ اس نے ساتوں قرأتیں، شاذ روایتیں، اور اُن کے دلائل اور وجہ بیان کر کے ایک قرأت کو ترجیح دی، غزالی بے اختیار بول اُٹھے کہ حکمار کا کیا ذکر خود قرأ میں سے کسی کی یہ معلومات نہیں ہو سکتی[2]۔

قاضی عبد الرشید کا بیان ہے۔ کہ ایک دفعہ خیام سے میں مرو کے حمام میں ملا اور سورۂ معوذتین کے معنی دریافت کئے، یہ بھی پوچھا کہ ان صورتوں میں بعض الفاظ بار بار کیوں آئے ہیں، خیام نے برجستہ جواب دینا شروع کیا۔ مفسرین کے اقوال، ان کے دلائل اور شواہد اس تفصیل اور وسعت سے بیان کئے کہ اگر ساری تقریر قلمبند کر لی جاتی تو اچھی خاصی کتاب بن جاتی[3]۔

فلسفیانہ خیالات کی وجہ سے مذہبی علمار اس سے مخالفت رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں مذہبی گروہ کے پیشرو امام غزالی تھے۔ جنہوں نے تہافۃ الفلاسفہ لکھکر فلسفہ کا ابطال کیا تھا۔ وہ مناظرہ کے لئے خیام کے پاس گئے۔ اور پوچھا کہ آسمان کے تمام اجزا باہم متشابہ اور متحد الحقیقت ہیں پھر بعض اجزا میں کیا خصوصیت تھی کہ قطبین قرار پائے، خیام مسائل فلسفہ کے بیان کرنے میں نہایت بخل کرتا تھا، اس سے پہلے تو یہ کہ کر ٹالا کہ میں اس مسئلہ کو اپنی کتاب عرائس النفائس میں بتفصیل لکھ چکا ہوں، پھر جواب دیا تو اس طرح کہ پہلے

---

[1] شہرزوری ۱۲ [2] شہرزوری ۱۲ [3] شہرزوری ۱۲

ابتدائی مراتب بیان کئے، چنانچہ اس مسئلہ سے ابتدا کی کہ "حرکت کس مقولہ سے ہے" پھر اس کو اس قدر پھیلایا کہ یہ مسئلہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ ظہر کی اذان کی آواز آئی، امام غزالی یہ کہ کر اٹھ گئے۔ جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔

نجوم کا فن اگرچہ مہمل چیز ہے لیکن یونانی حکما عموماً اس کے قائل تھے، وہی خیالات مسلمانوں میں بھی منتقل ہوئے، خیام اس فن میں کمال رکھتا تھا۔ اور اس لئے منجم کہلاتا تھا۔ ۵۰۸ھ میں بادشاہ وقت نے خواجہ بزرگ صدرالدین محمد بن المظفر کے پاس آدمی بھیجا۔ کہ میں شکار کو جانا چاہتا ہوں، خیام سے کہدو کہ اعمال نجوم کے ذریعہ سے ایسی تاریخ مقرر کرے کہ برف و بارش سے محفوظ ہو۔ خیام نے دو دن کے غور و فکر کے بعد ایک دن معین کیا، بادشاہ اسی دن سوار ہوا، کوس دو کوس گیا ہوگا کہ بڑے زور کا بادل اٹھا اور چاروں طرف برف بچھ گئی، لوگوں نے خیام کی ہنسی اڑائی، بادشاہ نے چاہا کہ وہیں سے پلٹ جائے خیام نے کہا ابھی بادل پھٹے جاتے ہیں، اور پانچ دن تک زمین نم بھی نہ ہوگی۔ اتفاق یہ کہ خیام کی پیشین گوئی پوری اتری۔"

تصنیفات تصنیفات بہت کم ہیں، ازیج جو تیار کی تھی۔ اس کا ہمارے اسلامی ملکوں میں تو پتہ نہیں۔ لیکن یورپ نے چھاپ کر شائع کی ہے۔ باقی چند مختصر رسالے ذیل میں درج ہیں جن کا ذکر شہرزوری نے کیا ہے۔

طبعیات میں ایک مختصر رسالہ،

وجود کی حقیقت پر ایک رسالہ،

کون اور مسئلہ تکلیف پر ایک رسالہ، یہ رسالہ آجکل مصر میں چھاپا گیا ہے۔

عربی میں بہت سے شعر لکھے ہیں، چند ذیل میں درج ہیں (از شہرزوری)

یں برلی الدنیا بل السبعة اعلے	بل الافق الاعلی اذا جاش خاطری
اصوم علی الفحشاء جهرا وخفیة	عفافا و افطاری بتقدیس خاطری
وکم عصبة ضلت عن الحق فاهتدت	لطرق الهدی من فیضی المتقاطر
فان صراط المستقیم بصائر	نصبن علی وادی العمی کالقناطر
اذا قنعت نفسی بمیسور بلغة	یحصلها بالکد کفی وساعدی

سہ شہرزوری ۱۲۰ تاریخ الحکماء ۱۲

امنت تصاریف الحوادث کلها　　فکن یا زمانی موعدی او مساعدی
وهبنی اتخذت الشعری بین منازلی　　وفوق مناط الفرقدین مصاعدی
الیس قضی الرحمٰن فی حکمه بان　　یعید الی نحس جمیع المساعد
متی باعدت دنیاک کان مصیبة　　فواعجبا من ذا القریب المباعد
اذا کان محصول الحیاة منیة　　فسیان حالاه کل ساع وقاعد

رضیت دهرا طویلا فی التماس اخ　　یرعی ودادی اذا ذو خلة خانا
فکم الفت وکم آخیت غیر اخ　　وکم تبدلت بالاخوان اخوانا
وقلت للنفس لما عز مطلبها　　بالله لا تألفی ما عشت انسانا

رباعیات عجیب بات ہے۔ خیام فلسفہ میں، نجوم میں، فقہ میں، ادب میں، تاریخ میں، کمال رکھتا تھا، لیکن اتنے ستاروں کے ساتھ اُس کا افق شہرت بالکل تاریک ہے۔ جس چیز نے آٹھ سو برس تک اس کے نام کو زندہ رکھا۔ وہ چند فارسی رباعیاں ہیں، اور یہی اس کی شہرت کے بال پر واز ہیں، ان رباعیوں کے ساتھ مسلمانوں نے جس قدر اعتنا کیا۔ اُس سے ہزاروں درجہ بڑھ کر یورپ نے کیا۔

ہماری کتاب کا اصل موضوع شاعری ہے اس لئے سب سے پہلے ان رباعیوں کی تنقید میں ہم کو شاعری کا پہلو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ اگر ان رباعیوں میں کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ کوئی اخلاقی تعلیم نہیں ہے۔ کوئی دقیق نکتہ نہیں ہے تو نہ ہو۔ بحث صرف یہ ہے کہ شاعری اور شاعری کے ساتھ زبان کی خوبی اور صفائی ہے یا نہیں! یعنی خیام اگر حکیم نہ ہوتا تو کم از کم شاعر ہو سکتا تھا یا نہیں؟

شاعری کی بڑی ضروری شرط اسلوب بیان کی جدت اور دلآویزی ہے، شاعر ایک معمولی بات کو لیتا ہے۔ اور ایسے دلکشا اور ندرت آمیز اسلوب سے ادا کرتا ہے کہ سب وجد کرنے لگتے ہیں۔ اسلوب بیان کی دلآویزی کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ کبھی صرف زبان کی بے تکلفی، روانی اور شستگی یہ کام دیتی ہے، کبھی عام طریقہ ادا کے بدل دینے سے یہ بات پیدا ہوتی ہے۔ کبھی شاعرانہ طرز استدلال سے، کبھی شوخی و ظرافت سے، کبھی استعارہ و تشبیہ کی ندرت سے، اور ہیچ یہ ہے کہ اس کی تمام ادائیں متعین اور مشخص نہیں ہو سکتیں، سننے والے کو اتنا محسوس ہوتا ہے کہ کسی چیز نے دل میں چٹکی لے لی، کس نے لی،

کیوں لی، یہ کچھ نہیں معلوم۔

خوبی ہمہ در کرشمہ و ناز و خرام نیست	بسیار شیوہ ہاست بتان را کہ نام نیست

خیام کی رباعیاں اگرچہ سینکڑوں ہزاروں ہیں لیکن سب کا قدر مشترک صرف چند مضامین ہیں، دنیا کی بے ثباتی، خوشدلی کی ترغیب، شراب کی تعریف، مسئلۂ جبر، توبہ واستغفار ان میں سے ایک ایک مضمون کو وہ سو سو دفعہ کہتا ہے، لیکن ہر دفعہ اس طرح بدل کر کہتا ہے کہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی نئی چیز ہے۔

دنیا کی بے ثباتی اور اس سے عبرت کا مضمون نہایت پامال مضمون ہے۔ لیکن خیام ہر بار ایک ایسا نیا اسلوب ڈھونڈ لاتا ہے۔ کہ نیا اثر پیدا ہوتا ہے۔

توبہ واستغفار بھی ایک فرسودہ مضمون ہے۔ لیکن جس طرح خیام اس کو ادا کرتا ہے سننے والے کی آنکھ سے آنسو نکل پڑتے ہیں، بعض جگہ رقت انگیز طریقہ کو چھوڑ کر استدلال کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اور وہ بظاہر ایسا قوی ہوتا ہے۔ کہ گویا اس کا جواب نہیں ہو سکتا امثلۂ ذیل کو دیکھو۔

جدت اسلوب **رباعی**

بر سینۂ غم پذیر من رحمت کن	بر جان و دل اسیر من رحمت کن
بر پائے خرابات رو من بخشائے	بر دست پیالہ گیر من رحمت کن

مغفرت کی دعا مانگتا ہے۔ لیکن اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں یعنی ہات اور پاؤں کے لئے (گو وہ اسی کے ہات پاؤں ہیں۔) اس طریقہ سے دعا کا اثر بڑھاتا ہے، کیونکہ اپنے لئے دعا مانگنا پھر بھی ایک قسم کی ذاتی غرض ہے۔ اس کے ساتھ نکتہ یہ ہے کہ اعضاء کی برأت آسانی سے ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کا کیا قصور ہے، وہ اپنے اختیار سے کوئی کام نہیں کر سکتے۔ ہاتھ اور پاؤں کے مقابلہ میں صنعت طباق ہے۔ اور اس سے بھی ایک لطف پیدا ہو گیا ہے۔

در ملک تو از طاعت ما ہیچ فزود؟	وز معصیتے کہ ہست نقصانے بود؟
بگزار و مگیر زاں کہ معلوم شد	گیرندہ دیری و گزارندہ زود

خدا سے خطاب کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اے خدا اگر میں نے اطاعت کی تو کیا تیری سلطنت کو کچھ ترقی ہو گئی؟ اور اگر گناہ کیا تو کیا کچھ تیرا نقصان ہو گیا، اے خدا! مجھ کو چھوڑ دے اور گرفت نہ کر مجھ کو معلوم ہو گیا ہے۔ کہ تو دیر کے بعد پکڑتا ہے۔ اور جلد چھوڑ دیتا ہے۔

من بندۂ عاصیم رضائے تو کجا است — تاریک دلم نور صفائے تو کجا است
مارا تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی — آں بیع بود لطف و عطائے تو کجا است

کس شاعرانہ انداز سے مغفرت کرنے پر مجبور کرنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے کہ اے خدا اگر تو بہشت طاعت کے معاوضہ میں دے گا تو یہ خرید و فروخت ٹھیری (جو سوداگروں کا کام ہے نہ شاہوں اور شہنشاہوں کا) وہ لطف وہ عطا جس کے قصے سنا کرتے تھے وہ کہاں ہے۔ یہی مضمون ہے جس کو شیخ سعدی نے گلستان میں ادا کیا ہے۔ اور وہ گلستان کے خاص محاسن میں شمار کیا جاتا ہے "بدریوزہ گری آمدہ ام نہ بہ تجارت"۔

آنم کہ پدید گشتم از قدرت تو — صد سالہ شدم بناز و نعمت تو
صد سال بہ امتحان گنہ خواہم کرد — تا جرم من است بیش یا رحمت تو

دیکھو کس ادا سے مغفرت چاہتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں سینکڑوں برس دانستہ گناہ کرونگا مجھ کو یہ امتحان کرنا ہے کہ میرا جرم زیادہ ہے۔ یا تیری رحمت، یعنی دیکھوں ان دونو میں کون غالب آتا ہے۔

فریاد کہ عمر رفت بر بیہودہ — ہم لقمہ حرام ہم نفس آلودہ
فرمودۂ ناکردہ سیہ رویم کرد — فریاد ز کردہاے نا فرمودہ

فرائض کو فرمودۂ ناکردہ، اور گناہوں کو کردہاے نافرمودہ سے تعبیر کیا ہے۔

مشہور ہے کہ ایک دفعہ خیام کی صراحی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ اور ٹوٹ گئی۔ اس پر اس نے رباعی لکھی۔

ابریق مے مرا شکستی ربّا — بر من درِ عیش را بہ بستی ربّا
بر خاک بریختی مے لعل مرا — خاکم بدہن کہ سخت مستی ربّا

کہتے ہیں کہ اس گستاخی پر خدا نے اس کو سزا دی۔ اور اس کی گردن کج ہو گئی۔ اس پر اس نے برجستہ کہا۔

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو — واں کس کہ گناہ نہ کرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی — پس فرق میان من و تو چیست بگو

یعنی میں نے برائی کی، اب تو اس کی سزا بھی ویسی ہی برائی دیتا ہے۔ تو مجھ میں اور تجھ میں کیا فرق رہ گیا۔

طلب مغفرت کا مضمون اکثر شعرا نے باندھا ہے۔ نظامی کہتے ہیں۔

گناہ من ار نامدے در شمار	ترا نام کے بودے آمرزگاہ

اُردو کا ایک شاعر کہتا ہے۔

عوض نہ لے مرے جرم و گناہ بحد کا کہیں، کہیں نہ عدو دیکھکر مجھے محتاج	الٰہی تجھ کو غفورالرحیم کہتے ہیں یہ اُن کے بندے ہیں جن کو کریم کہتے ہیں

لیکن خیام کا طرز ادا اور استدلال سب سے اچھوتا ہے۔ وہ شاعرانہ استدلال سے سزا پانے کی حالت میں مجرم اور آقا کی مساوات ثابت کرتا ہے۔ اور پھر اس کو جملہ خبریہ کے ذریعہ سے نہیں بلکہ استفہام کے طریقہ سے ادا کرتا ہے جو نہائت مؤثر اور لاجواب کر دینے والا ہوتا ہے۔

شوخی و ظرافت خیام باوجود حکیم ہونے کے نہائت شوخ اور ظریف الطبع تھا، اس لئے اکثر مضامین کو ظرافت اور شوخی کے پیرایہ میں ادا کرتا ہے۔ مثلاً

اے چرخ نہ گردشِ تو خرسندنیم گر میل تو با ئے خرد و نا اہل است	آزاد کنم کہ لائق بند نیم من نیز چناں اہل و خردمند نیم

ایشیا کا عام خیال ہے کہ آسمان ارباب خرد کو آرام اور چین نہیں دیتا۔ خیام آسمان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔ کہ میں تیری چالوں سے بہت تنگ آگیا ہوں اگر تو احمقوں اور ناہلوں ہی سے محبت رکھتا ہے۔ تو میں بھی کچھ بہت اہل اور عاقل نہیں ہوں۔

در مسجد اگر بہر نیاز آمدہ ام یک روز ایں جا سجادۂ دزدیدم گویند کہ مے مخور کہ شعبان نہ رواست شعبان و رجب مہِ خدا اند و رسول	باللہ کہ نہ از بہر نماز آمدہ ام آں گم شدہ است از آں باز آمدہ ام نہ نیز رجب کہ آں مہ خاص خدا ست ما مے رمضان خوریم کاں خاصۂ ماست

ایران میں اکثر مہینوں کے خاص خاص لقب ہیں، مثلاً شعبان کو رسول کا مہینہ اور رجب کو خدا کا مہینہ کہتے ہیں خیام کہتا ہے کہ لوگ ان مہینوں میں شراب پینے سے منع کرتے ہیں۔ کہ یہ خدا و رسول کے مہینے ہیں۔ اور واقعی ان کی یہ ہدائت بجا ہے۔ اِس بنا پر میں رمضان میں شراب پیتا ہوں۔ کہ یہ خاص ہم لوگوں کا مہینہ ہے۔

گویند کہ آں کساں کہ با پرہیز اند ما با مے و معشوق از انیم مقیم	زاں ساں کہ میرند بداں ساں خیزند تا بو کہ بحشر آں چناں انگیزند

مشہور ہے کہ انسان جس حالت میں مرتا ہے اسی حالت میں قیامت میں اٹھیگا۔ خیام کہتا ہے اسی لئے تو میں رات دن شراب اور معشوق کے ساتھ بسر کرتا ہوں کہ قیامت میں بھی اسی حالت میں اٹھوں

گویند کہ ماہ روزہ نزدیک رسید — من بعد بگرد بادہ نتواں گردید
در آخر شعبان بخورم چنداں مے — کاندر رمضان مست بخسپم تا عید

ایران میں جتنے شرابخور ہیں۔ رمضان میں شرابخوری چھوڑ دیتے ہیں خیام کہتا ہے کہ میں شعبان کے آخیر میں اتنی پی کر سوؤں گا، عید کے بعد نشہ اترے۔ قاآنی نے اسی مضمون کو نیچرل بنادیا ہے

مے خوردن ایں ماہ روا نیست ولیکن — مستانہ تواں خورد بہ شب یکدو سہ ساغر
یا خورد بداں گونہ بباید کہ ز مستی — تا شام دگر بر نتواں خاست ز بستر

لیکن ایک اور شاعر نے سب سے لطیف پیرایہ اختیار کیا ہے ایک غزل میں جسکی ردیف نبید الستم ہے کہتا ہے

قرب یک ماہ بہ میخانہ اقامت کردم — اتفاقاً رمضان بود نمے دانستم
ہر گہ کہ طلوع صبح ازرق باشد — باید کہ بکف جام مروق باشد
گویند بہ افواہ کہ مے تلخ بود — شاید کہ بہر حال کہ مے حق باشد

عربی کا فقرہ ہے الحق مُرّ یعنی حق بات تلخ ہوتی ہے خیام کہتا ہے کہ شراب کا مزا تلخ ہوتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب حق ہے۔ مرزا غالب نے اسی سے ایک اور مضمون پیدا کیا ہے۔

گفتہ کہ بہ تلخی بساز و پند پذیر — برو کہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پند است

یعنی تم یہی ہدایت کرتے ہو نہ کہ انسان کو تلخی گوارا کرنی چاہیے۔ اور نصیحت سننی چاہیے تو ہماری شراب تمہاری نصیحت سے زیادہ تلخ ہے۔ ہم کو دوسری تلخی کی کیا ضرورت ہے۔

دست چو منے کہ جام و ساغر گیرد — حیف است کہ آں دفتر و منبر گیرد
تو زاہد خشکی و منم فاسق تر — آتش نشنیدہ کہ در تر گیرد

من در رمضان روزہ اگر مے خوردم — تا ظن نبری کہ بے خبر مے خوردم
از محنت روزہ روز من چوں شب شد — پنداشتہ بودم کہ سحر مے خوردم

طبعم بہ نماز و روزہ چوں مائل شد — گفتم کہ مراد کلیتم حاصل شد
افسوس کہ ایں وضو بیادے بشکست — واں روزہ بہ نیم جرعہ باطل شد

اسمیں ظرافت کیساتھ اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ جو لوگ ظاہری نماز روزہ ادا کرتے ہیں انکی عبادت کی ہستی بس ایسی ہی ہے

گویند کہ فردوس بریں خواہد بود　　آں جا مے ناب و حور عین خواہد بود
گر مامے و معشوق گزیدیم چہ باک　　چوں عاقبت کار چنیں خواہد بود

جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ بہشت میں بھی جسمانی آرام و عیش ہوگا اور شراب اور حوریں ملینگی، ظریفانہ پیرایہ میں انکا ردکرتا ہے۔ کہ اگر وہاں بھی یہی سب ہوگا۔ تو اگر ہم نے دنیا ہی میں ان چیزوں کو پیشگی اختیار کر لیا تو

زاہد گوید بہشت با حور خوش است　　من میگویم شراب انگور خوش است
ایں نقد بگیر و دست ازاں نسیہ بدار　　آواز دہل شنیدن از دور خوش است
مارا گویند دوزخی باشد مست　　قولیست خلاف دل درو نتوان بست
گر عاشق و مست دوزخی خواہد بود　　فردا بینی بہشت را چوں کف دست

یعنی اگر یہ صحیح ہے کہ عاشق اور مست بہشت میں نہ جانے پائیں گے تو دیکھ لینا بہشت چٹیل میدان کی طرح خالی پڑی ہوگی، یعنی عشق اور مستی لازمۂ انسانی ہے اس سے کون شخص خالی ہو سکتا ہے

گویند بہشت و حور و کوثر باشد　　جوئے مے و شہد و شیر و شکر باشد
یک جام بدہ زبادہ ام اے ساقی　　نقدے زہزار نسیہ بہتر باشد
از ہر چہ خورد مرد شراب اولی تر　　با سبز خطان بادۂ ناب اولی تر
عالم ہمہ سر بسر رباطیست خراب　　در جائے خراب ہم خراب اولی تر
مائیم خریدار مے کہنہ و نو　　وانگہ فروشندۂ عالم بہ دو جو
گفتی کہ پس از مرگ کجا خواہم رفت　　مے پیش من آر و ہر کجا خواہی رو
آں بادۂ خوشگوار بر دستم نہ　　آں ساغر چوں نگار بر دستم نہ
آں مے کہ چو زنجیر نہ پیچد بر خود　　دیوانہ شدم بیار بر دستم نہ
نہ لائق مسجدم نہ در خورد کنشت　　ایزد داند گل مرا از چہ سرشت
نہ دین و دنیا و نہ امید بہشت　　چوں کافر درویشم و چوں قحبۂ زشت

دین و دنیا دونو سے محروم ہونے کی اس سے اچھی کوئی تمثیل نہیں مل سکتی، کافر فقیر اور بدصورت قحبہ، یہ دونو دین و دنیا کسی سے بہرہ یاب نہیں۔

دنیا کی بے ثباتی اور عبرت انگیزی

دنیا کی بے ثباتی اور عبرت زا ہونا بزرگ پایہ شعرا کا سب سے بڑا موضوع ہے سعدی، حافظ، ابن یمین، ناصر خسرو، سحابی نجفی، کی تمام کائنات یہی ہے اس مضمون کی ابتدا اور حقیقت خیام نے کی اور اس درجہ تک اس کو پہنچا دیا کہ سعدی

اور حافظ جیسے بلند پایہ شاعر گویا اُسی کی سکھائی ہوئی چالیں چلتے ہیں نصیحت سے قطع نظر خیام کی زورِ شاعری کا بھی اِس سے اندازہ ہو سکتا ہے، اس نے سو سو دفعہ اس مضمون کو باندھا ہے لیکن قوتِ تخئیل سے ہر دفعہ ایک نیا پیرایہ پیدا کر دیتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی اور خنجر ہے جو دل پر چرکے لگا رہا ہے۔

خاکے کہ بزیر پائے ہر حیوانے است	زلفِ صنمے و عارضِ جانانے است
ہر خشت کہ بر کنگرۂ ایوانے است	انگشتِ وزیرے و سرِ سلطانے است

شیخ سعدی نے اس مضمون کیلئے فرضی حکایتیں لکھی ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں۔

شنیدم کہ یکبار در دجلۂ	سخن گفت با عابدے کلۂ
کہ من فرّ فرماندہی داشتم	بسر بر کلاہ مہی داشتم الخ

ایک اور شعر میں نہایت دردانگیز طریقہ سے اس کو ادا کیا ہے۔

زدم تیشہ یک روز بر تل خاک	بگوشم آمد نالۂ دردناک
کہ زنہار اگر مردے آہستہ تر	کہ چشم و بنا گوش و روے است و سر

یعنی میں نے ایک دن مٹی کے ایک تودے پر پھاوڑا مارا، میرے کان میں یہ دردناک آواز آئی کہ میاں ذرا آہستہ، یہاں آنکھیں ہیں، کان ہیں، چہرہ ہے، سر ہے۔ (ان کو چوٹ نہ لگ جائے) لیکن سعدی کی یہ تمام نقش آرائیاں خیام ہی کے مرقع کا عکس ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

دے کوزہ گرے بدیدم اندر بازار	بر تازہ گِلے لگد ہمے زد بسیار
واں گِل بزبانِ حال با او میگفت	من ہمچو تو بودہ ام مرا نیکو دار

سعدی کے شعر میں اگرچہ "آہستہ تر" اور اعضا کے مفرد ناموں نے ایک خاص اثر پیدا کیا ہے لیکن طلب رحم کی علت خیام کے ہاں زیادہ قوی ہے یعنی یہ کہ میں بھی تمہاری ہی طرح تھا۔ اسلئے مجھ سے یہ سلوک نہ کرو۔ اس سے بھی زیادہ مؤثر طریقہ میں اسی مضمون کو ادا کرتا ہے۔

پیش از من و تو لیل و نہارے بودہ است	گردندہ فلک نیز بکارے بودہ است
زنہار قدم بخاک آہستہ نہ	کیں مردمک چشم نگارے بودہ است

اسی مضمون کے اور پیرائے دیکھو۔

ایں کہنہ رباط را کہ عالم نام است	آرامگہ ابلق صبح و شام است
بزمے است کہ وا ماندۂ صد جمشید است	قصرے است کہ تکیہ گاہ صد بہرام است

خوش باش کہ غصہ بیکراں خواہد بود — بر چرخ قران اختران خواہد بود
خشتے ز قالب تو خواہند زدن — ایوان و سرائے دیگراں خواہد بود

اے کوزہ گر آب نوش اگر ہشیاری — تا چند کنی بر گِل آدم خواری
انگشت فریدوں و کف کیخسرو — بر چرخ نہادۂ چہ مے پنداری

یعنی اے کمہار کچھ جانتا ہے۔ تو نے چاک پر کیا چڑھا رکھا ہے، فریدوں کی انگلی اور کیخسرو کی ہتھیلی

جامے است کہ عقل آفریں میزندش — صد بوسہ ز مہر بر زمیں میزندش
دیں کوزہ گر دہر چنیں جام لطیف — مے سازد و باز بر زمیں میزندش

بر سنگ زدم دوش سبوی کاشی[1] — سر خوش بودم کہ کردم ایں اوباشی
با من بزبان حال مے گفت سبو — من چوں تو بُدم تو نیز چوں من باشی

ایں کوزہ چو من عاشق زارے بودہ است — واندر طلب روئے نگارے بودہ است
ایں دستہ کہ بر گردن او مے بینی — دستے است کہ در گردن یارے بودہ است

خمریات جس طرح عربی زبان میں **ابو نواس** شراب کا جاندادہ ہے۔ فارسی میں **خیام** دور جام کا ستم زدہ ہے۔ وہ جس شغف، جس شوق، جس بیخودی، جس بے اختیاری جوش سے شراب کا نام لیتا ہے۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ درحقیقت شراب پیتا تھا۔ اور یہی ظاہری شراب پیتا تھا۔ افسوس ہے کہ وہ فلسفی اور حکیم تھا، صوفی نہ تھا۔ ورنہ حافظ کی طرح یہی شراب شرابِ معرفت بن جاتی۔

خیام کا آدھا کلام شراب ہی کے ذکر میں ہے۔ اکثر مضامین اور خیالات جو اُس نے شراب کے متعلق ظاہر کئے ہیں، خواجہ حافظ نے اُن ہی کو لے کر زیادہ شوخ کر دیا ہے۔ تاہم کہیں کہیں جو بدمستی اور بیخودی اس کے کلام میں پائی جاتی ہے، خواجہ حافظ اب بھی اس حد تک نہیں پہنچے۔

من بے مے ناب زیستن نتوانم — بے جام کشیدہ بار تن نتوانم
من بندۂ آں دمم کہ ساقی گوید — یک جام دگر بگیر، و من نتوانم

باہم خریدارے کہنہ و نو — وانگاہ فروشندۂ عالم بدو جو
گفتی کہ پس از مرگ کجا خواہم رفت — مے پیش من آر و ہر کجا خواہی رو

[1] یعنی شہر کاشی کا بنا ہوا گھڑا ۱۲

اس سرمستی اور بے اعتنائی کو دیکھو، ایک شخص مذہبی خیالات میں ڈوبا ہوا، قیامت کے حالات کا متجسس ہے۔ خیام کے پاس آتا ہے۔ اور نہایت تردد اور تفحص کے لہجہ میں پوچھتا ہے۔ کہ مرنے کے بعد کہاں جانا ہوگا؟ وہ کس بے تکلفی سے جواب دیتا ہے کہ میاں شراب لاکر میرے سامنے رکھ دو اور جہاں جی چاہے جاؤ، مجھ کو کیا غرض)

بااین ہمہ زیادہ تحقیق و تلاش سے معلوم ہوتا ہے کہ خیام اگر شراب پیتا بھی تھا۔ تو رندانہ نہیں بلکہ حکیمانہ پیتا تھا۔ اگرچہ شرعاً یہ بھی ممنوع اور حرام ہے۔ خیام کہتا ہے کہ شراب پینے میں ان باتوں کا لحاظ شرط ہے، کس کو پینی چاہیے؟ کتنی پینی چاہیے؟ کن لوگوں کی صحبت میں پینی چاہیے؟ ان شرطوں کا لحاظ رکھا جائے۔ تو ثابت ہوگا کہ عقلمند کے سوا اور کوئی شراب پی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ عقلمند ہی ان شرائط کا لحاظ رکھ سکتا ہے۔

مے گرچہ حرام است ولے تا کہ خورد؟	آنگاہ چہ مقدار؟ و دگر با کہ خورد؟
ہرگاہ کہ ایں چہار شرط آید جمع	پس مے نخورد مردم دانا کہ خورد

پھر صاف صاف بتاتا ہے کہ کس طرح پینی چاہیے۔

کم کم خور و گہ گہ خور و تنہا مے خور

چوں ہشیارم طرب ز من پنہان است	ور مست شوم در خردم نقصان است
حالے است میان مستی و ہشیاری	من بندۂ آنکہ زندگانی آں است

یعنی شراب کی وہ حالت پسندیدہ ہے جب انسان مست ہو جائے۔ نہ یہ کہ مطلق اثر نہ پڑے۔ مستی اور ہشیاری کے بیچ میں ایک حالت ہے۔ اور میں اسی کا غلام ہوں۔

چوں بادہ خوری ز عقل بیگانہ مشو	مدہوش مباش و جہل را خانہ مشو
خواہی کہ مے لعل حلالت باشد	آزار کسے مجوئے و دیوانہ مشو
گر بادہ مے خورم نشان خامی است	ور نیز مدام میخورم بدنامی است
مے شاہ و حکیم و رند باید کہ خورد	ور زیں سہ نہ اخورد کہ دشمن کامی است

اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ شراب پینی گو اعتدال ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو ہر حال میں حرام ہے اور جو شخص جواز کا فتویٰ دیتا ہے سخت اخلاقی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے لیکن اگر تمہارے سامنے دو شخص آئیں ایک نیک طینت، بے ریا، سچا دیانتدار ہے لیکن شراب پیتا ہے۔ دوسرا شراب نہیں پیتا نماز روزہ بھی ادا کرتا ہے لیکن رات دن تکفیر

بد گوئی اور غیبت میں مصروف رہتا ہے، وقف کے مال پر شرعی حیلوں سے تصرف کرتا ہے۔ احکام شرعیہ کو اپنی خواہش کے موافق ڈھالتا رہتا ہے۔ تو تم ان دونوں میں سے کس کو پسند کروگے؟ غور کرو، جو لوگ شراب نہیں پیتے وہ شراب سے زیادہ گناہ کس بیباکی سے کرتے ہیں۔ خیام ان لوگوں کو مخاطب کرکے کہتا ہے۔

تو فخر ہمے کنی کہ مے نہ خوری	صد کار کنی کہ مے غلام است اورا

خواجہ حافظ نے اسی نکتہ کو نہائت بلیغ پیرایہ میں ادا کیا ہے۔

فقیہ مدرسہ دی مست بود و فتوےٰ داد	کہ مے حرام، ولے بہ زمال اوقاف است

فلسفہ

فلسفہ کیا چیز ہے؟ "حقائق اشیاء کا ادراک" ہمارے گرد و پیش جو کچھ نظر آتا ہے۔ اُن پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں۔ تو خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ کیا چیزیں ہیں؟ کیونکر وجود میں آئیں؟ کس چیز سے حاصل ہوئیں؟ مفرد ہیں یا مرکب، ان کے ذاتیات کیا ہیں؟ خواص کیا ہیں؟ لوازم کیا ہیں؟ پھر ہم چند چیزوں کو ساتھ ساتھ یا آگے پیچھے وجود میں آتا دیکھتے ہیں۔ اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان میں کوئی باہم خاص تعلق ہے؟ یا اتفاقیہ ان کا ساتھ ہوگیا ہے؟ تعلق ہے تو کس قسم کا ہے؟ کیا نوعیت ہے؟ کیوں ہے؟ غرض یہ اور اس قسم کے جتنے سوالات ہیں۔ فلسفہ کا مایۂ خمیر ہیں۔ اور ان کا جواب دینا فلسفہ کا فرض ہے۔ لیکن ان سب سوالوں سے مقدم یہ سوال ہے۔ کہ کیا ہم اشیاء کی حقیقت کو جان سکتے ہیں؟ عموماً تمام حکما اس کا جواب اثبات کی صورت میں دیتے ہیں۔ لیکن ہر زمانہ میں ایسے حکما بھی ہوتے آئے ہیں، اور اب بھی ہیں۔ جن کی رائے ہے کہ کسی چیز کی حقیقت معلوم نہیں ہوسکتی ہربرٹ اسپنسر نے تمام اشیاء کی دو قسمیں کی ہیں، ۱؎ وہ چیزیں جو فوق الادراک ہیں، اور انسان کے دائرۂ علم میں نہیں آسکتیں، ۲؎ وہ چیزیں جو تحت ادراک ہیں۔ پہلی قسم پر اس نے ایک خاص رسالہ لکھا ہے۔ اور بتادیا ہے۔ کہ اُن کے متعلق کسی قسم کی تحقیقات کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے شاپن ہور (جرمن کا فلسفی) سرے سے انکار کرتا ہے۔ یعنی کسی چیز کی حقیقت معلوم نہیں ہوسکتی خیام کا بھی یہی مذہب ہے۔ غور کرو۔ اور خوب غور کرو، جن چیزوں کی نسبت ہم کو یقین ہے کہ ہم جانتے ہیں، ان کو بھی ہم کیا جانتے ہیں سب سے زیادہ محسوس، بدیہی، اور نمایاں مادہ یا جسم ہے۔ لیکن غور سے دیکھو مادہ کو ہم کس حد تک جانتے ہیں، ہم مادہ

کے چند خواص جانتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں۔ کہ مادہ تحلیل ہوتے ہوتے ایسے چھوٹے چھوٹے اجزاء تک منتہی ہوتا ہے، جو پھر تحلیل نہیں ہو سکتے۔ اور ان کو اجزائے دیمقراطیسی کہتے ہیں۔ ان اجزاء میں حرکت، وزن، کشش اتصالی، کشش ثقل اور چند خواص پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ اجزا کے خواص اور اعراض ہیں، ان کی اصلی حقیقت کیا ہے؟ کیونکر وجود میں آئے، کہاں سے آئے؟ یہ چیزیں بالکل غیر معلوم ہیں۔ اس سے بھی زیادہ صاف مثال میں سمجھو، ہم نے ایک سیب ہاتھ میں لیا ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اس کو جانتے ہیں۔ اور بداہتہً جانتے ہیں۔ لیکن غور کرو، ہم کیا جانتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک خاص مقدار رکھتا ہے۔ اس میں خوشبو ہے، رنگ ہے، مزہ ہے، لیکن ساخت، خوشبو، رنگ، مزہ یہ سب تو اوصاف ہیں۔ جن کو قدیم فلسفہ کی زبان میں **عرض** کہتے ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز جوہر قائم بالذات نہیں، حالانکہ سیب قائم بالذات چیز ہے۔ اس لئے ہم کو سیب کی اصلی حقیقت کچھ بھی نہیں معلوم ہوئی۔

علت و معلول کا سلسلہ جو ہم کسی چیز میں قائم کرتے ہیں جس قدر تحقیقات بڑھتی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ ناقابل اعتبار ثابت ہوتا جاتا ہے۔ اور پھر اصلی علت کا پتہ نہیں لگتا اوپر سے جو چیز گرتی ہے۔ زمین پر آتی ہے۔ یونانی حکماء کی تحقیقات کے مطابق اسکی وجہ یہ تھی کہ ان چیزوں کا مرکز زمین ہے اور ہر چیز مرکز کی طرف کھنچتی ہے۔ لیکن نیوٹن نے اس کی غلطی ثابت کی اور بتایا کہ تمام اجسام میں جذب کی خاصیت ہے۔ اور چونکہ زمین بڑا جسم ہے۔ اس لئے وہ اپنے سے چھوٹے تمام اجسام کو اپنی طرف جذب کرتا ہے۔ لیکن اس سے اصل مسئلہ کیا حل ہوا، اس قدر بے شبہ معلوم ہوا کہ اوپر سے گرنے کی علت تجاذب اجسام ہے۔ لیکن تجاذب اجسام کی کیا علت ہے۔ یعنی اجسام میں جذب کی خاصیت کیوں ہے؟ یہ مسئلہ اب بھی اسی طرح لاینحل ہے۔ غرض اسی طرح درمیانی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اوپر چل کر، پھر وہی لاعلمی پیش آتی ہے۔ ایک راز کھلتا ہے۔ تو دوسرا راز پیدا ہوتا ہے۔ ایک گرہ کھلتی ہے تو دوسری گرہیں پڑ جاتی ہیں۔

	فلسفی سر حقیقت نتوانست کشود		گشت رازے دگر آں راز کہ افشا میکرد	

اسی بنا پر دقیق النظر حکماء کا یہی مذہب ہے کہ "ہم کو کچھ معلوم نہیں" سقراط نے تمام عمر کی تحقیقات کے بعد یہی کہا "معلومم شد کہ ہیچ معلوم نشد" خیام کا بھی یہی

مذہب ہے۔ خیام نے اس رائے کو نہائت صراحت اور نہائت کثرت سے بیان کیا ہے۔

کس مشکل اسرار فلک را نکشاد
کس یک قدم از نہاد بیروں نہاد
چوں بنگرم از مبتدئ تا اُستاد
عجز است بدست ہر کہ از مادر زاد

آنہا کہ محیط فضل و آداب شدند
در کشف دقیقہ شمع اصحاب شدند
رہ زیں شب تاریک نبردند بروں
گفتند فسانۂ و در خواب شدند

آنہا کہ جہاں زیر قدم فرسودند
واندر طلبش ہر دو جہاں پیمودند
آگاہ نمے شوم کہ ایشاں ہرگز
زیں حال چناں کہ ہست آگہ بودند

جمعے متفکرند در مذہب و دیں
جمعے متحیرند در شک و یقیں
ناگاہ منادیے بر آید ز کمیں
کاے بیخبراں راہ نہ آنست و نہ ایں

افسوس کہ سرمایہ ز کف بیروں شد
در دست اجل بسے جگرہا خوں شد
کس نامد ازاں جہاں کہ تا پرسم ازو
کاحوال مسافران عالم چوں شد

ہر چند کہ رنگ و بوئے زیباست مرا
چوں لالہ رُخ و چو سرو بالاست مرا
معلوم نہ شد کہ در طربخانۂ خاک
نقاش من از بہر چہ آراست مرا

کس را پس پردۂ قضا راہ نہ شد
وز سرِ خدا ہیچ کس آگاہ نہ شد
ہر کس ز قیاس خویش چیزے گفتند
معلوم نگشت و قصہ کوتاہ نہ شد

دل سرِ حیات را کما ہی دانست
در موت ہم اسرار الٰہی دانست
امروز کہ با خودی ندانستی ہیچ
فردا کہ ز خود روے چہ خواہی دانست

تم کو خیال ہوگا کہ اگر لاعلمی ہی خیام کا فلسفہ ہے، تو جتنے جاہل ہیں سب فلسفی ہیں لیکن یہ خیال صحیح نہیں، سقراط سے لوگوں نے کہا کہ جب تم بھی کچھ نہیں جانتے، اور ہم بھی نہیں جانتے تو ہم میں تم میں کیا فرق ہے۔ اُس نے کہا صرف یہ کہ میں جانتا ہوں کہ میں نہیں جانتا اور تم یہ بھی نہیں جانتے کہ "تم نہیں جانتے"۔

علم عموماً دو قسم کا ہوتا ہے، عالمانہ اور جاہلانہ، زمین، آفتاب، ماہتاب، ان سب چیزوں کو ایک گنوار بھی جانتا ہے۔ لیکن جاہلانہ جانتا ہے۔ ایک کسان بھی جانتا ہے کہ ایک زمین میں ایک وقت دو اناج پیدا نہیں ہو سکتے۔ اِسی کو علم نباتات کا ایک عالم بھی جانتا ہے لیکن دونو کے جاننے میں کس قدر فرق ہے۔ لاعلمی کا بھی یہی حال ہے۔

ایک فلسفی بھی جانتا ہے کہ وہ خدا کی حقیقت کو نہیں جان سکتا ایک جاہل بھی اس کا اقرار کرتا ہے، لیکن دونو میں کس قدر فرق ہے۔

خیام کو اس لاعلمی پر ناز ہے، اور کہتا ہے کہ ہر شخص اس لاعلمی کے رتبہ تک نہیں پہنچ سکتا

تو بے خبری بے خبری کار تو نیست ❊ ہر بے خبری را نرسد بے خبری

اسی کو ایک اور شاعر نے شاعرانہ انداز میں ادا کیا ہے۔

تا بجائے رسیدہ دانش من ❊ کہ بدانم ہمے کہ نادانم

یعنی میرا علم اب اس درجہ پہنچ گیا ہے کہ یہ جانتا ہوں، کہ میں نہیں جانتا، ایک اور موقع پر خیام کس ادّعا سے کہتا ہے

رندے دیدم نشستہ بر سنگِ زمین ❊ نہ کفر نہ اسلام نہ دنیا و نہ دین
نے حق، نہ حقیقت، نہ شریعت، نہ یقین ❊ اندر دو جہاں کرا بود زہرۂ این

لاعلمی کا فلسفہ صحیح ہو یا نہ ہو لیکن دیکھو اس کا اثر کیا ہے۔

ہر قسم کی تحقیقات، انکشافات، جدید اطلاعات، کا سر چشمہ یہی لاعلمی کا فلسفہ ہے، گر ہم کو یقین ہو جائے کہ ہم سب کچھ جانتے ہیں۔ یا جس چیز کو جانتے ہیں۔ اسکی تہ تک پہنچ گئے ہیں تو علمی تجسس کیلئے کیا رہ جاتا ہے؟ آئندہ ہم کو کیوں تلاش ہوگی ہم کیوں جد و جہد میں مصروف ہونگے؟ لاعلمی کا فلسفہ ہمارا شمع راہ ہے۔ وہ ہم کو ہر قدم پر آگے بڑھاتا ہے۔ ہم جس قدر جانتے جاتے ہیں اُس کو نہ جاننا کہتے ہیں۔ اور آگے بڑھتے ہیں۔ خیام گویہ فلسفہ سکھاتا ہے۔ کہ تم کو کچھ معلوم نہیں، لیکن معلوم کرنے کی خواہش کی ترغیب دلاتا ہے۔

گر از پئے شہوت و ہوا خواہی رفت ❊ از من خبرت کہ بے نوا خواہی رفت
بنگر چہ کسی و از کجا آمدہٗ؟ ❊ مے داں کہ چہ میکنی؟ کجا خواہی رفت

تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ کہاں جاؤ گے؟ خیام ان سوالوں کی تحقیقات کرنےکی تلقین کرتا ہے۔ اُن سے بڑھ کر فلسفہ کے اور کیا مسائل ہو سکتے ہیں۔

ایک اور نکتہ نہایت غور کے قابل ہے۔ اسلامی بیشمار فرقوں کو دیکھو، اُن کے باہمی مسائل مختلفہ کیا ہیں، خدا فاعل بالایجاد ہے۔ یا بالارادہ؟ خدا کے صفات عین ذات ہیں یا خارج؟ قدیم ہیں یا حادث؟ خدا کا کلام نفسی ہے یا لفظی؟ یہ مسائل کس قدر فوق الادراک ہیں، جب خدا کی حقیقت ہی معلوم نہیں تو یہ کیا معلوم کہ اُس کے اوصاف کیا ہیں، بااینہمہ

ہر فرقہ کو قطعی یقین ہے کہ اس کو جو کچھ معلوم ہے قطعی ہے۔ اور اس قدر قطعی ہے۔ کہ جو شخص اس کے خلاف کہتا ہے۔ وہ گمراہ ہے۔ جاہل ہے۔ کور باطن ہے۔ مرتد ہے۔ کافر ہے۔ ملعون ہے، معتزلہ، قدریہ، اشعریہ، حنابلہ، شیعہ، سُنّی، سب ایک دوسرے کو کافر اور گمراہ کہتے ہیں۔ یہاں تک جنگ و جدل تک نوبت پہنچی ہے۔ اور بغداد کے گلی کوچے مسلمانوں کے خون سے رنگین نظر آتے ہیں۔

اگر ان بزرگوں کا خیام کے فلسفہ پر عمل ہوتا یعنے یہ کہ یہ مسائل فوق الادراک ہیں ہم جس قدر جانتے ہیں، نہ جاننے کے برابر ہے، مذہبی حیثیت سے ہمارا اسی قدر فرض ہے۔ کہ اجمالی ایمان لائیں یعنی یہ کہ خدا ہے، جانتا ہے، دیکھتا ہے، سنتا ہے، بولتا ہے، باقی یہ تدقیقات کہ ان اوصاف کی حقیقت کیا ہے۔ اس کی ہمکو شارع نے تکلیف نہیں دی، تو آج بارہ سو برس سے مسلمانوں کے فرقوں میں جو نزاعیں جنگ و جدل، معرکہ آرائیاں اور خوں ریزیاں ہوتی رہیں۔ کیوں ہوتیں۔

ہاتف شیرازی نے کیا خوب کہا ہے۔

یکے از کفر مے لافد دگر طامات مے بافد　　بیا کایں داوری ہا را بہ پیش داور اندازیم

جبر یعنی انسان کا مجبور ہونا، جبر ایک نہائت دقیق مسئلہ ہے۔ اور گو بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس سے کوئی مفر نہیں، قدریہ کا تمام تر زور استدلال ارادہ پر ہے یعنی یہ کہ انسان کا ارادہ اُس کے اختیار میں ہے۔ اس لئے انسان مختار ہے۔ لیکن زیادہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان کا ارادہ بھی اس کی اختیاری چیز نہیں، ارادہ کے جب تمام اسباب جمع ہو جائیں گے۔ ارادہ خواہ مخواہ پیدا ہو گا۔ اُس کا روکنا یا نہ پیدا ہونے دینا انسان کے اختیار میں نہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ جبر کے نام سے بھاگتے ہیں۔ اور جبریہ کو کافر بتلاتے ہیں خود جبریہ ہیں۔ لیکن مُنہ سے اقرار نہیں کرتے۔ اشاعرہ جبر کے قائل نہیں بلکہ کہتے ہیں۔ کہ "انسان کو اپنے افعال پر قدرت ہے" لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ "یہ قدرت مطلقاً کچھ اثر نہیں رکھتی"۔ تو پھر ایسی قدرت سے کیا فائدہ؟ اسی بنا پر سلم الثبوت میں لکھا ہے۔ کہ "اشاعرہ کا کسب، اور جبریہ کا جبر دونو توام بھائی ہیں"۔ بہر حال ہم اس بحث کا فیصلہ نہیں کرتے جبر صحیح ہو یا غلط خیام جبر کا قائل اور معتقد تھا۔

ایزد چو نہ خواست آنچہ من خواستہ ام — کے گردد راست آنچہ من خواستہ ام
گر ہست صواب آنچہ او خواستہ است — پس جملہ خطا است آنچہ من خواستہ ام

نقشے است کہ بر وجود ما ریختہ — صد بو العجبی زما برانگیختہ
من زاں بہ ازیں نمے توانم بودن — کز بوتہ چنیں مرا فرو ریختہ

از آب و گلم سرشتۂ من چہ کنم — ویں پشم و قصب تو رشتۂ من چہ کنم
ہر نیک و بدی کہ از من آید بوجود — تو بر سر من نوشتۂ من چہ کنم

سازندۂ کار مردہ و زندہ توئی — دارندۂ ایں چرخ پراگندہ توئی
من گرچہ بدم صاحب ایں بندہ توئی — کس را چہ گنہ چو آفرینندہ توئی

انہیں خیالات کو خواجہ حافظ نے عجیب عجیب پیرایوں میں ادا کیا ہے۔

برو اے زاہد و دعوت مکنم سوئے بہشت — کہ خدا در ازل از بہر بہشتم نہ سرشت

فلسفۂ زندگی خیام کا فلسفۂ زندگی، بظاہر اپیکورس کی آواز بازگشت ہے۔ یعنی یہ کہ گزشتہ اور آئندہ سے کچھ بحث نہیں۔ جو کچھ ہے حال ہے۔ اس میں کھاؤ، پیو، خوش رہو، وگر، ہیچ مصرعہ چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند۔

در وقت بہار اگر بتے حور سرشت — پرمے قدحے دہد مرا بر لب کشت
گرچہ بہ بر کس ایں سخن باشد زشت — سگ بہ ز من ار دگر برم نام بہشت

یک شیشہ شراب و لب یار و لب کشت — ایں جملہ مرا نقد و ترا نسیہ بہشت
قومے بہ بہشت و دوزخ اندر گروند — کہ رفت بدوزخ؟ و کہ آمد ز بہشت

روزے کہ گزشتہ است ازو یاد مکن — فردا کہ نیامدہ است فریاد مکن
بر نامدہ و گزشتہ بنیاد مکن — حالے خوش باش و عمر بر باد مکن

از درس علوم جملہ بگریزی بہ — و اندر سر زلف دلبر آویزی بہ
زاں پیش کہ روزگار خونت ریزد — تو خون پیالہ در قدح ریزی بہ

زاں پیش کہ بر سرت شبیخوں آرند — فرمائے کہ تا بادۂ گلگوں آرند
تو زر نۂ اے غافل ناداں کہ ترا — در بوتہ نہند و باز بیروں آرند

ایں عقل کہ در رہ سعادت پوید — روزے صد بار خود ترا مے گوید
دریاب تو ایں یکدمہ فرصت کہ نۂ — آں ترہ کہ بدروند و آخر روید

دریاب کہ از روح جدا خواہی رفت مے نوش ندانی از کجا آمدۂ	در پردۂ اسرار فنا خواہی رفت خوش باش ندانی کہ کجا خواہی رفت
بائیم خسرہ پدا ہے کہنہ و نو گفتی کہ پس از مرگ کجا خواہی رفت	وانگاہ فرستندۂ عالم بدوجو مے پیش من آر و ہر کجا خواہی رد

یہ فلسفہ کہ انسان نیکی بدی کا کچھ خیال نہ رکھے، جو جی میں آئے کرے مزے اڑائے۔ بظاہر نہائت خطرناک ہے، لیکن خیام سے ایسے خطرناک فلسفہ کی توقع نہیں ہوسکتی اس نے بہت سی رباعیوں میں معاد، اور جزاؤ سزا کا اقرار کیا ہے۔ اور نکوکاری اور برائیوں سے بچنے کی ہدائت کی ہے۔

ایشیائی سلطنتوں میں، جاہ و مال کے حاصل کرنے میں جن ذلیل، کمینہ، ناجائز، اور ناپاک ذریعوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ ہمارے ملک میں نہیں ہوسکتا، کم سے کم اس کے لئے کسی ہندوستانی ریاست کا سفر اختیار کرنا چاہئے۔ خیام کے سامنے زندگی کا جو نمونہ موجود تھا۔ وہ یہی تھا کہ ارباب دنیا رات دن جوڑ توڑ، سازش، حیلہ انگیزی نفاق، خوشامد، تگ و دو اور ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے تھے۔ پھر ان سب مصیبتوں سے جو چیز حاصل کرتے تھے۔ وہ کس قدر ناقابل اعتبار اور سریع الزوال ہوتی تھی۔ آج ایک شخص وزیراعظم ہے۔ کل دربدر مارا پھرتا ہے۔ کل تک ایک شخص تاج و تخت کا مالک تھا۔ آج مسجد کے دروازے پر گداگری کر رہا ہے۔ برامکہ نے ابھی تمام عالم کو چھا لیا ہے۔ ابھی خاندان کا خاندان برباد ہو کر نام نشان تک مٹ گیا، ابوالفضل کل تک ندیم خاص تھا۔ آج دربار میں اس کا سر کٹ کر آرہا ہے۔

ان حالات کو دیکھ کر بے شبہ ایک فلسفی گھبرا اٹھے گا۔ اور کہے گا کہ دنیا ناقابل اعتبار ہے جاہ و منصب کوئی چیز نہیں، خود زندگی کس قدر ہیچ ہے۔ فریدوں کی خاک سے کمہار کے برتن بنتے ہیں جمشید کا کالبد، خشت سازی کے کام میں آتا ہے۔ اس لئے تگ و دو، اور تردد و فکر بیکار ہے۔ تھوڑی سی زندگی ہے۔ اس کو قناعت، خاموشی، سکون اور اطمینان کے ساتھ گزار دو۔ کھاؤ، پیو، خوش رہو، اور ہنسی خوشی دنیا سے چلے جاؤ۔

خیام اس بات سے واقف ہے۔ کہ اس قسم کے قانع شخص کو عام لوگ ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن وہ اس پر تعجب کرتا ہے۔

این جمع اکابر کہ مناصب دارند
از غصہ و غم ز جانِ خود بیزارند
وانکس کہ اسیرِ حرص چوں ایشاں نیست
این طرفہ کہ آدمیش مے نشمارند

نہایت خوبی سے وہ قناعت اور آزادی کی تعلیم کرتا ہے۔

چوں رزق تو آنچہ عدل قسمت فرمود
یک ذرہ نہ کم شود نہ خواہد افزود
آسودہ ز ہر چہ نیست میباید شد
وآزادہ ز ہر چہ ہست میباید بود
خواہی کہ ترا تربیت اسرار رسد
مپسند کہ کس راز تو آزار رسد
از مرگ میندیش و غمِ رزق مخور
کیں ہر دو بوقتِ خویش ناچار رسد

خیام جس زندگی کو قابلِ رشک سمجھتا ہے وہ یہ ہے۔

در دہر ہر آنکہ نیم نانے دارد
وز بہر نشست آستانے دارد
نے خادم کس بود نہ مخدوم کسے
گو شاد بزی کہ خوش جہانے دارد

ابن یمین نے اس زندگی کی تصویر اس خوبی سے کھینچی ہے۔

دو تائے نان اگر از گندم است یا از جو
دو تائے جامہ اگر کہنہ است یا خود نو
بہ چار گوشۂ دیوارِ خود بخاطرِ جمع
کہ کس نگوید از ینجا بخیز و آں جا رو
ہزار بار فزوں تر بہ نزد ابن یمین
ز فرِ مملکتِ کیقباد و کے خسرو

اخلاقی تعلیم — خیام کا فلسفۂ اخلاق نہائت مختصر ہی لیکن جسقدر ہی اس مختصر سی دنیا کیلئے کافی ہے۔

غیبت مکن، و دلِ کساں را مازار
در عہدہ آں جہاں منم، بادہ بیار
در خون کسے و مال کسے قصد مکن
واں لقمہ کہ داری زکساں یار ندار
بدخواہ کساں ہیچ بہ مقصد نرسد
یک بد نہ کند تا بہ خودش صد نرسد
من نیک تو خواہم و تو خواہی بدِ من
تو نیک نہ بینی و بہ من بد نرسد
گر شادی ازاں خویشتن میدانی
کاسودہ دے را بہ غمے بنشانی
در ماتم عقلِ خویش بنشیں ہمہ عمر
پندار مصیبت کہ عجب نادانی
اے آنکہ خلاصۂ چہار ارکانی
بشنو سخنے ز عالم روحانی
دیوی و دَدِی و ملکِ انسانی
بالنسبت، ہر انچہ مے نمائی آنی

یعنی تم شیطان، درندہ، فرشتہ، انسان، سب کچھ ہو سکتے ہو، اب جو چاہو، ہو جاؤ۔
تم کہوگے کہ یہ ایسی کیا اچھوتی تعلیم ہے سب اہل مذہب اسی کی تعلیم دیتے ہیں، ہاں یہ

سچ ہے۔ لیکن اہل مذہب نے اپنی فیاضی کا دائرہ محدود کر دیا ہے، ان کے نزدیک نیکی، احسان بھلائی، ہمدردی، غمخواری، ان تمام اوصاف کا محل صرف اپنے ہم مذہب ہیں۔ لیکن خیام کے نزدیک آفتاب کی روشنی دشت، و چمن، دونو پر یکساں پڑتی ہے۔

خیام کی اخلاقی تعلیم میں، ریاکاری سب سے بڑا جرم ہے۔ اور اس نے جس خوبی سے اس کی پردہ دری کی ہے۔ آج تک کسی نے نہیں کی، سعدی اور حافظ ریاکار زاہدوں اور پیشواؤں کی دھجیاں اڑانے میں نہایت نامور ہیں۔ اور نہایت عجیب عجیب، نادر پیرایوں میں اُن لوگوں کے پترے کھولتے ہیں لیکن خیام نے ایک رباعی میں اس مضمون کا خاتمہ کر دیا ہے۔

زاہد بہ زن فاحشہ گفتا مستی	بنگر نہ کہ بگسستی و چوں پیوستی
زن گفت چنانکہ مے نمایم ہستم	تو نیز چنانکہ مے نمائی ہستی

یعنی ایک زاہد نے ایک فاحشہ عورت سے کہا کہ تو بدمست ہے۔ تو خیال نہیں کرتی کہ تو نے کس چیز کو چھوڑا اور کس چیز کو اختیار کیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میں تو جیسا اپنے آپ کو ظاہر میں دکھلاتی ہوں۔ ویسی ہی ہوں بھی، کیا آپ بھی اپنے آپ کو جیسا دکھلاتے ہیں ایسے ہی حقیقت میں بھی ہیں۔

ظاہر و باطن کے یکساں نہ ہونے کی برائی کا پیرایہ اس سے زیادہ اچھوتا، نادر اور مؤثر و عبرت خیز نہیں ہو سکتا تھا، خیام نے اس بات پر بھی خوب غور کیا تھا۔ کہ کن کن اسباب سے انسان کو خواہ مخواہ ہی ریا میں گرفتار ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے وہ ان موقعوں سے بچنے کی تعلیم دیتا ہے۔

در راہ چناں رو کہ سلامت نہ کنند	با خلق چناں زی کہ قیامت نہ کنند
در مسجد اگر روی چناں رو کہ ترا	در پیش نہ خوانند و امامت نہ کنند

یعنی رستہ اس طرح چلو کہ کوئی تم کو سلام نہ کرے، لوگوں کے ساتھ اس طرح بسر کرو کہ لوگ تمہاری تعظیم کیلئے قیام نہ کریں۔ مسجد میں جاؤ تو اسطرح کہ لوگ تم سے امام بننے کی خواہش ظاہر نہ کریں، مطلب یہ کہ ایسی سادگی بے تکلفی خاموشی سے زندگی بسر کرو کہ لوگ تم کو مقدس نہ خیال کریں۔ یہ ظاہر ہے کہ انسان جب لوگوں کی نظر میں مقدس ہو جاتا ہے تو اس کو سینکڑوں باتیں ایسی کرنی پڑتی ہیں جن سے اُس کا تقدس قائم رہے حالانکہ

وہ باتیں بہ تکلف کرتا ہے۔ اگر اس منصب پر وہ نہ پہنچتا تو اس خود داری اور حفظ مراتب کی اس کو کیا ضرورت تھی۔

خیام کا فلسفہ اخلاق زہاد اور علماء کے فلسفۂ اخلاق سے نہائت بلند ہے یہ مقدس گروہ کسی کام کو صرف اس نظر سے دیکھتا ہے۔ کہ اس پر عذاب یا ثواب ہوگا، ان لوگوں کو اگر اس امر کا اطمینان ہو جائے کہ اس فعل پر عذاب نہیں ہوگا، یا خدا اس کو بخش دیگا، تو پھر ان کو کچھ پروا نہ ہوگی۔ خیام کسی کام کے کرنے کے وقت صرف یہ دیکھتا ہے۔ کہ خود یہ کام کیسا ہے؟ اگر وہ کام بُرا ہے تو اس سے اُس کو کچھ تسلی نہیں ہوتی، کہ خدا اس کو بخش دیگا اس کے نزدیک یہی بڑا عذاب ہے۔ کہ خدا دیکھ رہا تھا۔ اس نے جرم کا ارتکاب کیا۔

با نفس ہمیشہ در نبرد م چہ کنم	وز کردۂ خویشتن بہ دردم چہ کنم
گیرم کہ ز من در گذرانی بہ کرم	زیں شرم کہ دیدی کہ چہ کردم چہ کنم

یعنی اے خدا! میں نے مان لیا کہ تو میرا گناہ معاف کر دیگا، اور عذاب نہ دے گا لیکن یہ کیا کم عذاب ہے کہ تیری نظر کے سامنے میں نے ایسا فعل کیا۔

فقہا کی نسبت خیام کی رائے

خیام کے فلسفہ، اخلاقی تعلیم اور آزادی خیال کا نمونہ تم نے دیکھا، ایسا شخص فقہا کی نسبت جو رائے رکھ سکتا ہے، تم خود سمجھ سکتے ہو۔ وہ کہتا ہے اور کس قدر صحیح کہتا ہے

با ایں دو سہ نادان کہ چناں میدانند	از جہل کہ دانائے جہاں ایشانند
خوش باش کہ از خری ایشاں بہ مثل	ہر کو نہ خراست کافرش میدانند

غور کرو، امام غزالی، امام رازی، محی الدین عربی، شیخ الاشراق، ان میں سے ہر شخص فقہا کی تکفیر کا زخم خوردہ ہے۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ یہ لوگ فقہاء کے سے عامیانہ اور لغو عقائد، اور خیالات نہیں رکھتے تھے، اسی نکتہ کو خیام اس تلخ جملہ میں ادا کرتا ہے۔ کہ جو شخص ان تکفیر کرنے والوں کی طرح سے گدھا نہیں ہے۔ اسکو یہ لوگ کافر کہتے ہیں۔

خیام نے گو شاعری کے پردہ میں دل کے پھپھولے توڑے لیکن افسوس ہے کہ فقہاء کی سخت گیری کی وجہ سے وہ بھی اسرار اور حقائق کے ظاہر کرنیکی جرأت نہ کر سکا۔ چنانچہ خود کہتا ہے۔

اسرار جہاں چنانکہ در دفتر ماست	گفتن نتواں کہ آن وبال سر ماست
چوں نیست دریں مردم دنیا اہلے	نتواں گفتن ہر انچہ در خاطر ماست

افسوس! ظاہر پرستوں کی گیرو دار نے خدا جانے کتنے عجیب و غریب اسرار اور حقائق دلوں ہی میں دفن کرا دیئے، آج آزادی کا زمانہ ہے، لیکن اب وہ حقائق، اور اسرار کہاں بازاری اور عامیانہ باتیں زبان پر آئیں تو اس سے کیا حاصل!!!

آنچہ در کار است نتوانی تو گفت
آنچہ مے گوئی تو خود در کار نیست

خیام اور یورپ یہ عجیب بات ہے کہ خیام کی قدردانی، ایشیا سے زیادہ یورپ نے کی اور کرنی چاہئے تھی، خیام کے خیالات، یورپ سے اسقدر ملتے جلتے ہیں، کہ آج اگر موجود ہوتا تو شاید یورپین بن جاتا۔

عمر خیام کی نسبت ۱۸۹۶ء تک جو کچھ یورپ میں لکھا گیا وہ وصایا وغیرہ نہایت محدود ماخذوں سے تھا مگر پروفیسر ژکوسکی (Zhukoosky) کے قابل یادگار مضمون نے خیالات میں تغیر عظیم برپا کر دیا۔ اور اب پروفیسر راس، ہیرن الین (Herouallen) وغیرہ نے انگریزی میں عمدہ ترجمے اور تذکرے شائع کئے۔ ان سے پہلے انگلستان میں فٹز جیرلڈ (Fitiz gerald) کے مشہور ترجمہ کے علاوہ میکارتھی (Mecorthy) نے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپا تھا مگر گارنر (Garner) کا ترجمہ عالمانہ اور مطلب خیز تھا۔ ون فیلڈ (Whinfield) نے ۱۸۸۳ء میں دو کتابیں ایک میں صرف ترجمۂ رباعیات اور دوسری میں رباعیاں اور ان کے مقابل میں ترجمہ شائع کیں (Nicholas) نکولس فرانسیسی نے فٹز جیرلڈ سے ایک سال بعد فرنچ میں ایک ترجمہ شائع کیا تھا۔ باڈن اسٹیڈ (Bodenstted) نے جرمن میں ایک ترجمہ چھاپا ہے۔ اور چند رباعیوں کا ترجمہ ہالینڈ کی زبان میں بھی ہو گیا ہے۔

پروفیسر لکھتے ہیں کہ اگر وہ تمام کتابیں اور رسالے جمع کئے جائیں جن میں عمر خیام کا ترجمہ یا حال شائع ہوا ہے۔ تو درحقیقت ہماری زندگی میں یہ کام پورا نہیں ہو سکتا۔

اکسفورڈ میں ایک نہائت قدیم نسخہ ہے۔ اس کو ہیرن الین نے عکس میں چھاپا ہے ایک عمدہ نسخہ پیرس میں ہے۔ مگر اکسفورڈ والے سے پرانا نہیں۔

انوری

محمد نام۔ اوحد الدین لقب، انوری تخلص ابیورد کے علاقہ میں بارسنہ ایک گاؤں ہے۔ جو مہنہ کے مقابل واقع ہے۔ انوری یہیں پیدا ہوا۔ یہ دولت شاہ کا بیان ہے لیکن

عرفی کہتا ہے۔ ع۔ انوری گر بود از مہنہ منم از شیراز، اس علاقہ کو خاوران بھی کہتے ہیں، اس مناسبت سے انوری نے پہلے اپنا تخلص خاوری رکھا تھا۔ پھر اپنے استاد عمارہ کی فرمائش سے بدل کر انوری کر دیا۔

انوری نے علوم و فنون کی تحصیل طوس کے مدرسہ منصوریہ میں کی، اور تمام دری علوم و فنون حاصل کئے، ریاضی میں خصوصیت کے ساتھ کمال پیدا کیا، دولت شاہ کا بیان ہے کہ انوری ایک دن مدرسہ کے دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا کہ سامنے سے ایک شخص بڑے جاہ و تجمل سے گزرا، انوری نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ پایۂ تخت کا شاعر ہے، انوری نے اسی وقت تعلیم و تعلم کو خیرباد کہا۔ اور رات بھر میں قصیدہ لکھکر طیار کیا جسکا مطلع یہ ہے۔

گر دل بحر و دست کاں باشد	دل و دست خدائگاں باشد

صبح کو دربار میں جا کر قصیدہ پڑھا۔ سنجر نہایت سخن شناس تھا بہت محظوظ ہوا اور کہا نوکری چاہتے ہو یا صلہ، انوری نے آداب بجالا کر عرض کی۔

جز آستان توام در جہاں پناہے نیست	سر مرا بجز ایں در حوالہ گاہے نیست

سنجر نے منصب اور وظیفہ مقرر کر دیا، سنجر رادکان سے روانہ ہوا تو انوری بھی ساتھ تھا، راہ میں چند قصیدے لکھ کر پیش کئے۔ جن میں سے ایک یہ ہے۔

باز ایں چہ جوانی و جمال ست جہاں را	ویں حال کہ نو گشت زمین را و زماں را

ہمارے تذکرہ نویسوں کی بیخبری دیکھو، یہ واقعہ سب لکھتے آتے ہیں، لیکن یہ کسی سے نہ ہو سکا کہ جس قصیدے کو انوری کی شاعری کا دیباچہ کہتے ہیں، اسکو بھی اٹھا کر دیکھ بھی لیا ہوتا، انوری خود اس قصیدہ میں لکھتا ہے۔

خسروا بندہ را چو دہ سال است کز ندیمان مجلس اند نہ شود	کہ ہمے آرزوے آں باشد از مقیمان آستاں باشد

اس میں صاف تصریح ہے۔ کہ یہ قصیدہ ابتدائی نہیں، بلکہ دس برس کی امیدواری کے بعد لکھا گیا ہے، انوری جس طرح سنجر کے دربار میں پہنچا ہے۔ اسکی کیفیت یہ ہے کہ **انوری** مدت سے شعر و شاعری میں مشغول تھا، لیکن دربار تک رسائی حاصل نہیں ہوئی تھی، جس کی وجہ یہ تھی کہ دربار کا ملک الشعرا امیر معزی تھا۔ اور وہ کسی کو دربار میں باریاب نہیں ہونے دیتا تھا، اس کا حافظہ نہایت قوی تھا یعنی حرف ایک بار کے سننے میں قصیدہ

یاد کر لیتا تھا، جب کوئی شاعر دربار میں آتا اور قصیدہ سناتا تو معزی بادشاہ سے کہتا کہ یہ قصیدہ میری تصنیف ہے۔ چنانچہ قصیدہ کا قصیدہ خود پڑھ کر سنا دیتا، شاعر خفیف ہو کر چلا آتا، **انوری** کو یہ حالت معلوم ہوئی تو پھٹے پرانے کپڑے پہن، پاگلوں کی صورت بنا کر معزی کے پاس گیا، اور کہا کہ میں شاعر ہوں، بادشاہ کی مدح میں قصیدہ لکھ کر لایا ہوں۔ آپ پیش کرا دیجئے، معزی نے کہا کیا لکھا ہے پڑھ کر سناؤ، انوری نے پڑھا۔

زہے شاہ و زہے شاہ و زہے شاہ	زہے میر و زہے میر و زہے میر

معزی نے کہا یوں کہتے تو مطلع ہو جاتا،

زہے شاہ و زہے شاہ و زہے شاہ	زہے ماہ و زہے ماہ و زہے ماہ

انوری نے بہکی بہکی باتیں کیں، معزی نے یہ سمجھ کر کہ دربار کا مسخرہ بنائیں گے، انوری سے کہا کل آنا، انوری دوسرے روز پہنچا تو **معزی** خود ساتھ لیکر دربار میں گیا، اور کہا کہ جو قصیدہ تم نے مدح میں لکھا ہے سناؤ۔ **انوری** نے شاعرانہ انداز میں پڑھا۔

گر دل و دست بحر و کان باشد	دل و دست خدایگان باشد
شاہ سنجر کہ کمترین خدمش	در جہاں بادشانشاں باشد

دو شعر پڑھ کر رک گیا، اور معزی کی طرف خطاب کر کے کہا کہ یہ قصیدہ آپ کا ہے تو باقی اشعار سنائیے، معزی چپ رہا۔ انوری نے پورا قصیدہ سنایا، سنجر نہایت محظوظ ہوا اور ندیمان خاص میں داخل کیا۔ رفتہ رفتہ یہ مرتبہ حاصل کیا کہ سنجر نے بہ ان جاہ و جلال دو دفعہ انوری کے مکان پر جا کر اس کی عزت افزائی کی[1]۔

انوری کو علم نجوم میں کمال تھا، سنجر کے عہد حکومت میں اتفاق سے سبعہ سیارہ برج میزان میں جمع ہوئے، انوری نے اس بنا پر پیش گوئی کی کہ فلاں دن اس زور کا طوفان آئیگا کہ تمام مکانات برباد ہو جائیں گے، لوگوں نے ڈر کر تہ خانے اور سرداب تیار کرائے اور تاریخ مقررہ پر ان میں چھپ کر بیٹھے، اتفاق سے اس دن اتنی ہوا بھی نہ چلی کہ چراغ گل ہوتا، سنجر نے انوری کو بلا کر عتاب کیا، انوری نے کہا۔ قرانات کے احکام فوراً ظاہر نہیں ہوتے۔ فرید کاتب نے اس پر قطعہ لکھا۔

گفت **انوری** کہ از جہت بادہائے سخت	ویران شود عمارت و کہ نیز بر سری
در سال حکم او نہ وزید است ہیچ باد	یا مرسل الریاح تو دانی و **انوری**

[1] یہ پوری تفصیل تاریخ حبیب السیر میں ہے ۱۲ ؎ خزانہ عامرہ ۱۲۵

انوری نے اب دربار میں رہنا مناسب نہ سمجھا۔ اور ترکِ ملازمت کر کے نیشاپور چلا آیا۔ اب اس کی شہرت دور دور پھیل گئی تھی، ہر طرف سے امراء و رؤسا کے پیغام آتے تھے کہ ہمارے دربار میں قدم رنجہ کیجیے۔ سنہ ۵۲۲ھ میں سلطان احمد پیروزشاہ نے اسکو خط بھیجکر بلایا اور ساتھ ہی کر خوارزم کی طرف روانہ ہوا، انوری یہ سنکر کہ دریائے جیحوں راہ میں پڑتا ہے اس قدر ڈرا کہ بلخ پہنچ کر سلطان احمد سے معذرت چاہی، اور وہیں رہ گیا، لیکن بلخ میں اس قدر تکلیف پہنچی کہ تنگ آکر ایک قصیدہ لکھا۔ اور سلطان احمد کی خدمت میں بھیجا، مطلب کی بات اس طرح ادا کی۔

این حال که در بلخ کنوں دارم — از خوف پریشانی و گمراهی
زیں پیش اگر وهم و گماں بردے — آں خطے کو ته نظر شاهی
بر عبرهٔ جیحوں نه بهر آموزشش — چوں ربط به طبیعت شدے راهی

سلطان احمد نے اسی کو دربار میں طلب کیا اور معتمد خاص بھیجا کہ انوری کو ساتھ لے کر آئے۔ انوری روانہ ہوا، لیکن دریائے جیحوں کے کنارے پہنچکر اسکے اوسان جاتے رہے، رہبر جو ساتھ تھا، ڈھارس دلانے کے لئے، لنگ باندھکر دریا میں اترا، تیرتا ہوا دور تک گیا اور چاروں طرف چکر لگا کر دکھلایا کہ گھبرانے کی بات نہیں۔ انوری بہزار خرابی کشتی میں بیٹھا۔ گھاٹ پر شاہی اہتمام تھا۔ اور اسپ خاصہ سواری کیلئے آیا تھا۔ انوری نے آداب شاہی کے لحاظ سے گھوڑے پر سوار ہونے میں تامل کیا، لیکن پیش خدمت کے اصرار سے سوار ہوا، اور دربار میں آیا۔ قصیدہ راہ میں لکھ رکھا تھا۔ دربار میں پہنچ کر پڑھا، دیکھو تمام واقعات کو کس خوبی سے ادا کیا۔

حبذا بخت مساعد که سوئے حضرت شاه — مرد می کرد و رہم داد پس از چندیں گاه
اندر آمد ز در حجرهٔ من صبحدمے — روز بهمن جشنه یعنی دوم بهمن ماه
سال بر پانصد و سی و سه ز تاریخ عجم (۵۳۳) — گفت برخیز که از شهر بدر رشد همراه
چه روے راه تردد و قضی الامر فقم — چه کشتی کفش تخیل بلغ السیل زباه
چوں برانگیخت مرا رفت و چراغے افروخت — بے تحاشی چو رفیقی که بود از اشباه
تا که من جامه بپوشیدم و بیروں رفتم — به شتابے که دو اعمی نه رهی کرد و نه راه
او بر دل برد بدم فرشش و آورد دستور — محملے بست و مرا کرد چو شاہے برگاه

همچنان جملہ را ہم بسلامت مے برد
نہ دران طبع ملالت، نہ درین طوع اکراه

تا بہ حدے کہ مرا داد ہمے میخ و کفش
تا بجائے کہ ہمیداد خبرم راه و کوه

چون بہ جیحون برسیدیم زمن ہوش برفت
گفت لاحول و لا قوۃ الا باللہ،

رفتن و برنشست اثاثے و بہ جیحون در جست
و اندران جست بہ یکدم بگذشت او بشناه

بازباز آمد و گفتا کہ بدیدی سہل است
در نشین، خیز، و مکن وقت گذشتن بیگاه

کشتی آورد و نشستیم درو ہر دو بہم
چون دو یار او ہمہ یاری ده و من یارے خواه

او چو شیرے بہ یکے گوشہ کشتی بنشست
من سر اندر زن[۱] و بیرون زن ہمچو روباه

آخرالامر چو کشتی بسلامت بگذشت
جستم از کشتی و آمد بہ لب کشتی گاه

بو حصہ دیدیم چو جان و جوانے بخوشی
شادی افزائے چو جان و چو جوانی عمر، کلاه

گفتم اے بخت بہشت است سواد ترمذ
گفت راضی مشو از روضہ رضوان بہ گیاه

باش تا شہر ببینی، و دره بار ملک (دربار ۱۲)
باش تا قلعہ ببینی و درو عرض سپاه

تا درین بودم اگردے ز در شہر نجاست
گفتم آن کیست مرا گفت جنیبت کش شاه

آمد القصہ و آورد جنیبت پیشم
دیده من چو دران شکل و تنہ کرد نگاه

بوسہ دادم سمم، و زانوئے و رکابش ہر سہ
گفتم اے روز براق از تو چو رنگ تو سیاه

بہ سعادت بہ سر آخر خود باز خرامم
کہ ترا پایہ بلند است و مرا پا کوتاه

این ہمے گفتم و او دست ہمے کوفت کہ نے
ترک فرمان ہمہ حال گناه است و گناه

اقسامِ سخن میں سے انوری کی طبیعت ہجو سے خاص مناسبت رکھتی تھی، ہجو میں وہ نہایت دلچسپ اور لطیف مضامین پیدا کرتا تھا۔ جو شعر اس کی زبان سے نکلتا عالم میں پھیل جاتا۔ اس کے ساتھ طبیعت میں تنگ ظرفی اور کم حوصلگی تھی۔ ذرا کسی سے رنج ہوا اور اس کی ہجو کا طومار باندھ دیا، اس عادت کی وجہ سے اس نے سارے زمانہ کو دشمن بنالیا تھا چنانچہ سلطان علاء الدین ملک الجبال سے لوگوں نے شکایت کی کہ انوری نے حضور کی ہجو لکھی ہے۔ سلطان نے ملک طوطی کو جو مرو شاہجہان کا رئیس تھا خط لکھا کہ انوری کو گرفتار کر کے دربار میں بھیج دو۔ ملک طوطی نے فخر الدین مروزی کو جو اسکے دربار کا شاعر اور منشی تھا حکم دیا کہ انوری کو لکھو کہ میں آپکے ملنے کا مشتاق ہوں فخر الدین مروزی

[۱] سر اندر زن یعنی منہ اندر کر لینا یعنی میں لومڑی کی طرح کبھی منہ باہر نکالتا تھا۔ اور کبھی اندر کر لیتا تھا۔

انوری کا بڑا دوست تھا۔ اُس نے انوری کو اصل حال سے مطلع کرنا چاہا لیکن ملک طوطی کے ڈر سے صاف صاف نہیں لکھ سکتا تھا۔ اس لئے خط کے سرنامہ پر یہ شعر لکھا۔

ھی الدنیا تقول بملاء فیھا ۔۔۔ حذار حذار من بطشی و فتکی

انوری سمجھا کہ کچھ بھید ہے تحقیق سے اصل واقعہ معلوم ہوا۔ ملک طوطی کے دربار میں سفارشیں پہنچائیں، سلطان علاء الدین کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے ملک طوطی کو لکھا کہ انوری کو میرے دربار میں بھیجدو ہزار بکریاں صلہ میں دونگا۔ ملک طوطی نے انوری کو بلا کر کہا کہ تمہارے معاوضہ میں مجھکو ہزار بکریاں ملتی ہیں۔ انوری نے کہا علاء الدین مجھکو ہزار بکریاں کو بیچنے خریدتا ہے، اور آپ مفت بھی نہیں لیتے۔ ملک طوطی کو یہ لطیفہ پسند آیا اور اپنے مقربین میں داخل کیا۔

انوری کے مخالف شعرا نے اب یہ طریقہ اختیار کیا کہ خود ہجویں لکھکر اس کے نام سے مشہور کرتے تھے۔ اور انوری کو اس کا خمیازہ اٹھانا پڑتا تھا۔ چنانچہ جب وہ بلخ میں آیا تو فتوحی شاعر نے حکیم سوزنی کی فرمائش سے بلخ کی ہجو لکھی اور انوری کے نام سے مشہور کردی، اس کے چند اشعار یہ ہیں۔

چار شہر است خراسان را بر چار طرف ۔۔۔ کہ وسطشان بہ مسافت کم صد در صد نیست
گرچہ معمور و خرابش ہمہ مردم دارد ۔۔۔ نہ چناں ہست کہ آبستن دام و دد نیست
بلخ را عیب اگر چند باد باشش کنند ۔۔۔ بر ہر رہ بخردے نیست کہ صد بخرد نیست
مصر جامع را چارہ نبود از بد و نیک ۔۔۔ معدن زر و گہر بے سرب و اسپند نیست
حبذا شہر نشاپور کہ در ملک خدائے ۔۔۔ گر بہشت است ہمین است وگرنہ خود نیست

اہل شہر اس پر اس قدر برہم ہوئے کہ انوری کو پکڑ کر تختہ کلاہ کیا اور اوڑھنی اُڑھا کر گلی کوچوں میں تشہیر کی، اس سے بھی زیادہ نوبت پہنچتی لیکن قاضی حمید الدین جنکی تصنیف سے مقامات حمیدی ہے۔ اور جن کی شان میں انوری نے لکھا ہے۔

بہ مدح و ثنا گر کنم رائے نظمے ۔۔۔ نہ دشوار گویم نہ آساں فرستم
ولیکن بہ مدح جناب حمیدی ۔۔۔ اگر درجے باشد ہر آساں فرستم

۱؎ لب اللباب عوفی یزدی و مجمع الفصحا تذکرۂ فخر الدین مروزی ۱۲ ۲؎ مجمع الفصحا، تذکرۂ فتوحی مروزی و ریاض الصالحین تذکرۂ انوری، دولت شاہ نے لکھا ہے کہ خود انوری نے یہ ہجو لکھی تھی۔ لیکن یہ غلط ہے ۱۲

اُنہوں نے انوری کی حمایت کی اور اُسکی جان بچ گئی، انوری نے ان واقعات کا اس قصیدہ میں ذکر کیا ہے۔

اے مسلمانان فغان از دور چرخ چنبری

چونکہ انوری کے بچانے میں ابو طالب نعیم، صفی الدین عمر، مفتی تاج الدین احسن محتسب، نظام الدین احمد مدرس نے بھی کوشش کی تھی، اس لئے قصیدہ میں سب کا ذکر کیا ہے! ورنہ بلخ کی ہجو سے نہایت تبری کی ہے کہ بلخ قبۃ الاسلام ہے، میں اسکو ہجو کیونکر کہہ سکتا ہوں۔ بالآخر انوری نے تمام لغویات سے توبہ کی، اور گوشہ گزیں ہوکر بیٹھا، سلطان علاء الدین غوری جہاں سوز نے دربار میں طلب کیا، لیکن اس نے انکار کیا۔ اور یہ قطعہ جواب میں لکھا۔

کلبۂ کاندرو بروز و بشب　　جائے آرام و خورد و خواب من است
جائیکے دارم اندرو کہ ازو　　چرخ در غین رشک تاب من است
ہرچہ در مجلس ملوک بود　　ہمہ در کلبۂ خراب من است
راحل اجزاء و نان خشک و رو　　گرد خوان من و کباب من است
قلم کوتہ و صریر خوشش　　زخمۂ و نغمۂ رباب من است
خرقۂ صوفیانۂ اطلس　　از ہزار اطلس انتخاب من است
ہرچہ بیروں بود ازیں کم و بیش　　حاش للسامعین عذاب من است
خدمت بادشہ کہ باقی باد　　نہ بباز وے خاک آب و من است
زیں قدر راہ رجعتم بستہ است　　آنکہ او مرجع و مآب من است
دیں طریق از نمائش است خطا　　چہ کنم ایں خطا صواب من است
نیست ایں بندہ را زباں جواب　　جامۂ و جائے من جواب من است

مدح اور ہجو کے ساتھ غزل کہنی بھی چھوڑ دی، کسی نے پوچھا تو جواب دیا۔

دے مرا عاشقکی، گفت غزل مے گوئی　　گفتم از مدح و ہجا دست بیفشاندم ہم
گفت چوں؟ گفتمش آں جانب گمراہی بود　　حالت رفتہ دگر باز نیاید ز عدم
غزل و مدح و ہجا ہر سہ ازاں مے گفتم　　کہ مرا شہوت و حرص و غضبے بود بہم

اخیر شعر کا مضمون اگرچہ عربی سے ماخوذ ہے لیکن اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انوری شاعری کی حقیقت سے واقف تھا، یعنی یہ کہ شاعری اجذبات انسانی کے اظہار کا نام ہے، شہوت

حرص، غصہ، سب جذبات ہیں۔ اور یہی جذبات غزل و مدح اور ہجو کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں
انوری نے حسب روائت دولت شاہ سنہ ۵۴۷ھ بمقام بلخ وفات پائی، اور سلطان احمد خضرویہ کے پہلو میں دفن ہوا۔

انوری بخلاف اکثر شعرا کے اکثر علوم متداولہ میں کمال رکھتا تھا چنانچہ خود کہتا ہے۔

گرچہ دربستم در مدح و غزل یکبارگی	ظن مبر کز نظم الفاظ و معانی قاصرم
بلکہ بر ہر علم کز اقران من داند کسے	خواہ جزوے باشد آں را خواہ کلی قادرم
منطق و موسیقی و ہیئات شناسم اندکے	راستی باید بگویم بانصیب وافرم
وز الٰہی آنچہ تصدیقش کند عقل صریح	گر تو تصدیقش کنی بر شرح و بسطش ماہرم
وز طبیعی رمز چند از چند بے تشویر ہست	کشف دانم کرد اگر حاسد نباشد ناظرم
نیستم ہم جاہل از اعمال احکام نجوم	ور ہمے باور نہ دانی رنجہ شو من حاضرم
ایں ہمہ بگذار با شعر مجرد آمدم	چوں سنائی ہستم آخر گرنہ ہمچو صابرم
قدر من صاحب قوام الدین حسن داند ازانک	صدر را اور یادگار ناصر الدین طاہرم

ان کمالات کی وجہ سے تمام لوگ اسکی عزت کرتے تھے، سلطان سنجر اس جاہ و جلال کا بادشاہ اس کے گھر آتا تھا، فتوحات کا یہ حال تھا کہ جلال الوزرا کے ہاں سے سالانہ پانچسو اشرفیاں مقرر تھیں، با ایں ہمہ چونکہ طبیعت کا دنی تھا اور زبان قابو میں نہ تھی اسلئے ذلتیں اٹھاتا تھا۔ ایک وزیر کی مدح میں قطعہ لکھا۔ اور اخیر میں یہ شعر لکھے۔

تو کہ از دور ہمے بینی پوشیدہ مرا	حال بیرون و درونم نہ ہماناں دانی
طاق بوطالب نعمہ است کہ دارم زبرون	وز درون پیرہن بوالحسن عمرانی

یعنی میرے بدن پر مدت سے پھٹے پرانے کپڑے ہیں، چادر ابوطالب کی دی ہوئی ہے اور پیراہن ابوالحسن عمرانی کا عنائت کیا ہوا ہے۔ وزیر نے ناراض ہو کر فتوحی مروزی کو حکم دیا کہ جواب لکھے، چنانچہ اس نے ایک قصیدہ لکھا جسکے چند شعر یہ ہیں۔

از پس آنکہ بہ یک مہر دو الف ملکی	داشت در بلخ ملک شاہ تو ارزانی
ور پس آنکہ ہزار و گرت داد وزیر	قرض آں پیر سرخسی زپے بستانی
از پس آنکہ ز انعام جلال الوزرا	بتو ہر سالہ رسد مہرے پانصد کافی
اے بہ دانائی معروف چرا مے گوئی	در ثنائے کہ فرستادہ از نادانی

طاق بوطالب نعمہ است کہ دارم زبر دوش　　در زور ونی پیرہن بوالحسن عمرانی
چہ بخیلی کہ بچندیں زر و سیم و نعمت　　طاق و پیراہنے دو جنت ہے نتوانی
پانزدہ سال فزوں باشد تا گشتہ شدہ است　　بوالحسن آنکہ ز احسانش سخن میرانی
پیرہن کہنہ او گر نہ بجا نیست ہنوز　　پس بخواں پیرہنش کو زرہ ختانی
باقی عمر ملابس آں پیرہن و طاق ترا　　ہنر دار ندہی ابراہم و دگر بستانی

یعنی ابوالحسن عمرانی کو مرے ہوئے آج پندرہ برس ہو گئے، اتنی مدت تک اس کا دیا ہوا پیرہن موجود ہے۔ تو پیرہن کا ہے کو زرہ ہے اور اس کے ہوتے اب کسی پیرہن کی کیا حاجت ہے

لطیفہ، ایک دفعہ انوری راہ میں چلا جاتا تھا، ایک شخص کو دیکھا کہ اشعار پڑھ رہا ہے انوری نے خیال کیا تو اُسی کے اشعار تھے۔ پوچھا کہ آپ کا تخلص کیا ہے؟ اُس نے کہا "انوری" انوری نے کہا شعر کے چور پہلے بھی سنے تھے شاعر چرانے والا آج دیکھا۔

کلام پر رائے　انوری جس پایہ کا شاعر تھا، اس سے زیادہ بہت خوش قسمت تھا، ایران میں تین شاعر پیغمبر سخن تسلیم کئے گئے، اُن میں ایک انوری بھی ہے، چنانچہ مشہور ہے۔

در شعر سہ تن پیمبرانند　　ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را　　فردوسی و انوری و سعدی

ہاتفی نے مثنوی کی رعایت سے اس کو اس طرح بدل دیا ہے۔

در شعر سہ تن پیمبرانند　　قولیست کہ جملگی برآنند
فردوسی و انوری و سعدی　　ہر چند کہ لا نبی بعدی

اباقاآن خان کے زمانہ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ انوری اور ظہیر فاریابی دونوں میں کس کو ترجیح ہے۔ سب نے مجد ہمگر[1] کو ثالث قرار دیا۔ اور ایک منظوم استفتا لکھا،

اے آں زمیں وقار کہ بر آسمان فضل　　ماہ خجستہ فضلی و خورشید انوری
جمعے ز نقدان سخن گفتہ ظہیر　　ترجیح میدہند بر اشعار انوری
جمعے دگر بریں سخن انکار میکنند　　فی الجملہ در محل نزاع اند و داوری
درجان یک طرف تو بدیشاں نمای راست　　زیرا کہ ہست طبع تو ملک سخنوری

مجد ہمگر نے جواب لکھا۔

لہ مجمع الفصحا تذکرہ فتوحی مروزی ۱۲ [1] مجد ہمگر اس درجہ کا شاعر تھا کہ بعضوں نے اسکو شیخ سعدی کا ہم پلہ مانا ہے ۱۲

جمعے ز اہل خطۂ کاشان کہ بردہ اند　　زار بار بافضل و دانش گوئے سخنوری

کردند بحث در سخن ہر دو شاں نظم　　تا خود کہ سفتہ بہ دُرِ دُرّ سخنوری

در انوری مناظرہ شاں رفت و در ظہیر　　تا مر کراست پایہ بہتر ز شاعری

انصاف چوں نیافت گروہے ز دگر گروہ　　مر بندہ را گزید نظر شاں بہ داوری

در کان طبع آں چو بگشتم گراں گراں　　در قعرِ بحرِ ایں چو نمودم شناوری

شعرے یکے برآمدہ چوں دُرّ شاہوار　　نظم دگر برآمدہ چوں مہرِ خاوری

شعرِ ظہیر اگرچہ برآمد ز جنس شعر　　برتر ز انوری نہ زند لاف شاعری

بر اوج مشتری نرسد تیر نظم او　　خاصہ کہ در ثناگری و مدح گستری

طعم رطب اگرچہ لذیذ است و خوش مذاق　　کے بہ بود ز خاصیت قند عسکری

اینست اعتقاد رہی خوش قبول کن　　گر تو مقید سخن مجد ہمگری

زاد ایں نتیجہ نیم شب از آخر رجب　　در خاؔ و عین و دال ز ہجر پیمبری

امامی ہروی[1] نے بھی اس فیصلہ سے اتفاق کیا ہے، چنانچہ کہتے ہیں،

اے سالکِ مسالکِ فکرت دریں سوال　　معذور نیستی بحقیقت چو بنگری

تمییز را ز بہر تناسب دریں دو طور　　ہیچ احتیاج نیست بدیں شرح گستری

کیں معجز است واں سحر آں شمع و ایں چراغ　　ایں ماہ و آں ستارہ و آں جو ر ویں جو ہری

انوری ظہیر سے بلکہ اپنے تمام معاصرین سے بڑھکر ہو تو ہم کو انکار نہیں لیکن اس سے بڑھکر کیا ظلم ہو سکتا ہے۔ کہ فردوسی اور سعدی کے پہلو میں اسکو جگہ دی جائے[2] قطعہ مشہور اور مجد ہمگر کے فیصلہ سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ انوری قصیدہ گوئی میں پیغمبر تھا جس طرح فردوسی اور سعدی مثنوی اور غزل میں تھے۔ لیکن یہ اور بھی حیرت انگیز ہے قصیدہ کا جو انداز چلا آتا تھا۔ اس پر انوری نے کچھ اضافہ نہیں کیا اور جس قدر کیا۔ اس میں اس کے ہمعصر شریک ہیں۔ انوری کے قصائد کے خصوصیات یہ بتائے جاتے ہیں کہ اس نے جدید مضامین پیدا کئے، مبالغہ کو ترقی دی، نئی تشبیہیں پیدا کیں۔ لیکن

[1] یہ وہی امامی ہیں جنکو مجد ہمگر نے شیخ سعدی پر ترجیح دی تھی، اور شیخ سعدی نے ناراض ہو کر کہا تھا "ہمگر کہ بعمر خود نکرد ست نماز۔ شک نیست کہ ہرگز بہ امامی نرسد" ۱۲

[2] مجالس المومنین تذکرۂ انوری ہمگر کے قطعہ کے چند شعر ہم نے چھوڑ دیے ہیں ۱۲

عبدالواسع جبلی، ارزقی، اور ظہیر ان باتوں میں انوری سے کسی طرح کم نہیں، انوری نے ایک قصیدہ میں ہلال کی تشبیہ سے مدح کی طرف گریز کیا ہے۔ اور وہ انوری کے محاسن اشعار میں محسوب ہے۔

دوش سلطان چرخ آئینہ فام	آنکہ دستور شاہ راست غلام
از کنار نبرد گاہِ اُفق	چوں بدست غروب داد زمام
دیدم اندر سوادِ طرۂ شب	گوشوارِ فلک ز گوشۂ بام
گفتم آں نعل خنگ (خچر) دستور (وزیر) است	قرۃ العین و فخر آل نظام

لیکن یہ تشبیہ اور گریز منطقی رازی سے ماخوذ ہے، وہ کہتا ہے۔

مہِ گردوں نگر بیمار گشتہ	کہ نالید و تنش بگرفت نقصان
بسانِ گوئے سیمین بود اکنوں	برآمد بر فلک چوں نوکِ چوگاں
تو گفتی خنگ صاحب (ممدوح) تاختن کرد	فگند ایں نعل زریں در بیاباں

اس میں جو لطافت اور ندرت ہے انوری کے ہاں نہیں، ظہیر فاریابی نے بھی اس تشبیہ کو لیا ہے۔ لیکن چند اور تشبیہیں اضافہ کر کے اس کو زیادہ دلاویز کر دیا ہے۔

پیدا شد از کرانۂ میدانِ آسماں	شکلِ ہلال چوں سرِ چوگانِ شہریار
من با خرد بہ حجرۂ خلوت شتافتم	گفتم کہ اے نتیجۂ الطافِ کردگار
باز ایں چہ نقش بوالعجب و شکل نادر است	کز کارگاہِ غیب ہمے گردد آشکار
گردوں ز جامۂ کہ بریدہ است ایں طراز	گیتی ز ساعدِ کہ ربودہ است ایں سوار
گفت آنچہ بر شمردی از انجملہ ہیچ نیست	دانی کہ چیست با تو بگویم بہ اختصار
نعلِ سمندِ شاہ جہان ست کآسماں	ہر ماہ بر سرش نہد از بہر افتخار

وطن کی ناقدری میں انوری کا مشہور شعر ہے۔

بہ شہر خویش دروں بے خطر بود درہم	بہ کانِ خویش دروں بے بہا بود گوہر

لیکن یہ بالکل امیر معزی کے شعر کا سرقہ ہے۔

مردم بہ شہر خویش نہ دارد بسے خطر	گوہر بہ کانِ خویش ندارد بسے بہا

غرض انوری کی پیغمبری کے ثبوت میں کوئی معجزہ موجود نہیں، البتہ اپنے معاصرین یعنی ادیب صابر، ارزقی، لامعی، رشید الدین وطواط، عبدالواسع جبلی، معزی وغیرہ سے

بعض باتوں میں ممتاز ہے۔ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اور شعرا کی طرح اس کا کلام مدح پر محدود نہیں۔ وہ ہر طرح کے واقعات اور معاملات ادا کرتا ہے جس سے زبان کو وسعت حاصل ہوتی ہی آج کوئی شخص اگر عام معاملات ادا کرنا چاہے تو اس کو الفاظ ہیں، بندش ہیں، ترکیب ہیں، انوری کے سوا اور شعرا کے کلام سے بہت کم مدد ملے گی۔

ایک قصیدہ میں شاعری کی بُرائی اور اُس کا غیر ضروری ہونا بیان کیا ہے اسمیں وہ تمام خیالات ظاہر کیے ہیں۔ جو آجکل شاعری کے بیکار ثابت کرنے میں پیش کیے جاتے ہیں۔ اِس نے ثابت کیا ہے۔ کہ شاعر کا رتبہ حلال خور سے بھی کم ہے۔ اِسلئے کہ حلال خور دنیا کے لیے ضروری ہے لیکن شاعری کی کیا ضرورت ہے۔ ایک ادنےٰ سی چیز کے بنانے میں بواسطہ اور بلا واسطہ سینکڑوں آدمی کی شرکت کی ضرورت پڑتی ہے لیکن شاعر کونسا کام انجام دے سکتا ہے۔ مدحیہ شعر کہ کر صلہ کا طالب ہونا کس قدر لغو ہے۔ ممدوح نے کب کہا تھا کہ تم اِسکی مدح کرو۔ البتہ وہ شاعر قدر کے قابل ہے۔ جو کسی کی مدح وغیرہ نہیں کرتا۔ اِن تمام خیالات کو **انوری** نے نہایت صفائی اور برجستگی سے ادا کیا ہے۔

اے برادر بشنوے رمزی ز شعر و شاعری　　تا ز ما مشتے گدا، کس را بمردم نشمری
زانکہ از کناس ناکس در ممالک چارہ نیست　　حاش للہ تا ندانی ایں سخن را سرسری
زانکہ گر حاجت فتد تا فضلہ را کم کند　　ناقلے باید، تو نتوانی کہ خود بیروں بری
کار خالد کے بجعفر مے شود ہرگز تمام　　آں یکے جولاہگی داند دگر برزگری
باز گر شاعر نباشد ہیچ نقصان نا وفتد　　در نظام عالم از روئے خرد گر بنگری
آدمی را چوں مؤنت شرط کار شرکت است　　نان ز کناسی خوری بہ زاں بود کز شاعری
آں شنیدستی کہ سہ صد کس بباید پیشہ در　　تا تو نا دانستہ و بے آگہی نانے خوری
در ازائے آں اگر از تو نباشد یاری　　آں نہ نان خوردن بود، دانی چہ باشد بربری
چوں نہ داری بر کسے حقی حقیقت داں کہ ہست　　ہم تقاضا ریش گادی ہم ہجا کون فری
از چہ واجب شد بگو؟ آخر بدیں آزاد مرد　　اینکہ مے خواہی ازو، یا آنکہ زو مستکبری
او ترا کے گفت؟ کایں گلتڑہ ہا را جمع کن　　تا ترا لازم شود چنداں شکائت گستری
عمر خود خود مے کنی ضائع (لغویات) ازو تا واں مخواہ　　ہم تو حاکم باش تا ہم زاں کہ بفروشی خری

دشمن جان من آمد شعر چندش پرورم
اے مسلمانان فغاں از دست دشمن پروری

شعر دانی چیست؟ دور از روئے تو حیض الرجال
قائلش گو خواہ حیواں باش و خواہی مشتری

اینکہ پرسد ہر زماں ایں کون خران گاو ریش
کانوری بہ یا فتوحی در سخن یا سنجری

راستی بہ بو فراس آمد نگار شاعراں
داں نہ از جنس سخن بل از کمال قادری

زانکہ ہیچوں و چگوناں مدح و ثنا ہرگز نہ گفت
پس مرنج ار گویدت من دیگرم تو دیگری

مرد را باید کہ حکمت نیز دامن گیردش
تا شفائے بو علی خوانند نہ ژاژ بحتری

جس زمانہ میں غزوں (تاتاریوں) نے سلطان سنجر کو گرفتار کر لیا اور کئی برس تک قید میں رکھا، تمام ملک میں بدامنی پھیل گئی، اہل خراسان نے احمد سلیمان سے استغاثہ کرنا چاہا انوری سے درخواست کی کہ ان عبرت انگیز واقعات کو نظم میں ادا کردے۔ انوری نے فرمائش کی تعمیل کی۔

بہ سمرقند اگر بگذری اے باد سحر
نامۂ اہل خراساں بہ بر خاقان بر

نامۂ مطلع او، رنج تن و آفت جان
نامۂ مقطع او درد دل و سوز جگر

نامۂ بر رقمش، آہ شہیداں پیدا
نامۂ در شکنش، خون شہیداں مضمر

تاکنوں حال خراساں و رعایا بودہ است
بر خداوند جہاں خاقان پوشیدہ مگر

اے کیومرث بقا، بادشہ کسرے عدل
اے منوچہر لقا، خسروا فریدوں فر

قصۂ اہل خراساں بشنو از سر لطف
چوں شنیدی ز سر رحم در ایشاں بنگر

ایں دل افگار جگر سوختگاں مے گویند
کاے دل و دولت و دیں را ز تو شادی و ظفر

خبرت ہست کزیں زیر و زبر شوم غزاں
نیست یک تن ز خراساں کہ نشد زیر و زبر

بر بزرگان زمانہ شدہ، خرداں سالار
بر کریماں جہاں گشتہ، لئیماں، مہتر

شاد الا بہ در مرگ نہ بینی مردم
بکر نیز و در شکم مادر نیابی دختر

بر مسلماناں زاں شکل کنند استخفاف
کہ مسلماں نہ کند صد یک آں با کافر

خلق را زیں غم فریاد رس اے شاہ نژاد
ملک را زیں ستم آزاد کن اے پاک سیر

رحم کن رحم بر آں قوم کہ جویند جویں
از پس آنکہ نخوردندے از ناز شکر

رحم کن رحم بر آنہا کہ نیابند نمد
از پس آنکہ ز اطلس شاں بودے بستر

کسی دوست کو دعوت میں بلایا ہے۔ اور نظم میں رقعہ لکھا ہے۔

ندارد مجلس ما بے تو نورے
اگرچہ نیست مجلس در خور تو

چہ فرمائی چہ گوئی مصلحت چیست　　تو آئی نزدِ ما؟ یا ما برِ تو؟

دربارداری اور دریوزہ گری سے توبہ کی تو یہ قطعہ لکھا۔

من وایں عہد کہ با قحبۂ رعنائی جہاں　　بعد ازاں عشق نبازم نہ بسہو نہ بعمد
قوت دادن اگر نیست مرا باکے نیست　　قوت ناستدن ہست فللّٰہ الحمد

یعنی اگر دوسروں کو دینے کا مقدور نہیں تو یہ قدرت تو ہے کہ دوسروں سے کچھ نہ لوں۔ علم کی بے قدری پر اس طرح غصہ ظاہر کرتا ہے۔

اے خواجہ مکن، تا بتوانی طلب علم　　تا در طلب راتبِ ہر روزہ بمانی
رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز　　تا دادِ خود از کہتر و مہتر بستانی
فرعون و عذاب ابد و ریش مرصع　　موسیٰ کلیم اللّٰہ و چوبی و شبانی

یعنی فرعون کافر ہو کر داڑھی میں موتی پروتا تھا، اور حضرت موسیٰ کلیم اللّٰہ ہو کر بکریاں چراتے تھے۔

عوام کی بے تمیزی، کو ایک فرضی قصہ میں ادا کرتا ہے۔

روبہے مے دوید در غم جاں　　روبہے دیگرش بدید چناں
گفت خیر است؟ باز گوئی خیر　　گفت خرگیری کند سلطاں
گفت تو خر نۂ چہ مے ترسی　　گفت آرے ولیک آدمیاں
مے ندانند و فرق مے نہ کنند　　خر و روباہ شاں بود یکساں

شیخ سعدی نے "ایں ہم بچۂ شتر است" کا لطیفہ غالباً یہیں سے لیا ہے۔

بات چیت، خط کتابت میں ایشیائی تکلفات سے **انوری** بھی تنگ آگیا تھا چنانچہ کہتا ہے۔ اور کس بے تکلفی سے کہتا ہے۔

تکلف میان دو آزاد مرد　　بود ناپسندیدہ و سخت کام
بیا تا تکلف بیک سو نہیم　　نہ از تو رکوع و نہ از ما قیام
بسنت کنم اقتدا زیں سپس　　سلامٌ علیکم، علیکم سلام

ہجو

انوری کا اصلی مایہ فخر ہجو ہے۔ اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر ہجو گوئی شریعت ہوتی تو انوری اس کا پیغمبر ہوتا۔ ہجو میں اس نے نہائت اچھوتے، نادر، باریک اور لطیف مضامین پیدا کئے ہیں۔ ان ہجوؤں میں قوت تخیئل جو شاعری کی سب سے ضروری شرط

ہے۔ صاف نظر آتی ہے۔ لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ اس صنف میں اس کا جو کلام زیادہ نادر ہے۔ اُسی قدر زیادہ فحش ہے سینکڑوں اشعار ہیں لیکن (دو ایک کے سوا) ایک بھی درج کرنے کے قابل نہیں، کسی کو ایسا ہی شوق ہو تو آتشکدۂ آذر موجود ہے ہم اپنے دست و قلم کو اس سے آلودہ نہیں کر سکتے، ایک آدھ ہجو فحش سے خالی بھی ہے، وہ حاضر ہے۔

پہلے ایک شخص کی مدح لکھی۔ پھر صلہ کا تقاضا کیا، اس کے بعد ہجو کی دھمکی دی۔ دیکھو کس لطیف طریقہ سے ادا کیا ہے۔

سہ بیت رسم بود شاعران طامع را	یکے مدیح و دگر قطعۂ تقاضائی
اگر بداد سوم شکر، ورنہ داد ہجا	ازیں سہ بیت دو گفتم، و گرچہ فرمائی

یعنی شاعروں کا قاعدہ ہے کہ تین نظمیں لکھتے ہیں، اول مدح پھر قطعۂ تقاضائی جس میں صلہ کا تقاضا ہوتا ہے، اب ممدوح نے صلہ دیا تو شکریہ ورنہ ہجو ان تین نظموں سے، میں دو تو کہہ چکا، فرمایئے اب کیا ارشاد ہوتا ہے۔

گھوڑے کی ہجو لکھتا ہے۔

بر عادت از وثاق بصحرا بروں شدم	با یک دو آشنا ہم از ابنائے روزگار
اسپے چناں کہ دانی زیر اندمیانہ زیر	وز کاہلی کہ بود نہ سکسک نہ رہوار
در خفت و خیز ماند ہمہ راہ عید گاہ	من گاہ از و پیادہ و گاہے او بر سوار
نہ از غبار خاستہ بیروں شدے بزور	نہ از زمیں خستہ برانگیختے غبار
گہ طعنہ ازیں کہ رکابش دراز کن	گہ بذلہ زاں کہ عنانش فرو گزار
من والہ و خجل متحیر فرو شدہ	چشمے سوئے بمینم و گوشے سوئے سوار

سودا نے گھوڑے کی ہجو میں جو قصیدہ لکھا ہے۔ اسی کا تتبع ہے۔ چنانچہ بحر و قافیہ بھی یہی ہے۔

نکتہ، انوری کے دیوان میں چند ہجویں، انوری کی بیوی اور بیٹے کی بھی پائی جاتی ہیں۔ عام لوگوں کا خیال ہے۔ کہ انوری کو ہجو کا ایسا چسکا پڑ گیا تھا۔ کہ بیوی اور بیٹے کو بھی نہ چھوڑ سکا، لیکن غالباً اور شعراء نے یہ ہجویں لکھ کر اس کے دیوان میں داخل کردیں اور چونکہ پبلک اُسکی دشمن تھی اس لئے وہ اسی طرح قائم رہ گئیں، اس خیال کی تائید اس سے ہوتی ہے۔ کہ فتوحی مروزی نے انوری کے نام سے بلخ کی جو ہجو لکھ کر مشہور کردی۔ ۵۵

آج تک انوری کے دیوان میں داخل ہے۔ حالانکہ ابوالحسن فراہانی شارح قصائدِ انوری وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ وہ ہجو، فتوحی مروزی کی تصنیف ہے۔

انوری علوم عربیہ میں کمال رکھتا تھا۔ اس لئے اس کے کلام میں یہ خصوصیت خود بخود پیدا ہو گئی ہے۔ کہ عربی تلمیحات، عربی جملے، عربی الفاظ، اس خوبی سے شامل کرتا ہے کہ گویا انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

شاعری، دانی کدامے قوم کردند آں کہ بود
اوّلِ شاں امرء القیس، آخرِ شاں بوفراس

دیں کہ من خادم ہمے پردازم اکنوں ساحریست
ساحری گو، تا بیاید گوشمال از مساس

سنائی کے قصیدے کا جو جواب لکھا ہے اس میں اکثر قافیے اسی قسم کے آئے ہیں، مثلاً

بر و جان پدر تن در مشیت دہ کہ دیر افتد
زیاجوج تمنا رخنہ در سدِّ ولو شئنا

بلے از جاہل وا اکسیر بدست تست ایں از شتہ
ولیک از جاہدوا ہم بر نخیزد ہیچ بے قلنا

چوں مرادِ خویش را با ملک یے کردم قیاس
در خراساں تازہ بنہادم اقامت را اساس (یعنی جاہدوا اقلنا)

چوں غنیمت را مقابل کردہ شد با المنی
عقل سی روزہ طمع ما ہے بود ر اسابواس

النظر فاقتبس من نورکم کے گفت چرخ
کافتاب از آفتاب ہمتت کرد اقتباس

تا کہ باشد ایں مثل کالیاس احدی الراحتین
بادے اندر راحتے کو را نباشد بیم یاس

بے سپیدہ دم شبِ خذلاں بدخواہت چنانکہ
تا بصبح حشر مے گوید احادٌ ام سداسٌ

متنبی کے اس مطلع کی طرف اشارہ ہے۔ احادٌ ام سداسٌ فی احاد

دوستاں با یک جگر پُر خوں کہ اینک قد صفا
دشمناں با یکدگر پُر خندہ کاینک قد ہلک

آدم از نسبتِ وجودِ تو یافت
اختصاصِ خلقتہ بیدی

دوش با آسماں ہمے گفتم
بر سبیل سوال مطلب اے

کاے علی اخنح ابی حشم بر کیست
ہمتت گفت قد ضمرت علی

مہر آب است و حق ہمے گوید
کہ من الماء کل شیئ حیّ

خصم تو و قاعدۂ ملک او
آں شدہ ار بد و جہاں مستقیم

چوں دو بنا بود برافراشتہ
زاں دو یکے محدث و دیگر قدیم

زلزلۂ قہر تو شاں کرد پست
زلزلۃ الساعۃ شیئ عظیم

جو لوگ انوری کی پیغمبری کے قائل ہیں، وہ اس کے ثبوت میں اس کی مضمون

آفرینیوں سے استدلال کرتے ہیں۔

متنبّی نے مضمون باندھا تھا کہ ممدوح گو انسانوں میں داخل ہے۔ لیکن انسانوں سے فائق ہے جسطرح نافہ کہ ہرن کے خون سے بنا ہے لیکن خون سے اسکو کچھ نسبت نہیں ہے۔

فان تفق الانام وانت منھم	فان المسک بعض دم الغزال

اس سے ترقی کرکے شراب و انگور کی مثال دی۔

فان فی الخمر معنیً لیس فی العنب

یعنی گو شراب انگور سے بنتی ہے۔ لیکن یہ انگور سے بڑھکر ہے۔ ممدوح کا بھی یہی حال ہے

انوری نے ان سب تشبیہوں کو گرد کر دیا۔

در جہانی و از جہاں بیشی	ہمچو معنی کہ در بیاں باشد

یعنی اے ممدوح تو دنیا میں ہے۔ لیکن دنیا سے زیادہ ہے۔ جسطرح عبارت میں معنی ہوتے ہیں کہ عبارت ذراسی ہوتی ہے۔ اور مضمون نہائت وسیع ہوتا ہے۔

زحرص خدمتِ او سرنگوں ہمے آیند	بوقتِ زادن از ارحام مادراں طفلاں

بچے عموماً ماں کے پیٹ سے سر کے بل پیدا ہوتے ہیں۔ انوری اس کا سبب یہ قرار دیتا ہے۔ کہ انسان فطرتاً ممدوح کی خدمت کے خواہشمند ہیں۔ اس لئے دنیا میں آتے ہیں تو سر کے بل آتے ہیں، مبالغہ جو عوام کے نزدیک شاعری کی ایک اعلیٰ صنف ہے انوری اس میدان میں سب سے آگے ہے۔

ممدوح کی مدح میں　　ع۔ اے بیش ز آفرینش و کم ز آفریدگار

ع۔ چیست کمال بر تو دانیست مگر عزّ و جل

بزرگواری کاندر کمال قدرت خویش	نہ ایزد ست و چو ایزد بزرگ بے ہمتا است
گر صبا از کف دست تو وزد وقت بہار	ورم افشاں و مدا از شاخ بروں دست چنار

انوری اور یورپ انوری کی خوش قسمتی میں ایک نمبر یہ بھی اضافہ کرنا چاہئے کہ یورپ نے اس کے کلام کے ساتھ نہائت اعتنا کیا، روس کے پروفیسر والنٹن ژکوسکی نے ۱۸۹۳ء میں بمقام سینٹ پیٹرسبرگ، انوری کے کلام اور اس کی سوانحعمری پر ایک کتاب لکھی جس کا یہ نام ہے "مٹیریلس فار اے بیوگرفی اینڈ کیرکٹرسٹک اسکیچ"، یہ کتاب ۱۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس کے عنوانات حسب ذیل ہیں:۔

پروفیسر براؤن نے اس کتاب کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ ناظرین اسکو ملاحظہ فرمائیں اور غور کریں کہ اہل یورپ ہر زبان کے متعلق، کیا کیا نکتہ سنجیاں اور دیدہ ریزیاں کرتے ہیں کہ ہم اُن کی تقلید کبھی نہیں کر سکتے۔

نظامی

الیاس یوسف نام، ابو محمد کنیت، نظام الدین لقب، نظامی تخلص، باپ کا نام مؤید تھا وطن عام طور پر گنجہ مشہور ہے۔ لیکن دراصل قم کے رہنے والے تھے۔ چنانچہ خود سکندر نامہ میں فرماتے ہیں۔

چو دُر گرچہ در بحر گنجہ گمم	ولے از قہستان شہر قمم

قم کے اضلاع میں تفرش ایک ضلع ہے اصل وطن یہاں تھا لیکن چونکہ قم صدر مقام ہے۔ اس لئے انتساب میں تفرش کے بجائے قم کا نام لیتے ہیں، نظامی کے والد بزرگوار وطن چھوڑ کر گنجہ میں آئے۔ نظامی[۱] یہیں پیدا ہوئے، سال ولادت کسی نے بیان نہیں کیا۔ چونکہ بروائت صحیح سن وفات ۵۹۶ھ ہے۔ اور ان کی عمر عموماً ۶۳ برس کی بیان کی جاتی ہے اس لئے سال ولادت ۵۳۳ھ سمجھنا چاہیئے۔

نظامی کا خاندان، علمی خاندان تھا، ان کے بھائی قوامی مطرزی مشہور شاعر ہیں۔

[۱] یہ امین رازی اور لطف علی آذر کی تحقیق ہے لیکن سکندر نامہ کے جس شعر سے امین رازی نے استدلال کیا ہے وہ موجودہ نسخوں میں مذکور نہیں، تفرش کی مزید تفصیل، اور نظامی کی جائے ولادت لطف علی آذر سے ماخوذ ہے۔

ان کا ایک قصیدہ ہے۔ جس میں تمام صنائع شاعری جمع کر دیئے ہیں۔

نظامی نے ابتدا میں درسی علوم کی تحصیل کی، ان کے کلام سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ علمی مسائل اُن کے پیش نظر ہیں۔ خود بھی دعوےٰ کرتے ہیں۔

ہر چہ ہست از دقیقہائے نجوم خواندم و سرّ ہر ورق جستم	با یکایک نہفتہائے علوم چوں ترا یافتم ورق شستم

سلسلۂ طریقت میں واخی فرخ زنجانی سے بیعت تھی۔

نظامی اگرچہ درویشانہ طبیعت رکھتے تھے، لیکن شاعری بھی ازل سے ساتھ لائے تھے، گھر میں پہلے سے شاعری کا چرچا تھا۔ اس لئے درسی علوم سے فارغ ہو کر، تصنیف کا قلم ہاتھ میں لیا تو حرف موزوں نکلے، مشق روز بروز بڑھتی گئی، اور کلام کا شہرہ دُور دُور پہنچا، یہاں تک کہ اُس زمانہ کے تمام بڑے بڑے سلاطین نے ان کی قدردانی کو، لازمۂ سلطنت سمجھا، اور فرمایش کر کے، اُن سے اپنے اپنے نام پر کتابیں لکھوائیں۔ اسباب اس کے مقتضی تھے کہ سب سے پہلے قریبی دربار سے تعلق پیدا ہوتا، لیکن یہ سعادت، دور والوں کی قسمت میں لکھی تھی، سب سے پہلے جسکو یہ عزت نصیب ہوئی وہ بہرام شاہ[1] تھا نظامی نے مخزن اسرار ۵۵۹ھ میں اسی کے نام پر لکھی۔ اور صلہ میں اس نے پانچ ہزار اشرفیاں، ایک قطار شتر، اور انواع و اقسام کے بیش قیمت کپڑے بھیجے۔

مخزن کی تصنیف کے وقت، نظامی کا سن تقریباً ۲۵ برس کا تھا۔

نظامی کا وطن گنجہ، سلجوقیوں کی حدود حکومت میں واقع تھا۔ اور اس زمانہ میں اس سلسلہ میں سلطان طغرل بن ارسلان فرمانروا تھا، وہ نہایت دلیر، شجاع اور عدل پرور بادشاہ تھا۔ علم و فضل میں بھی کمال رکھتا تھا، شعر و شاعری کا بھی مذاق تھا، چنانچہ یہ رباعی اس کی مشہور ہے۔

دی روز چناں وصال جاں افروزی	و امروز چناں فراق عالم سوزی

[1] سلطان الپ ارسلان سلجوقی نے منکوچک غازی کو جو قائم بامراللہ کا منظور نظر تھا، ارزنجان اور کماخ وغیرہ کے علاقہ کا حاکم مقرر کیا تھا، اس کے خاندان میں سے بہرام شاہ نے بہت جاہ و جلال حاصل کیا، یہاں تک کہ سلطان قلیچ ارسلاں سلجوقی بادشاہِ روم نے اسکو اپنی لڑکی بیاہ دی، بہرام شاہ نہایت فیاض اور بلند ہمت تھا یہی بہرام، نظامی کا ممدوح ہے جس کے نام پر انہوں نے مخزن الاسرار لکھی۔ (از ہفت اقلیم امین رازی)

جیف است کہ در دفتر عمرم ایام　　آنرا روزے نویسد، ایں را روزی[1]

طغرل نے سلطنت کا تمام کاروبار اتابک محمد بن ایلد کز کے ہاتھ میں دے دیا تھا، جو ابتدا میں غلام تھا۔ اور ترقی کرتے کرتے امیر الامراء کے منصب پر پہنچ گیا تھا، محمد بن ایلد کز کا بھائی قزل ارسلاں جس کی مدح میں ظہیر فاریابی کا یہ شعر مشہور ہے۔

نہ کرسی فلک نہد، اندیشہ زیر پائے　　تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد

کاروبار سلطنت میں برابر کا شریک تھا۔

اِس زمانہ میں نظامی نے شیریں خسرو کہنی شروع کی تھی، کتاب کا ابھی آغاز تھا کہ اس کے چرچے دُور دُور پھیل گئے، طغرل کو خبر ہوئی، اسی وقت فرمان بھیجا کہ ایسی کتاب لکھئے کہ یادگار رہ جائے، چنانچہ دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

چو سلطانِ جہاں شاہ جواں بخت　　کہ برخوردار باد از تاج و از تخت
بہ سلطانی بہ تاج و تخت پیوست　　بجائے ارسلاں بر تخت بنشست
من ایں گنجینہ را در مے کشادم　　بنائے ایں عمارت مے نہادم
اشارت رنگے از درگاہ معمور　　بہ شغل بندہ الفا کرد منشور
کز ینساں تحفۂ عالی بسازد　　کہ عقل از منتش گردن فرازد

جس زمانہ میں نظامی یہ مثنوی لکھ رہے تھے۔ اُن کے ایک دوست جو مذہب میں نہائت تعصب رکھتے تھے، اُن کے پاس آئے اور نہائت ناراضی کے لہجہ میں کہا کہ کافروں کے جھوٹ سچ قصے لکھنے سے کیا فائدہ،

فسونِ بُت پرستاں لفگن از مشت　　فسون جوانی مکن بر زند زردشت
در توحید زن کا وازہ داری　　چرا رسم مغاں را تازہ داری

لیکن نظامی نے جب مثنوی کے چند اشعار پڑھکر سنائے، تو انہوں نے بے ساختہ کہا۔

چنیں سحرے نودانی ساز کردن　　چُتے با کعبۂ انبازہ کردن

شیریں خسرو جب انجام کو پہنچی تو محمد بن یلد کز جو درحقیقت تاج و تخت کا مالک تھا۔ وفات کر چکا تھا اور اس کا بھائی قزل ارسلاں اس کا قائم مقام مقرر ہوا تھا۔ اِس کو شیریں خسرو کے تمام ہونے کی خبر پہنچی تو نظامی کی طلبی کا فرمان بھیجا۔ قاصد فرمان لے کر آیا نظامی نے آداب شاہی کے مطابق فرمان کو پہلے سر پر رکھا، پھر تین جگہ بوسہ دے کر کھولا۔

لہ حبیب السیر ۱۲

چنانچہ شیریں خسرو کے خاتمہ میں خود فرماتے ہیں -

مثال شاہ را بر سر نہادم	سہ جا بوسیدم و سر بر کشادم

اُسی وقت گھوڑے پر سوار ہوئے - اور دشت و بیاباں طے کرتے ہوئے قریباً ایک مہینہ میں پائے تخت میں پہنچے، قاصد نے جاکر دربار میں اطلاع کی، قزل ارسلاں نے شمس الدین محمد کو حکم دیا کہ خود جاکر اُن کو ساتھ لائے - دربار میں پہنچے تو دیکھا کہ مجلس عیش آراستہ ہے - ساز چھڑ رہے ہیں - گانا ہو رہا ہے - بادہ و جام کا دور چل رہا ہے - قزل ارسلاں نے فوراً ان کے ادب سے گانا بجانا بند کرا دیا - اور تخت سے اٹھ کر تعظیم بجالایا - پھر بیٹھنے کا اشارہ کیا ہر طرح کی باتیں ہوتی رہیں - بیچ بیچ میں بزرگانہ نصیحتیں بھی کرتے جاتے تھے - مدحیہ نظم لکھکر لے گئے تھے - اُس کو سنانا چاہا - قاعدہ یہ تھا کہ شعراء اپنا کلام خود نہیں پڑھتے تھے بلکہ کسی خوش لہجہ سے پڑھواتے تھے - جو ہمیشہ اُن کے ساتھ رہتا تھا - اور اُس کو **راوی** کہتے تھے - چنانچہ راوی نے قصیدہ پڑھنا شروع کیا - یہ بھی دستور تھا کہ جب قصیدہ پڑھا جاتا تھا تو شاعر کھڑا ہو جاتا تھا - اور قصیدہ کے ختم ہونے تک کھڑا رہتا تھا - **نظامی** نے بھی اس قاعدہ کو بجالانا چاہا - لیکن قزل ارسلاں نے قسم دلا کر منع کیا -

چو بر پا ایستادم گفت بنشیں	بہ سوگندم نشاند ایں منزلت ہیں

راوی نے مدح کے بعد شیریں خسرو کا قصہ شروع کیا، بادشاہ نظامی کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے نہایت شوق میں سن رہا تھا اور بار بار بے ساختہ تحسین کرتا جاتا تھا - نظامی کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ آپ نے ہمیشہ کے لئے میرا نام زندہ کر دیا، اس کا صلہ دینا میرا فرض ہے پھر پوچھا کہ بھائی صاحب (اتابک پہلوان محمد بن ایلدکز) نے آپ کی جاگیر میں دو گاؤں دیئے تھے - وہ آپ کو ملے یا نہیں - انہوں نے کہا -

بلے شاہ سعید از خاص خویشم	پذیرفت آنچہ فرمودی نہ بیشم
چو رخت عمر او کشتی رواں کرد	مرا نے جملہ عالم را زیاں کرد

قزل ارسلاں نے ایک گاؤں جسکا نام حمدونیاں تھا - اپنی طرف سے جاگیر میں دیا[۱] - معلوم نہیں، جان کر یا غلطی سے اگاؤں جو جاگیر میں دیا گیا وہ غیر آباد اور بنجر تھا - چنانچہ **نظامی** نے شیریں خسرو میں اس کی شکایت اس تقریب سے کی ہے کہ حاسدوں

[۱] یہ تمام حالات تفصیل کے ساتھ خود نظامی نے شیریں خسرو کے خاتمہ میں لکھے ہیں - ۱۲

نے مجھکو طعنہ دیا۔ میں نے جواب میں کہا کہ غیر آباد ہے تو کیا، بادشاہ کا عدل اسکو آباد کر دیگا
نظامی کی شہرت اب اس قدر عالمگیر ہو گئی تھی کہ اور سلاطین کو بھی آرزو ہوئی کہ ان سے اپنے نام پر تصنیفات لکھوائیں کہ اس ذریعہ سے ان کا نام بھی یادگار رہ جائے۔ ان میں علم و فضل کی قدر دانی کے لحاظ سے سب سے ممتاز منوچہر خاقان کبیر جلال الدنیا والدین شاہ آغستان تھا۔ جو سلاطین شروانیہ کے سلسلہ کا درۃ التاج تھا، یہ خاندان خالص ایرانی نسل یعنی بہرام چوبیں کی یادگار تھا منوچہر نہایت علم دوست اور علم پرور تھا۔ **خاقانی** **ابوالعلا گنجوی** (استاد خاقانی) ذوالفقار شروانی، شاہفور وغیرہ شعرا اسی کے خوان کرم کے زلہ خوار تھے۔ ابوالعلا گنجوی، اسی کے دربار کا ملک الشعراء تھا، اور خاقانی کو افضل الشعراء کا خطاب اسی نے عنایت کیا **منوچہر** نے اپنے ہاتھ سے نظامی کو دس پندرہ سطروں کا خط لکھکر بھیجا کہ لیلی مجنوں کی داستان نظم کیجئے، چنانچہ دیباچہ میں خود کہتے ہیں۔

درحال رسید، قاصد از راہ		آوردمثال حضرت شاہ	
بنبشتہ بہ خط خوب خویشم		دہ پانزدہ سطر نغز بیشم	
کاے محرم حلقۂ غلامی		جادو سخن جہاں نظامی	
خواہم کہ بہ یاد عشق مجنوں		گوئی سخنے چو دُرِّ مکنوں	

خط پہنچا تو نظامی کو تردد ہوا، اتفاق سے ان کے صاحبزادے **محمد** جن کی عمر اس وقت ۱۴ برس کی تھی، اس وقت موجود تھے۔ انہوں نے بھی تحریک کی، نظامی نے کہا، جان پدر، قصہ کی شہرت میں کلام نہیں، لیکن جہاں کی سرگذشت ہے۔ وہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں، باغ و بہار، چشمہ و سبزہ زار، رقص و سرود، شاہی دربار، خیل و حشم، جاہ و جلال، کسی چیز کا پتہ نہیں، خشک ریگ زار، اور کوہستان ہیں، میں کیا صنعت گری دکھاؤں گا۔

نے باغ و نہ بزم شہریاری		نے رود و نہ مے نہ کامگاری	
بر خشکی ریگ و سختی کوہ		تا چند سخن رود در اندوہ	

یہی بھید ہے کہ آج تک کسی نے اس قصہ کو ہاتھ نہیں لگایا، صاحبزادہ نے کہا یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایسا مؤثر اور عجیب و غریب واقعہ نظم کی آرائش سے محروم رہ جائے، غرض **نظامی** نے بادشاہی ارشاد کی تعمیل شروع کی۔ اور کچھ کم چار مہینے میں انجام کو پہنچائی سال اتمام رجب ۵۸۴ھ ہے۔

من گفتم و دل جواب مے داد ——— خاریدم، و چشمہ آب مے داد
ایں چار ہزار بیت و اکثر ——— گفتم بہ چہار ماہ کمتر
گر شغل دگر حرام بودے ——— در چاردہ شب تمام بودے
تاریخ عیاں کہ داشت باخود ——— ہشتاد و چہار بود و پانصد (۵۸۴ھ)

نظامی نے اس مثنوی کے صلہ میں بادشاہ سے یہ خواہش کی کہ ان کے صاحبزادے ولی عہد سلطنت کے ندیموں اور مصاحبوں میں داخل کئے جائیں۔

۱۴ رمضان ۵۹۳ھ میں سلطان غیاث الدین کرپ[1] ارسلان علاؤالدین آقسنقری کی فرمائش سے ہفت پیکر لکھی۔ جس میں بہرام گور کا قصہ ہے۔

قزل ارسلان کے مرنے کے بعد، اس کا بھتیجا یعنی محمد بن ایلدگز کا فرزند ارجمند ابوبکر نصرۃ الدین ۵۸۷ھ میں مسند آرا ہوا، نظامی کو اس خاندان سے قدیم تعلق تھا۔ اس وقت تک انہوں نے جو کتابیں لکھی تھیں، سلاطین وقت کی فرمائش سے لکھی تھیں، لیکن سکندرنامہ اپنی خواہش سے لکھا، اور ابوبکر نصرۃ الدین کے نام سے موسوم کیا۔ یہ کتاب ۵۹۶ھ میں انجام کو پہنچی، چنانچہ خود سکندرنامۂ بحری کے خاتمہ میں لکھتے ہیں۔

بہ پایاں شد ایں داستان دری ——— بہ فیروز فالی و نیک اختری
ز ہجرت چناں بردہم یادگار ——— نود نہ گزشتہ ز پانصد شمار

کتاب لکھ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کی تو مقررہ رقم کے علاوہ، سواری کا گھوڑا بیش قیمت کپڑے خلعت وغیرہ عطا ہوا[2]۔

اساتذہ سے میں نے سنا ہے کہ سلاطین وقت نظامی کی اس قدر عزت کرتے تھے کہ ایک بادشاہ نے اپنی لڑکی، اُن کے بیٹے سے بیاہ دی تھی۔ میں نے کسی کتاب میں یہ واقعہ نہیں دیکھا، لیکن سکندرنامۂ بحری کے خاتمہ سے اس قدر بہ تصریح ثابت ہوتا ہے کہ نظامی نے اپنی صاحبزادی اور اپنے فرزند محمد کو نصرۃ الدین کی خدمت میں بھیجا تھا، چنانچہ کہتے ہیں۔

---

[1] اس کا حال نہ معلوم ہو سکا ۱۲ [2] سکندرنامۂ بحری کے خاتمہ میں یہ تصریح ہے لیکن تعجب ہے کہ نقد رقم صرف ہزار لکھی ہے۔ اگر یہ ہزار دینار بھی فرض کرلئے جائیں۔ تب بھی ایسی رقم ہے۔ جو نہ نظامی کے شایاں ہے۔ نہ ایک مشرقی بادشاہ کے چہرے پر کھلتی ہے۔

دو گوہر بر آمد ز دریائے من	فروزندہ از روئے شاں رائے من
یکے عصمتِ مریمے یافتہ	یکے نور عیسےٰ برو تافتہ
فرستادہ ام ہر دو را نزد شاہ	کہ یاقوت را دُرج دارد نگاہ
عروسے کہ دور او ز مادر بود	بہ از پردہ دارش برادر بود
ببایدچو آید بر شہریار	چنیں پردگی را چناں پردہ دار
چوں من منزلِ خاص تو جاں دادہ ام	جگر نیز باجاں فرستادہ ام

اخیر شعر سے صاف یہ راز کھل جاتا ہے۔

اس کتاب کی تصنیف کے وقت اُن کی عمر ۶۳ برس کی تھی، چنانچہ جہاں اور حکماء کے مرنے کا الگ الگ عنوان قائم کیا ہے۔ اپنے نام کی بھی سُرخی قائم کی ہے۔ اُسکے ذیل میں لکھتے ہیں،

نظامی چو ایں داستاں شد تمام	بہ عزم شدن تیز برداشت گام
فزوں بود شش مہ ز شصت و سہ سال	کہ بر عزم رہ بردہل زد دوال

اس کتاب پر اُن کی شاعری اور عمر دونو کا خاتمہ ہوا، سال وفات میں سخت اختلاف ہے۔ دولت شاہی میں ۵۹۶ھ لکھا ہے لیکن یہ خود **نظامی** کی تصریح کے خلاف ہے نقی کاشی نے ۶۰۶ھ لکھا ہے۔ جامی ۵۹۲ھ بیان کرتے ہیں۔ لیکن اس قدر قطعی ہے کہ ۵۹۹ھ کے بعد اُن کی وفات ہوئی ہے۔ اور غالباً چھٹی صدی سے آگے نہیں بڑھے

چونکہ انہوں نے تمام عمر گوشۂ عزلت سے قدم نہیں نکالا، نہ لوگوں سے زیادہ ملتے جلتے تھے، اس لئے اُن کی زندگی کے حالات و واقعات بہت کم معلوم ہیں عام تذکرہ نویس اُن کے اِس وصف کے نہائت مداح ہیں، کہ وہ بادشاہوں کی خوشامد اور درباداری سے بالکل پاک تھے، البتہ جو سلاطین ان کے ساتھ ارادت و اعتقاد کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اُن پر بزرگانہ عنائت کرتے تھے، لیکن ان کی کتابوں میں سلاطین کی جو مدحیں ہیں۔ اُن میں وہی حد سے زیادہ مبالغہ، خوشامد، اور تملق ہے۔ جو عام مداحوں کا انداز ہے۔ اِس سے بڑھکر یہ کہ جس بادشاہ کا ذکر کرتے ہیں، اس طرح کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو اِس کے سوا، کسی دربار سے تعلق نہیں۔ اور وہ اسکو فرمانروائے عالم سمجھتے ہیں۔ بے شبہ انہوں نے مدحیہ قصائد نہیں لکھے لیکن مثنویوں میں اس زور کی مدحیں لکھیں جن کے

آگے قصائد کی کوئی ہستی نہیں، ملاحظہ ہو۔

ولائت ستاں شاہ گیتی پناہ — فریدوں کمر بلکہ خاقاں کلاہ
ستارہ کہ بر چرخ ساید سرش — زدہ سکۂ عبدہٗ بر درش
چو تیر از کمان کمیں افگند — سر آسماں بر زمیں افگند
فرنگ و فلسطین و رہبان روم — پذیرائے فرمان مہرش چو موم

اس سے زیادہ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ بادشاہوں کے سامنے اپنے آپ کو جس حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ وہی ہوتی ہے۔ جو گدا پیشہ شاعروں کا انداز ہے یعنی حضور کا نمک خوار ہوں، غلام ہوں، بندۂ درگاہ ہوں، حضور کی ذرا سی توجہ سے میرے سارے کام بن جائیں گے، حضور ہی میری مشکلوں کو حل کر سکتے ہیں۔

کلام پنج گنج کے سوا، نظامی کا اور بہت سا کلام تھا۔ جو آج مفقود ہے دولت شاہ کا بیان ہے کہ اس میں غزلیں، موشحات اور صنائع کے بیس ہزار شعر تھے، تذکروں میں چند قصائد، قطعات، اور غزل کے جستہ جستہ اشعار پائے جاتے ہیں۔ تعجب یہ ہے۔ کہ عشقیہ شاعری کی نقش آرائیاں انہی کی بدولت وجود میں آئیں، لیکن غزلیں پھیکی اور بے مزہ ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

خوشا جانے کز و جانے بیاسود — نہ درویشے کہ سلطانے بیاسود
نکوئی بر نکو روئے بہا ناد — کہ از لبہاش دندانے بیاسود
بہ عمر خود پریشانی مبیناد — دلے کز وے پریشانے بیاسود
مرا گوئی کہ چونی؟ چونم اے دوست — جگر پُر درد دل پُر خونم اے دوست
شنیدم عاشقاں را مے نوازی — مگر من زاں میاں بیرونم اے دوست
پیش تو کردہ ام عیاں حال تباہ خویش را — تا تو نصیحتے کنی چشم سیاہ خویش را
سر زنشم مکن کہ تو شیفتہ تر زمن شوی — گر نگری در آئینہ روئے چو ماہ خویش را
ختنی جمالی اے مہ زحبش چہ نام داری — تو بجز خطے و خالے زحبش کدام داری
حبشی منم نہ در تن ہمہ سوخت است خونم — ختنی توئی کہ در بر ہمہ سیم خام داری
حبشی است رنگ مویت ختنی است رنگ پایت — تو میان ایں دو کشور بہ کجا مقام داری
حبشی سفید نبود، ختنی نمک نہ دارد — تو لطافت سفیدی نمکے تمام داری

انہی بوڑھے غزلوں میں، کبھی کبھی بڑے شوخ جملے بھی زبان سے نکل جاتے ہیں۔

بوسہ مے خواہم ازاں لب تو چہ مے فرمائی / گر صواب است بگو ورنہ خطائے بکنم
میں لب کا ایک بوسہ چاہتا ہوں کہئے کیا رائے ہے / مناسب ہو تو بہتر، ورنہ نامناسب ہی کیا جائے

قصیدے بہت ہیں، لیکن ان میں بھی کوئی خاص بات نہیں **سنائی** کا انداز ہے۔ اخلاق اور تصوف کو ترکیب دے کر کہتے ہیں، لیکن سنائی سے بہت پیچھے ہیں اس لئے مقبول نہ ہو سکے، البتہ ایک قطعہ نہائت صاف، شستہ اور پُر لطف کہا ہے جس کا آج تک جواب نہ ہو سکا۔

دوش رفتم بہ خرابات و مرا راہ نبود / مے زدم نالہ و فریاد کس از من نشنود
یا نہ بد ہیچ کس از بادہ فروشاں بیدار / یا کہ من ہیچ کسم، ہیچ کسم، در نکشود
پاسے از شب بگذشت بیشترک، یا کمتر / رندے از غرفہ برون کرد سر و رخ بنمود
گفت خیر است! دریں وقت کرا مے خواہی / بے محل آمدنت بر در ما بہر چہ بود
گفتمش در بکشا، گفت برو ہرزہ مگوی / کاندریں وقت کسے بہر کسے در نکشود
ایں نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشایند / کہ تو دیر آئی و اندر صف پیش استی زود
ایں خرابات مغان ست درو رندانند / شاہد و شمع و شراب و شکر و نای و سرود
ہر چہ در جملۂ آفاق دریں جا حاضر / مومن و برہمن و گبر و نصارا و یہود
گر تو خواہی کہ دم از صحبتِ ایشاں بزنی / خاک پائے ہمہ شو، تا کہ بیابی مقصود

عصمت بخاری اور عرفی نے قوافی بدل کر اس کا جواب لکھا ہے لیکن جواب نہ ہو سکا۔ عصمت کا قطعہ یہ ہے۔

سرخوش از کوئے خرابات گذر کردم دوش / بہ طلب گاری ترسا بچہ بادہ فروش
پیشم آمد بہ سر کوچہ پری رخسارے / کافرے عشوہ گرے زلف چو زنار بدوش
گفتمش ایں کوئے چہ کوے است ترا خانہ کجا است / اے مہ نو خم ابروی ترا حلقہ بگوش
گفت تسبیح بہ خاک افگن و زنار بہ بند / سنگ بر شیشۂ تقوے زن و پیمانہ بنوش
بعد ازاں پیشِ من آتا بتو گویم سخنے / راہ بنمایم اگر بر سخنم داری گوش
دیں بر افگندہ و مدہوش و دیدم در پیش / تا رسیدم بہ مقامے کہ نہ دیں ماند نہ ہوش
دیدم اندر گروہے ہمہ دیوانہ و مست / از خم بادۂ عشق آمدہ در جوش و خروش

بے مے و مطرب و ساقی ہمہ در عیش و سرود	بے مے و جام و صراحی ہمہ در نوشا نوش
چوں سر رشتۂ ناموس برفت از دستم	خواستم تا سخنی پرسم از و گفت خموش
ایں نہ کعبہ است کہ بے پا و سر آئی بہ طواف	ویں نہ مسجد کہ چنیں بے ادب آئی بخروش
ایں خرابات مغان است درو رندانند	از دم صبح ازل تا بقیامت مدہوش

قصیدہ میں ان کی یہ خصوصیت لحاظ کے قابل ہے کہ اگرچہ ان کو مختلف درباروں سے تعلق تھا، اور بعض قدر مثنویاں لکھیں سب کسی نہ کسی فرمانروا کے نام پر لکھیں، تاہم قصیدہ کو انہوں نے مداحی سے آزاد رکھا، اور یہ بتایا کہ شعر کی اس عمدہ صنف سے اور بھی مفید کام لئے جا سکتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ اُن کے نقش قدم پر کوئی نہ چلا، قصیدے اُس وقت سے آج تک خوشامد کی طرز میں ادا کئے جاتے ہیں۔

نظامی کی شاعری

نظامی نے شاعری کو جس طرح ترقی دی اور جو باتیں اس میں پیدا کیں۔ اُن کو ہم تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن پہلے ان سب کو اجمالاً لکھ دینا چاہئے۔ تاکہ یکجائی طور سے سب باتیں پیش نظر ہو جائیں، اُن کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) جامعیت، یعنی شاعری کی ہر صنف کو انہوں نے ترقی دی۔

(۲) زور کلام۔

(۳) بلاغت

(۴) جدت استعارات اور تشبیہات۔

(۵) ایجاد و اختراع اور قوت تخئیل۔

(۶) اولیات یعنی بہت سی باتیں اول انہی نے ایجاد کیں۔

اب ہم ایک ایک کو تفصیل سے لکھتے ہیں۔

جامعیت ایران میں جس قدر شعرا گزرے ہیں۔ وہ خاص خاص انواع شاعری میں کمال رکھتے تھے۔ مثلاً **فردوسی** رزم کا مرد میدان ہے عشقیہ شاعری میں اُس کو کمال نہیں **سعدی** اخلاقی اور عشقیہ شاعری کے پیغمبر ہیں، لیکن رزم میں پھیکے ہیں، چنانچہ سکندر نامہ کی طرز پر شاطر اصفہانی کی جو حکایت بوستاں میں لکھی ہے۔ اگرچہ اس میں اپنا پورا زور صرف

کر دیا ہے لیکن وہ بوڑھا پن نہیں جاتا، ایک مصرع نہایت زور شور کا ہے دوسرے میں دفعتہً پست ہو جاتے ہیں۔ خیام صرف فلسفہ لکھ سکتا ہے۔ حافظ صرف غزل لکھ سکتے ہیں۔ بخلاف اس کے نظامی نے رزم، بزم، فلسفہ، عشق، اخلاق، سب کچھ لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے۔ لاجواب لکھا ہے، البتہ مدح ان سے نہیں بن پڑتی لیکن مدح کوئی شاعری نہیں۔ شاعر بھاٹ نہ ہو تو اس کی شاعری میں کیا نقص ہے۔

نظامی کی انواع شاعری پر الگ الگ بحث آگے آتی ہے۔

اولیات نظامی بہت سی باتوں کے موجد ہیں۔

مثلاً سب سے پہلے انہی نے پانچ مختلف بحروں میں مثنویاں لکھیں جس کی تقلید اُس وقت سے آج تک تمام بڑے بڑے شعراء کرتے آئے ہیں۔ چنانچہ ان کے خمسہ پر تمام اکابر شعرا نے خمسہ لکھا ہے۔

مخزن اسرار اور ہفت پیکر کی بحر کو اول انہی نے مثنوی میں داخل کیا۔

سب سے پہلے انہی نے ایک مثنوی (مخزن اسرار) میں پانچ نعتیں لکھیں، اور ہر ایک کا جدا رنگ ہے۔

سب سے پہلے انہی نے فلسفیانہ مباحث کو نظم کیا۔

سب سے پہلے انہی نے ساقی نامہ کا خاکہ قائم کیا۔

سب سے پہلے انہی نے قصیدہ کو مدح سے پاک کیا۔

زورِ کلام نظامی سے پہلے شعراء کا کلام، صفائی، سادگی، شستگی، تک محدود رہا تھا۔ اور انہی چیزوں کے کمال سے شاعری کے کمال کا اندازہ کیا جاتا تھا۔ نظامی پہلے شخص ہیں جس نے ترکیبوں میں چستی اور کلام میں زور، بلندی، اور شان و شوکت پیدا کی عرفی اور ابوالفضل کی نظم و نثر کا زور مشہور ہے۔ مگر دونو پر نظامی ہی کا اثر ہے۔ یہاں تک کہ ظغرا نے کہہ دیا کہ ابوالفضل نے سکندر نامہ ہی کو لے کر نثر کر دیا ہے۔

فردوسی کے زمانہ تک روزمرہ اور بول چال کی زبان خالص فارسی تھی، چنانچہ مثنویوں کی زبان وہی رہی، البتہ قصائد میں جس سے لفاظی اور علمی قابلیت کا اظہار بھی مقصود ہوتا تھا۔ عربی الفاظ اور ترکیبیں کثرت سے شامل ہو جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ علوم عربیت کے گھر گھر پھیل جانے سے روزمرہ کی زبان بھی وہی مخلوط العربیتہ فارسی ہو گئی اب عربی الفاظ

کا جدا کرنا، فارسی زبان کا بدمزہ اور بے اثر کر دینا تھا، اس لئے **نظامی** نے اس باب میں **فردوسی** کی تقلید نہیں کی، بلکہ اسی زبان کو لیا جو ملک اور قوم کی عام زبان تھی، لیکن ان کی نکتہ سنجی یہ ہے کہ عربی اور فارسی کے جو لفظ ان کے ہاں آتے ہیں، وہ ہوتے ہیں کہ اس کا ہم معنی کوئی لفظ اس انداز اور شان و شوکت کا تمام زبان میں نہیں مل سکتا، یہی بات ہے کہ اُن کے کسی مضمون کو، جب کوئی شاعر اپنے لفظوں میں ادا کرنا چاہتا ہے۔ تو وہ شان قائم نہیں رہتی، مثلاً اُن کا یہ شعر کمند کی تعریف میں ہے۔

کمند، اژدہائے مسلسل شکنج	دہن باز کردہ بہ تاراج گنج

سعدی اسی مضمون کو لے کر یوں تصرف کرتے ہیں۔

بہ صید ہزبران پرخاش ساز	کمند، اژدہائے دہن کردہ باز

دونو کے مضمون اور معنی میں جو فرق ہے۔ اُس سے یہاں بحث نہیں لیکن الفاظ کی ساخت اور ترکیب پر غور کرو۔ کس قدر فرق ہے مسلسل، شکنج، تاراج، گنج، یہ الفاظ اور اُن کی پُر زور ترکیب، سعدی کے ہاں کہاں ہے۔

فردوسی، سعدی، اور نظامی کے ہاں جو مضامین مشترک ہیں۔ اُن کا باہم موازنہ کرو، بلاغت سے قطع نظر، الفاظ کی شکوہ و شان اور ترکیبوں کی چستی اور نظم و نسق میں نظامی کا کلام، علانیہ ممتاز نظر آئے گا، نمونہ کے لئے ہم صرف دو ایک مثالیں درج کرتے ہیں۔

فردوسی خدا کی ذات اور عالم غیر عنصری کے ادراک کی حد سے خارج ہونے کو اس طرح ادا کرتا ہے۔

نیابد بدو نیز اندیشہ راہ	کہ او برتر از نام و از جایگاہ
سخن ہر چہ زیں گوہراں بگذرد	نیابد بدو راہ جان و خرد
ازیں پردہ برتر سخن گاہ نیست	بہ ہستیش اندیشہ را راہ نیست

نظامی اسی مضمون کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔

اساسے کہ در آسماں و زمے است	بہ اندازہ فکرت آدمی است
شود فکرت اندازہ را رہنموں	سر از حد اندازہ نارد بروں
بہر پایہ دست چنداں رسد	کہ آں پایہ را حد بہ پایاں رسد
چو پایاں پذیرد حد کائنات	نماند در اندیشہ دیگر جہات

نبیند لیشد اندیشہ افزوں ازیں	کہ ہستی نہ، بلکہ بیروں ازیں

اسی مضمون کے قریب قریب یہ اشعار ہیں۔

چناں بر کشیدی و بستی نگار	کہ بہ زاں نیارد خرد در شمار
چناں بستی ایں طاق نیلوفری	کہ اندیشہ را نیست زو برتری
چناں آفریدی زمین و زماں	ہماں گردش انجم و آسماں
کہ چنداں کہ اندیشہ گردد بلند	سرِ خود بروں ناورد زیں کمند

شاید تم کو خیال ہو کہ فردوسی کے بہت سے الفاظ، اب نامانوس ہیں نظامی اُن کے بجائے متداول الفاظ لاتے ہیں۔ اس کے سوا، نظامی کو یہ موقع حاصل ہے۔ کہ جہاں فارسی الفاظ سے شان و شکوہ نہ پیدا ہو سکے، وہاں عربی الفاظ سے کام لیں، فردوسی اپنے التزام کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتا، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، نظامی جہاں خود فردوسی کی بولی بولتے ہیں۔ وہاں بھی یہ فرق قائم رہتا ہے۔ عناصر کی ابتدا اور ان کی ترکیب کو دونوں نے لکھا ہے۔ اور خالص سادہ فارسی میں لکھا ہے۔ **فردوسی**

از آغاز باید کہ دانی درست	سرمایۂ گوہراں از نخست
یکے آتشے بر شدہ تابناک	میان باد و آب از بر تیرہ خاک
نخستیں کہ آتش ز جنبش دمید	ز گرمیش پس خشکی آمد پدید
وزاں پس ز آرام سردی نمود	ز سردی ہماں باز تری فزود
چو ایں چار گوہر بجائے آمدند	ز بہر سپنجی سرائے آمدند
گہر با یک اندر دگر ساختہ	ز ہر گونہ گردن برافراختہ

یعنی عناصر (گوہر) کی ابتدا یوں ہوئی کہ پہلے آگ بلندی پر پیدا ہوئی، اسکے پیچھے ہوا۔ پھر پانی، پھر خاک، آگ حرکت سے پیدا ہوئی، اسکی حرارت کی وجہ سے یبوست پیدا ہوئی پھر سکون کی وجہ سے برودت کا وجود ہوا، برودت نے رطوبت پیدا کی، یہ عناصر، باہم ترکیب پاکر عالم بنا۔ **نظامی**

ز گشت سپہر آتش آمد پدید	کہ آتش بہ نیروی گرمش دمید
ز نیروے آتش ہوائے کشاد	کہ مانند او گرم دارد نہاد
بہ بادے گرایندہ شد گوہرش	کہ گردندگی دور بود از برش

چکید از ہوا ترّے در مغاک	پدید آمد آبے چناں نغز و پاک
چو ہر چار گوہر بہ امر خدائے	گرفتند بر مرکزِ خویش جائے
مزاج ہمہ در ہم آمیختند	وزور ستیزنہا برانگیختند

ان اشعار میں امر، مرکز، مزاج، کے سوا، باقی تمام الفاظ فارسی ہیں، لیکن فردوسی کے الفاظ، اور ترکیب الفاظ میں وہ بلندی اور شان نہیں، جو نظامی کے ہاں ہے، گشت سپہر، نیرو نہاد، گرانیدہ، گردندگی، مغاک، نغز، ان الفاظ اور ان کی حسن ترکیب نے جو بات پیدا کی، مذاق صحیح اس کا اندازہ کر سکتا ہے۔

اسی مضمون کو ایک اور جگہ لکھا ہے۔

نخستیں طلسمے کہ پرداختند	زمیں بود و ترکیب ازو ساختند
چو نیروے جنبش در و کرد کار	بافسردگی زود آمد نجار
از و ہر چہ رخشندہ و پاک بود	سزاوار اجرام افلاک بود
وگر بخشہا کاں بلندی نداشت	بہر مرکزے مایۂ مے گزاشت
یکے بخش ازو آتش روشن است	کہ بالاتریں طاق ایں گلشن است
دگر بخش ازو باد جنبندہ خواست	کہ نا او نہ جنبد نداند کجاست
سوم بخش ازو، آب راوق پذیر	کہ ہستش زراوق گری ناگزیر

ان اشعار میں اکثر فلسفیانہ اصطلاحات کو عربی کے بجائے فارسی میں ادا کیا ہے، مثلاً

عربی	فارسی	عربی	فارسی
قوت حرکتہ	نیروے جنبش	فسر	افسردگی
نوع	بخش	مادہ	مایہ
متحرک بالطبع	جنبندہ خو	سیّال	راوق پذیر

نظامی کے اشعار کا سعدی سے مقابلہ کرو، تو یہ فرق اور واضح ہو جاتا ہے، مثلاً نظامی انقلابات زمانہ اور واقعات عالم کی عبرت انگیزی کو اس طرح ادا کرتے ہیں۔

فلک بر بلندی، زمیں بر مغاک	یکے طشت خوں، شد یکے طشت خاک
نوشتہ بریں ہر دو آلودہ طشت	زخون سیاوش بسے سرنوشت

سعدی اسی مضمون کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

زدم تیشہ یک روز بر تل خاک	بگوشش آمدم نالۂ دردناک
کہ زنہار اگر مردے آہستہ تر	کہ چشم و بنا گوش و روئے است و سر
جوانی شد و زندگانی نماند	جہاں گو مماں چوں جوانی نماند

عہدِ شباب کی حسرت کو دونوں نے لکھا ہے۔ نظامی کہتے ہیں۔

چو باد خزانی درافتد بہ باغ	زمانہ دہد جائے بلبل بہ زاغ
بود برگ ریزاں چو شاخ بلند	دل باغباں زاں شود دردمند
بنال اے کہن، بلبل سالخورد	کہ رخسارۂ سرخ گل گشت زرد
دو تا شد سہی سرو آراستہ	کہ بود رستہ از باغ برخاستہ
فرو ماند دستم ز مے خواستن	گراں گشت پایم ز برخاستن
تنم گونۂ لاجوردی گرفت	گلم سرخی انداخت زردی گرفت
ہیون روندہ زرہ ماند باز	بہ بالین گہ آمد سرم را نیاز

سعدی لکھتے ہیں۔

چو باد صبا بر گلستاں وزد	چمیدن درخت جواں را سزد
نہ زیبد مرا با جواناں چمید	کہ بر عارضم صبح پیری دمید
شمار است نوبت بریں خواں نشست	کہ ما از تنعم بشستیم دست
گل سرخ رویم، نگر زر ناب	فرو رفت چوں زرد شد آفتاب
گلستان ما را طراوت گزشت	کہ گلدستہ بندد چو پژمردہ گشت

قوتِ تخئیل شاعری کے تمام نازک اور مشکل مقامات میں ان کی جدت اور اختراع کی عجیب و غریب صناعیاں نظر آتی ہیں۔ قصہ کے خاکے کھینچتے ہیں، ترتیب واقعات میں تمہید میں، واقعہ نگاری میں، بندش مضامین میں تشبیہات میں، استعارات میں، مبالغوں میں ہر جگہ نیا انداز نظر آتا ہے۔ اور ثابت ہوتا ہے کہ اُن کی قوتِ تخئیل (امیجنیشن) کس قدر قوی اور زبردست ہے۔

بادشاہ کی مدح لکھتے ہیں۔ اور یہ تمہید اٹھاتے ہیں۔

علم برکش اے آفتاب بلند	خراماں شو اے ابر مشکیں پرند
بنال اے دل رعد چوں کوس شاہ	بخند اے لب برق چوں صبحگاہ

بیار اے ہوا، قطرۂ ناب را بر آرا اے دُر از قعر دریائے خویش		بگیر اے صدف دُر کن آں آب را بہ تاج سرِ شاہ کن جائے خویش	

قدیم خیال یہ تھا کہ آفتاب کی گرمی سے بخارات پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے بادل پیدا ہوتے ہیں۔ بادل برستا ہے۔ تو سیپ کے منہ میں جو قطرے پڑتے ہیں۔ موتی بن جاتے ہیں ان خیالات کی بنا پر **نظامی** کہتے ہیں۔

او آفتاب، عَلَم اُٹھا۔ او سیاہ پوش بادل، آہستہ آہستہ چل،
اور عد! نقارۂ شاہی کی طرح کڑک، او بجلی صبح کی طرح ہنس،
او ہوا، قطرے برسا، او سیپ قطرہ کو لے کر موتی بنا، اور موتی، دریا کی تہ سے نکل، اور نکل کر بادشاہ کے تاج پر جگہ لے۔

بات اتنی تھی کہ بادشاہ کا تاج جواہر نگار ہے۔ لیکن شاعر کو قوتِ تخییل کے ذریعہ سے یہی بات اس صورت میں نظر آتی ہے۔ کہ عالم کا تمام کاروبار صرف بادشاہ کی اوج و شان، بڑھانے کے لئے ہے۔ اسکی قوتِ خیالہ اس سے بھی آگے بڑھتی ہے۔ ممدوح کے بل پر اس کو تمام عالم اپنا محکوم نظر آتا ہے۔ اور وہ تحکمانہ انداز سے، آفتاب، بادل، رعد، برق، اور ہوا کو حکم دیتا ہے۔ کہ اپنے اپنے کام انجام دے کر موتی تیار کرو، تاکہ بادشاہ کے تاج پر ٹانکے جائیں۔ اس کے ساتھ انداز بیان کے زور، الفاظ کی شوکت، بندش کی درو بست کو دیکھو کہ طلسم کا عالم نظر آتا ہے۔ پھر خیال کرو کہ ایک ایک مختلف حالت کو کس طرح صرف ایک ایک مصرع میں کھپا دیا ہے۔

مثال (۲) سکندر نامہ میں متعدد جگہ آفتاب کے غروب اور طلوع کو، بیانِ واقعہ کی حیثیت سے لکھا ہے، لیکن ہر جگہ ایک نیا پیرایہ قائم کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں۔

چو یاقوتِ خورشید را دزد بُرد بہ دزدی گرفتند مہتاب را		بہ یاقوت جستن جہاں پے فشرد کہ ایں بُرد آں گوہر ناب را	

یعنی جب آفتاب کا یاقوت، چوری گیا تو زمانہ نے یاقوت کے ڈھونڈھنے کے لئے دوڑ دھوپ شروع کی، آخر چاند کو جا کر پکڑا کہ اس نے یہ جوہر چرایا ہے، چونکہ آفتاب کے غروب کے بعد چاند نکلتا ہے۔ اس لئے اس کو چور قرار دیا۔

کہ چوں آتش روز روشن گزشت		پُر از دُود شد گنبد تیز گشت	

شب از ماہ بربست پیرایۂ	شگفتے بود نور در سایۂ

یعنی جب دن کی آگ بجھ گئی تو دھواں اٹھا۔ (یعنی رات) اور گنبد (آسمان) میں بھر گیا۔ رات نے چاند کا زیور پہنا، لوگوں کو اس پر حیرت ہوئی کہ سایہ میں نور نظر آتا ہے۔

دگر روز کیں ساقیٔ صبح خیز	زمی گرد بر خاک، یاقوت ریز
چو خورشید بزد سر از گنج نیل	(یعنی دھوپ) فرو شست گردوں، قبار از نیل
چو در برقع کوہ رفت آفتاب	سر روز روشن، فرو شد بخواب
شب تیرہ چوں اژدہائے سیاہ	زماہی برآورد سر سوئے ماہ
سیہ کرد بر شبروان راہ را	فرو برد چوں اژدہا ماہ را
سپاہ سحر چوں علم بر کشید	جہاں، حرف شب را قلم در کشید
چو سلطان شب، چتر بر سر گرفت	سواد جہاں راہ عنبر گرفت
ستارہ چناں گنجے از زر فشاند	کہ مہد زمین گاؤ، بر گنج راند
کہ چوں شاہ چین صبح را بار داد	عروس عدن (رات)، دُر (ستارہ)، بہ دینار (آفتاب) داد
چو شب در سر آورد کحلے پرند	سرمہ در آمد بہ مشکیں کمند

استعارات اور تشبیہات

نظامی کی خصوصیات شاعری میں نہایت نمایاں خصوصیت استعارات اور تشبیہات کی جدت ہے۔ استعارہ اور تشبیہ اگر صرف حسن کلام اور تفنن طبع کے کام آئے تو وہ کوئی بڑی چیز نہیں، لیکن بعض استعارے یا تشبیہات ایسے ہوتے ہیں۔ جن کا اثر اصل مضمون پر پڑتا ہے، یعنی مضمون کا زور بڑھ جاتا ہے، جو بات صفحوں میں ادا ہو سکتی ہے۔ ایک لفظ سے ادا ہو جاتی ہے۔ صورت واقعہ کی تصویر اس طرح سامنے آجاتی ہے، کہ کسی اور طرح سے نہیں آسکتی تھی، اس قسم کے استعارات اور تشبیہیں اور شعرا کے ہاں بہت کم پائی جاتی ہیں، لیکن **نظامی** کا کلام ان سے بھرا پڑا ہے، مثلاً دارا جب زخم کھا کر گرا ہے۔ اس موقع پر اس واقعہ کو یوں ادا کرتے ہیں،

نسب نامۂ دولت کیقباد	ورق بر ورق ہر سوئے برد باد

دارا سلسلۂ کیانی کا آخری فرمانروا تھا۔ اور اس کے مرنے سے گویا اس عظیم الشان خاندان کی تاریخ مٹ گئی، اس مضمون کو تشبیہ نے کس قدر مؤثر اور بلند کر دیا، دارا کو خاندان کیانی کا نسب نامہ کہا، یعنی جس طرح نسب نامہ میں تمام خاندان کے نام درج

ہوتے ہیں۔ دارا کا وجود گویا تمام خاندان کا وجود ہے۔ اور اس کے دیکھنے سے کیقباد، کیخسرو، کیکاؤس، سب کی مجموعی عظمت و شوکت آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ پھر اس کے مرنے کو یوں بیان کیا ہے کہ نسب نامۂ کیانی کا ایک ایک ورق اڑ گیا، اسی مضمون کو ایک اور تشبیہ کے ذریعہ سے ادا کیا ہے۔

بہار فریدوں و گلزار جم	ز باد خزاں گشت تاراج غم

سکندر نے جب دارا کی سسکتی لاش کو اپنے زانو پر رکھ لیا ہے۔ اس موقع پر کہتے ہیں۔

شہِ خستہ را بر سر ران نہاد	شب تیرہ بر روز رخشاں نہاد

سکندر نے جب دارا کو گستاخانہ جواب لکھا ہے۔ تو دارا کہتا ہے۔

ازاں ابر عاصی چناں ریزم آب	کہ نارد دگر دست بر آفتاب
اس سرکش بادل کو اسطرح نچوڑ دوں گا	کہ پھر آفتاب پر ہاتھ نہ بڑھا سکے

سکندر نے جب ایک حبشی سردار پر حملہ کیا ہے تو حملہ کی تیزی اور زور کو اسطرح ادا کرتے ہیں۔

بہ کبک دری چوں درآید عقاب	چگونہ جہد بر زمیں آفتاب
ازاں تیز تر خسرو پیلتن	بہ تندی درآمد بہ آں اہرمن

آفتاب سورج کو بھی کہتے ہیں اور دھوپ کو بھی، اس موقع پر بلاغت کے انداز کو دیکھو، تشبیہ سے ابتدا نہیں کی، بلکہ مخاطب سے کہتے ہیں۔ کہ تم کو خیال ہے۔ عقاب چکور پر کیونکر گرتا ہے۔ دھوپ کس طرح زمین پر دفعۃً چھا جاتی ہے! اس سے مقصد یہ ہو کہ پہلے مخاطب کے ذہن میں اچھی طرح یہ سماں قائم ہو جائے، پھر کہتے ہیں "اس سے بھی زیادہ تیزی اور زور کے ساتھ سکندر نے اس دیو پر حملہ کیا" حملہ کی خاص حالت سے قطع نظر کر کے سکندر کو آفتاب اور حریف کو زمین سے تشبیہ دینا، یوں بھی موزوں تھا، تشبیہ مرکب نے اس لطف کو اور دو بالا کر دیا۔

سکندر نے جب ایک روسی پہلوان پر کمند پھینکی ہے۔ اس موقع پر کہتے ہیں۔

کمند عدو بند را شہریار	بینداخت چوں چنبر روزگار

کنایہ یہ تھا کہ سکندر نے اس طرح کمند پھینکی کہ حریف کسی طرح اس سے بچ نہیں سکتا تھا، اس مضمون کو چنبر روزگار کی تشبیہ نے کس قدر پُر زور کر دیا،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب خسرو پرویز کو خط لکھا ہے۔ تو خط میں عرب کی رسم کے مطابق اپنا نام خسرو کے نام سے پہلے لکھا تھا، خسرو نے خط کھولا تو چونکہ ایران میں بادشاہ کا نام عموماً تمام تحریروں میں پیشانی پر لکھا جاتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سرنامہ پر دیکھ کر خسرو سخت جھلا اٹھا، اور خط کو پرزے پرزے کرکے پھینک دیا، اس موقع کو نظامی نے شیریں خسرو میں جہاں لکھا ہے، خسرو کی جھلاہٹ اور برہمی کو اسطرح تشبیہ کے ذریعہ سے ادا کرتے ہیں۔

چو عنوان گاہ عالم تاب را دید	تو گفتی سگ گزیدہ آب را دید

دیوانہ کتا جب کسی کو کاٹ کھاتا ہے۔ تو سگ گزیدہ پانی کو دیکھ کر بڑے زور سے جھجکتا ہے۔

اب تشبیہ کے تمام اجزا پہ خیال کرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط آب شیریں ہے۔ خسرو نے چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خط سے بے ادبی کی ہے اس لئے شاعر اس کو سگ نجس سمجھتا ہے۔ فوری اور شدت کی جھلاہٹ، سگ گزیدہ کی اس مخصوص حالت سے بڑھکر نہیں ہوسکتی۔ ان سب باتوں کو پیش نظر رکھو تو نظر آئے گا کہ یہ مضمون جس طرح اس تشبیہ سے ادا ہو سکتا تھا۔ اور کسی طرح ادا نہیں ہو سکتا تھا۔

قدماء اور متاخرین کی خصوصیات جدا جدا ہیں۔ اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ گو قدماء کی متانت، پختگی، جزالت، کے مقابلہ میں متاخرین کا کلام سبک معلوم ہوتا ہے تاہم متاخرین کی بعض بعض خصوصیتیں اس قابل ہیں کہ اُن پر رشک کیا جائے، ان میں ایک تشبیہات کی لطافت اور استعارات کی نزاکت ہے۔ قدماء آس پاس کی چیزوں سے سادہ سادہ تشبیہیں پیدا کرتے تھے، استعارے بھی سادے اور سہل الماخذ ہوتے تھے۔ لیکن متاخرین کے زمانہ میں تمدن بہت ترقی کر گیا تھا، اس لئے انسانی احساسات نازک اور لطیف ہو گئے تھے۔ اس بنا پر اب قدماء کی تشبیہیں بے مزہ ہو گئی تھیں اس کو مادیات کے ذریعہ سے یوں سمجھو کہ جب کسی قوم کا تمدن، ابتدائی حالت میں ہوتا ہے۔ تو وہ نہایت تیز اور کرخت خوشبو کو پسند کرتی ہے۔ اور کم درجہ کی خوشبو کو اسکا دماغ اچھی طرح محسوس نہیں کر سکتا، یہی سبب ہے کہ عرب مشک اور عنبر، اور ہندو تلسی اور نازبو کی خوشبو پسند کرتے تھے، لیکن آج چونکہ ہر چیز میں لطافت پیدا ہو گئی ہے، مشک اور تلسی کی خوشبو

سے بعض وقت دماغ پراگندہ ہو جاتا ہے۔ اب گلاب اور کیوڑہ کا عطر درکار ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر انگریزی عطر، محبوب ہے، جو اس قدر لطیف ہوتا ہے کہ عام آدمیوں کو اسکی خوشبو محسوس بھی نہیں ہوتی۔ **استعارہ** اور تشبیہ کا بھی یہی حال ہے استعارہ اور تشبیہ کی یہ لطافت، متاخرین کا خاصہ ہے۔ مثلاً قدما معشوق کے چہرہ کو آفتاب سے اور اس کی ہنسی کو خندۂ صبح سے تشبیہ دیتے تھے، لیکن متاخرین کے مذاق میں ایک شاعر کہتا ہے۔ ع

صبح زخورشید رخت خندہ

یعنی معشوق کا چہرہ ہنسا تو صبح پیدا ہو گئی، یعنی صبح خود معشوق کی ہنسی کا نام ہے۔

استعارہ اور **تشبیہ** کی اس لطافت اور نزاکت کے موجد **نظامی** ہیں۔ انہوں نے اس کثرت سے نازک اور لطیف استعارے اور تشبیہیں پیدا کیں کہ متاخرین میں سے بھی کسی ایک شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

بہ باغ شعلہ در، دہقاں انگشت	بنفشہ مے درود لالہ مے کشت

کہنا یہ تھا کہ انگیٹھی میں آگ جلائی تو دھواں کم ہو جاتا تھا۔ اور آگ بھڑکتی جاتی تھی، اسکو اسطرح ادا کیا کہ انگیٹھی کا دہقان، شعلوں کے باغ میں بنفشہ کاٹتا جاتا تھا۔ اور لالہ بوتا جاتا تھا۔

درآمد نقشبند مانوی دست	زمیں را نقشہ ہائے بوسہ مے بست

کہنا یہ تھا کہ مصور جب دربار میں آیا، تو آداب دربار کے موافق زمیں بوس کرتا آتا تھا اس کو اس طرح پر ادا کیا، کہ مصور بوسوں سے نقش و نگار کرتا آتا تھا۔

بہ نوشیں لب، آں جام زنوش کرد	زلب جام را حلقہ در گوش کرد

پیالہ پینے کے وقت لب، کی جو ہیئت پیدا ہوتی ہے۔ اُس کو حلقہ سے تشبیہ دی ہے۔ اور اس بنا پر پیالہ کو لب کا حلقہ بگوش قرار دیا ہے۔

ہوا بر سبزہ ہا گوہر گسستہ	زمرد را بہ مروارید بستہ

شبنم کو موتی سے، اور سبزہ کو زمرد سے تشبیہ دی ہے۔ اس بنا پر کہتا ہے کہ ہوا نے سبزہ پر جو موتی بکھیر دیئے تھے، تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ زمرد میں موتی ٹانک دیئے ہیں۔

زگیسو گہ کمر مے کرد و گہ تاج	بداں تاج و کمر شہ گشتہ محتاج

معشوقہ جو زلفوں کا کبھی جوڑا باندھتی تھی اور کبھی کمر پر چھوڑ دیتی تھی، اسکو تاج و کمر سے تشبیہ دی ہے۔

قلم کی تعریف، ع۔ مشک در جیب لعل در دامان۔

عاشق و معشوق کا ہمکنار ہونا،

شبا روزے دگر خفتند مدہوش	بنفشہ در سر و نسرین در آغوش

نوشابہ کا جواب دینا،

بہ پاسخ نمودن زن ہوشمند	زیاقوت سربستہ بکشاد بند
ازاں سیمگوں سکۂ نوبہار	درم ریز کن برلب جوئبار

آغاز بہار میں جو شگوفے کھلتے ہیں۔ اُن کو، بہار کا سکہ قرار دیا ہے۔

زباریدن ابر کافور بار	سمن رستہ از دستہائے چنار

یعنی چنار کے پتوں پر جو برف گرتی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ چنار کے ہاتھوں پر چنبیلی کے پھول کھلے ہیں۔

سمنبر غافل از نظارۂ شاہ	کہ سنبل بستہ بد بر نرگسش راہ

یہ اس وقت کا بیان ہے کہ **شیریں** نہا رہی تھی۔ اور زلفوں کو چہرہ پر چھوڑ دیا تھا، شعر کا مطلب یہ ہے۔ کہ شیریں کو خسرو کے نظارے کی خبر نہ تھی، کیونکہ سنبل نے نرگس کا راستہ روک رکھا تھا۔

کشادہ طاق ابرو تا سر دوش	کشیدہ طوق غبغب تا بنا گوش
خواب نرگس، خمار دیدۂ او	ناز نسریں، درم خریدۂ او
چو بر فرق آب مے انداخت از دست	فلک بر ماہ مروارید مے بست
سمن ساقی و نرگس جام بر دست	بنفشہ در خمار و سرخ گل مست
بنفشہ تاب زلف افگندہ بر دوش	کشادہ باد نسریں را بنا گوش
گونہ گونہ گلے شگفتہ درو	سبزہ بیدار آب خفتہ درو

بعض اوقات تشبیہ سے ہیبت اور عظمت مقصود ہوتی ہے اس قسم کی تشبیہات آج تک کسی نے **نظامی** سے بڑھکر بلکہ ان کے برابر بھی نہیں پیدا کیں، مثلاً

کمند اژدہائے مسلسل شکنج	دہن باز کردہ بہ تاراج گنج
زمیں کوب سلطے بُد آراستہ	غبارے شُد، از جائے برخاستہ
دراں دجلۂ خوں، بلند آفتاب	چو نیلوفر، افگندہ زورق در آب

ز شمشیر برگشتہ جائے نبود　　　کہ در غار وے اژدہائے نبود

زخم کو غار، اور تلوار کو، اژدہا سے تشبیہ دی ہے۔

اے مدنی برقع و مکی نقاب　　　سایہ نشین چند بود آفتاب
تاج تو و تخت تو دارد جہاں　　　تخت زمیں آمد و تاج آسماں
زبس خوں کہ گرد آمد اندر مغاک　　　جو گو گرد سرخ آتشیں گشت خاک
نہنگ خدنگ، از کمین کماں　　　نیاسود بر یک زمیں، یک زماں

شاعری کی لطافت اور رنگینی کا ایک بڑا راز یہ ہے۔ کہ بے جان چیزوں کو صاحب ادراک قرار دے کر ان کی نسبت ارادی کام منسوب کئے جائیں مثلاً عرفی کہتا ہے۔

نہ گفت و من بشنودم ہر انچہ گفتنی داشت　　　کہ در بیاں نگہش کرد بر زباں تقدیم
لبش، چو نوبت خویش از نگاہ باز گرفت　　　فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم

یعنی اُس نے کچھ نہیں کہا، لیکن میں نے سن لیا، کیونکہ تقریر کرنے میں، اسکی نگاہوں نے زبان سے پیش دستی کی، جب ہونٹوں نے نگاہ سے اپنی باری مانگی تو سامعہ کوثر کی موجوں میں ڈوب گیا، یا مثلاً

رضیم از نگہ شوق کہ گوید ہمہ باز　　　از زباں آنچہ دم عرض تمنا ماند

متاخرین نے اس طرز کو نہائت وسعت دی، اور اس سے نہائت لطیف اور رنگین نئے نئے اسلوب پیدا کئے، لیکن اس طرز کے موجد **نظامی** ہیں شیریں **خسرو** میں لکھتے ہیں۔

نہاں باشاہ مے گفت آں بنا گوش　　　کہ مولائے توام با حلقہ در گوش
چو سر پیچید، گیسو مجلس آراست　　　چو رُخ گردید گردن عذرہا خواست
بگویم **غمزہ** را تا وقت شب گیر　　　سمندش را برقص آرد بیک تیر
بگویم **زلف** را تا یک فن آرد　　　شکیبش را رسن در گردن آرد

نظامی کے یہ مضامین، متاخرین کے شمع راہ بنے، جس کی روشنی میں اُنکو گونا گوں اسالیب کا سلسلہ ہاتھ آگیا۔ نظامی نے جب (پہلے شعر میں) بنا گوش کی نسبت یہ باندھا کہ اسی نے چپکے سے بادشاہ سے کہا، تو بے تکلف ایک شاعر، اسکو یوں ادا کر سکتا ہے۔ ع

زلف او خم شدہ در گوش سخن مے گوید

شعر کے سینکڑوں انواع ہیں۔ لیکن بڑی قسمیں یہ ہیں۔ رزمیہ، عشقیہ، فلسفیانہ، اخلاقی جذبات انسانی کا اظہار، اور مناظر کی تصویر، ان میں سے ہر نوع کو **نظامی** نے لیا ہے۔ اور معراج ترقی تک پہنچادیا ہے۔

سکندر نامہ میں انہوں نے لکھا ہے۔ کہ سکندر کے حالات تین حیثیتیں رکھتے ہیں سلطنت، نبوت، فلسفہ وحکمت، میں تین قسم کے حالات لکھونگا، اور تفصیل سے لکھونگا،

گروہیش خوانند صاحب سریر	ولائت ستاں بلکہ آفاق گیر
گروہے ز دیوان دستور او	بہ حکمت نوشتند منشور او
گروہے ز پاکی و دیں پروری	پذیرا شدندش بہ پیغمبری
من از ہر سہ دانہ، کہ دانا فشاند	درختے بر ومند خواہم نشاند

چنانچہ سکندر نامہ بری میں، کشورستانی، اور سکندر نامہ بحری میں، پیغمبری کے واقعات اور فلسفیانہ بحثیں ہیں۔

فارسی میں فلسفیانہ مسائل ناصر خسرو کے سوا، کسی نے ادا نہیں کئے، لیکن ناصر خسرو نے تمام اصطلاحیں وہی عربی کی قائم رکھی ہیں۔ اس بنا پر عام خیال یہ ہے کہ فارسی میں فلسفیانہ خیالات ادا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے، بوعلی سینا کی کتاب حکمت علائیہ سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ **نظامی** نے فلسفیانہ مسائل اس حد تک لکھ دیئے ہیں کہ زبان کی کم مائگی کی شکائت نہیں ہو سکتی۔ اور اگر متاخرین بھی اس کے نقش قدم پر چلتے۔ تو فارسی زبان ایک فلسفیانہ زبان بن گئی ہوتی۔

سکندر نامہ بحری میں انہوں نے ایک خاص داستان سکندر اور حکمائے یونان کی فلسفیانہ حرکتوں کے متعلق لکھی ہے۔ اس میں ارسطو، فلاطون، والیس، بلنیاس، سقراط، فرفوریوس (یا رفیریس) ہرمس، کے اقوال اور رائیں لکھی ہیں، ہندوستان کے ایک حکیم نے سکندر سے سوالات کئے تھے، سکندر کی زبان سے اُن کے جوابات لکھے ہیں، ان تمام بحثوں میں فلسفہ کی اصطلاحیں فارسی میں ادا کی ہیں۔ عربی الفاظ جا بجا آتے ہیں لیکن اس حد تک کہ زبان نامانوس، اور دساتیر وژند نہ بن جائے۔

ایک ہندو حکیم نے سکندر سے سوال کیا تھا کہ نظر بد کیا چیز ہے؟ اس میں کہاں سے تاثیر پیدا ہوتی ہے؟ عام قاعدہ یہ ہے کہ کسی چیز کو پسند کیا جائے۔ تو اس کی ترقی کا سبب

ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے بدنظر جس چیز کو پسند کرتا ہے، اسی کو نظر لگتی ہے، سکندر نے جواب دیا کہ انسان جب کسی چیز کو دیکھتا ہے۔ تو آنکھ سے شعاعیں نکل کر اُس چیز پر پڑتی ہیں۔ شعاع ہوا سے گزر کر اُس چیز تک پہنچتی ہے۔ اب ہوا میں اگر سمیّت ہے تو یہ شعاعیں بھی اُس سے آلودہ ہو کر زہریلی ہو جاتی ہیں۔ اور اُس چیز کو جا کر نقصان پہنچاتی ہیں۔

اس سے قطع نظر کرکے کہ سوال و جواب، دونو طفلانہ ہیں، یہ دیکھو کہ نظامی ان باتوں کو کن الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔

دگر بار ہندو درآمد بہ گفت　　گہر کرد با نوکِ الماس جفت
کہ بر چشمِ بد، شاہیے دہ مرا　　ز چشمِ بد، آگاہیے دہ مرا
چہ نیرو است، در جنبشِ چشمِ بد　　کہ نیکوئی خود را کند چشم زد
ہمہ چیز را کازمائش رسید　　چو دیدہ پسندد، فرا کش رسید
جز او را کہ ہر چہ پسند آورد　　سرو گردنش زیر بند آورد
بہر حرفتے چوں کہ دیدم ژرف　　درستی ندیدیم در ہیچ حرف
ہمیں یک کماندار شد از نخست　　بر آماج گاہ تیر او شد درست
بگو تا چہ نیرو دست، نیروئے او
جہاندار گفتا کہ طالع شناس　　چنیں آرد از روئے معنی قیاس
کہ بر ہر چہ گردد نظر جانگیر　　گزر بر ہوائے کند ناگزیر
بر آں چیز کارد نظر تاختن　　کند با ہوا رائے دم ساختن
بنہ چوں در آرد بہ آں رخت گاہ　　ہوا نیز یابد بر آں رخنہ راہ
ہوا گر ہوائے بود سودمند　　در ارکان آں چیز ناید گزند
مزاجِ ہوا گر بود زہرناک　　ببیناند آں چیز را در مغاک
ہوائے بدست آنکہ در چشم زد　　بدارد بہ ہمراہیے چشمِ بد

موجودات کی ابتدا، اور اُن کی ترتیب، افلاک، عناصر، سلسلۂ علل، ان تمام بحثوں کے متعلق، یونانی حکماء کی رائیں نقل کی ہیں۔ اور ان تمام مباحث میں بہت کم عربی کے الفاظ کو دخل دیا ہے۔

اخلاقی شاعری **نظامی** کی شاعری کا بڑا حصہ اخلاق کے متعلق ہے۔ مخزن اسرار کے سوا

جو خاص اسی مضمون پر لکھی ہے، اور مثنویوں میں بھی جابجا اخلاقی ہدایتیں موقع بموقع لکھی ہیں، چنانچہ کسی صاحب ذوق نے خاص اس قسم کے اشعار کو اُن کے کنج کنج سے چن کر یکجا جمع کر دیا ہے۔ اور اخلاق کے ۳۵ عنوان قرار دے کر ایک ایک عنوان کے نیچے تمام مثنویوں کے وہ اشعار نقل کر دیئے ہیں۔ جو اس عنوان سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے اس مجموعہ کا ایک نہایت خوشخط نسخہ عالمگیری کتب خانے کا حیدر آباد میں دیکھا تھا۔

جذباتِ انسانی شاعری کی اس اہم اور لطیف نوع کو نظامی نے جس رتبہ پر پہنچایا، قدما میں فردوسی کے سوا اس کی نظیر نہیں مل سکتی، اور انصاف یہ ہے۔ کہ فردوسی بھی اس خصوصیت میں اُن کی ہمسری نہیں کر سکتا، فردوسی نے جہاں جذبات کا اظہار کیا ہے معمولی اور سادہ حالت کو ادا کیا ہے۔ بخلاف اس کے نظامی نہائت نازک، لطیف، اور دقیق پہلو کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ مثلاً دارا جب زخمی ہو کر گرا ہے۔ تو سکندر اُس کے پاس گیا ہے اور دارا نے اُس سے حسرت ناک باتیں کی ہیں۔ فردوسی نے اس موقع پر وہی معمولی افسوس اور عبرت کے کلمات ادا کر دیئے ہیں، جو ہر شخص کے خیال میں آ سکتے ہیں۔ لیکن نظامی کی نظر ان نازک اور دقیق نکتوں تک پہنچی ہے۔ جہاں ہر شخص کا وہم رسائی نہیں پا سکتا۔ دارا کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ بلکہ دنیا کے وسیع خطہ کا شاہ اور شاہنشاہ تھا شکست کھانے اور خود اپنے نوکروں کے ہاتھ سے زخمی ہو کر مرنے کا اس کو صدمہ ہے۔ اور اس وجہ سے افسوس، حسرت، اور بیکسی کے خیالات اُس کے دل میں ہجوم کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی شاہنشاہانہ ادعا غرور اور تمکنت کا نشہ بھی سر میں ہے، اسلئے اس کے غمزدہ اور عاجزانہ الفاظ بھی صولت اور رعب کے لہجہ میں ادا ہوتے ہیں۔ اُس کی آہیں بھی نعرۂ جنگ ہیں، اُس کی پُر حسرت نگاہیں بھی برق غضب ہیں۔ نظامی ان تمام خصوصیات کو دکھاتے ہیں۔

چو در موکب قلب دارا رسید	زموکب رواں ہیچ کس را ندید
تن مرزباں دید در خاک و خوں	کلاہِ کیانی شدہ سرنگوں
بہ بازوئے بہمن بر آسودہ مار	ز روئیں دژ افتادہ اسفندیار
بہار فریدوں و گلزار جم	زبادِ خزاں گشتہ تاراج غم
نسب نامۂ دولت کیقباد	ورق بر ورق ہر سوئے بردہ باد

سکندر رفرد آمد از پشت بور
در آمد به بالین آں پیل زور

به بالین گه خسته آمد فراز
زوزرع کیانی گره کرد باز

سر خسته را بر سراں نہاد
شب تیره بر روز رخشاں نہاد

چو دارا بر دیش نگه کرد و دید
به سوز جگر آه از دل کشید

چنیں داد **دارا** به خسرو جواب
که بگزار تا سر نهم من به خواب

رہا کن که در من رہائی نماند
چراغ مرا روشنائی نماند

سپہرم بداں گونه پہلو درید
که شد در جگر پہلوم ناپدید

رہا کن که خواب خوشتم مے برد
زمیں آب و چرخ آتشم مے برد

سر سروراں را رہا کن ز دست
تو مشکن که مارا جہاں خود شکست

چو من زیں ولایت کشادم کمر
تو خواه افسر از من ستاں خواه سر

اگر تاج خواہی ربود از سرم
یکے لحظہ بگزار تا بگزرم

مبیں سرد را در سرافگندگی
چناں شاه را در چنیں بندگی

دریں بندم از زحمت آزاد کن
به آمرزش ایزدی یاد کن

چو گشت آفتاب مرا روئی زرد
نقابے بمن در کش از لاجورد

مگر داں سر خفته را از سریر
که گردون گرداں برآرد نفیر

تو اے پہلواں کامدی سوئے من
نگہدار پہلو ز پہلوئے من

که با آں که پہلو دریدم چو میغ
ہمے آید از پہلوم بوئے تیغ

چه دستے که با مادرازی کنی
به تاج کیاں دستبازی کنی

نگہدار دستت که داراست ایں
نه پنہاں چو روز آشکار است ایں

زمیں را منم تاج تارک نشیں
مجنباں مرا تا نه جنبد زمیں

اس واقعہ کو بعینہ **فردوسی** نے بھی لکھا ہے لیکن زور اور اثر نہیں، چنانچہ اس سوقع کے اشعار ہم درج کرتے ہیں۔

بر آنم که از پاک دادار خویش
بیابی تو پاداش گفتار خویش

یکے آنکه گفتی که ایراں تراست
سر تاج و تخت دلیراں تراست

بمن مرگ نزدیک تر زانکه تخت
بپرداخت تخت از نگوں گشته بخت

برین است فرجام چرخ بلند خرامش ہمہ رنج و سرو ش گزند
بمردی نگر تا نگوئی کہ من فرزدنم ازیں نامدار انجمن
بدو نیک، ہر دو ز یزداں شناس وزو دار تا زندہ باشی سپاس
نمو دار گفتار من، من بسم بریں داستاں عبرت ہر کسم
کہ چنداں بزرگی و شاہی و گنج مرا بود و از من نبُد کس برنج
ہماں نیز چنداں سلیح و سپاہ گراں مایہ اسپان و تخت و کلاہ
ہماں نیز فرزند و پیوستگان چہ پیوستگاں داغ دل خستگاں
زمین و زماں بندہ بُد پیش من چنیں بود تا تخت بد خویش من
چو از من ہماں بخت بیگانہ شد ہمہ کاخ و ایواں چو ویرانہ شد
ز نیکی جدا ماندہ ام زیں نشاں گرفتار در دست مردم کشاں
ز فرزند و خویشاں شدہ نا امید سیہ شد جہاں، دیدگانم سفید
ز خویشاں کسے نیست فریاد رس امیدم بپروردگار ست و بس
بدیں گونہ خستہ بخاک اندرم ز گیتی بدام ہلاک اندرم
بریں است، آئین چرخ رواں اگر شہریاری اگر پہلواں
بزرگی بفرجام ہم بگزرد شکار است و مرگش ہمے بشکرد
سکندر ز دیدہ بباریدخوں براں شاہِ خستہ بخاک اندروں
چو دارا بدید از دل درد اوی سر شک رواں بر رُخِ زرد اوی
بدو گفت بگری کزو سود نیست ز آتش مرا بہرہ جز دود نیست

مناظر **مناظر قدرت** کو جابجا لکھا ہے۔ اور جہاں لکھا ہے نیچر کی تصویر کھینچ دی ہے مناظر قدرت میں باغ و بہار ایک عام موضوع ہے جس پر تمام شعراء نے طبع آزمائیاں کی ہیں۔ اور داد سخن دی ہے۔ لیکن نظامی یہاں بھی سب سے علیحدہ اور سب سے ممتاز ہیں، تمام شعراء نے صرف بہار کا سماد کھانے پر اکتفا کیا ہے۔ لیکن **نظامی** نے اس کے ساتھ یہ بھی دکھایا ہے۔ کہ بہار میں ایک رنگین مزاج پر کس طرح نشہ چھا جاتا ہے، وہ باغ میں جاتا ہے، پھولوں سے کھیلتا ہے۔ گلدستے بنا کر درختوں پر اچھالتا ہے، نہر کے کنارے بیٹھ جاتا ہے۔ اور شگوفے توڑ توڑ کر نہر میں بہاتا ہے۔ حوض کے پاس چنبیلی کے

پھولوں کا بچھونا بچھاتا ہے۔ بلبل ہیں معشوق ہے۔ اُس کی زلفوں کے حلقے اپنی گردن میں ڈالتا ہے۔ اور دنیا سے آزاد ہو جاتا ہے۔ مرغانِ چمن سے فرمائش کرتا ہے۔ کہ ہاں پھر اسی انداز سے اڑنا ساتھ ہی ساز بھی چھیڑتا جاتا ہے۔ اور قابو سے باہر ہوا جاتا ہے۔

بیا باغباں خرمی ساز کن	گل آمد در باغ را باز کن
نظامی بہ باغ آمد از شہر بند	بیارائے بستاں بہ چینی پرند
زجعد[1] بنفشہ برانگیز تاب	سر نرگس مست برکش زخواب
زسیمائے سبزہ فرو شوی گرد	کہ روشن بہ شستن شود لاجورد
درختاں شگفتند در طرف باغ	برافروختہ ہر گلے چوں چراغ
بہ مرغ زباں بستہ آواز دہ	کہ پرواز پارینہ را ساز دہ
سرایندہ کن لالۂ چنگ را	برآور بہ رقص ایں دل تنگ را
سر زلف معشوق را طوق ساز	برافگن زگردن خود ایں طوق باز
ریاحین سیراب را دستہ بند	برافشاں بہ بالائے سرو بلند
ازاں سیمگوں سکۂ نو بہار	درم ریز کن بر لب جوئبار
بہ پیراہن برگۂ آب گیر	زسوسن درافگن بساط حریر

عشقیہ ایران کی شاعری کا اصل مایۂ ناز عشقیہ شاعری ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ عشق و عاشقی کے معاملات اور راز و نیاز، جس رنگینی اور دلفریبی سے ایرانی شاعری نے ادا کئے دنیا کی اور کوئی زبان اس انداز سے ادا نہیں کر سکتی، اس قسم کی شاعری کے لئے غزل مخصوص کر دی گئی ہے۔ اور اس کے موجد شیخ سعدی خیال کئے جاتے ہیں۔ نام کے لئے غزل کی بنیاد ان سے بھی بہت پہلے پڑ چکی تھی، لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ قدما کے بوڑھے غمزے ہیں۔

بے شبہ غزل کے موجد سعدی ہیں لیکن غزل کی اصلی روح یعنی عشقیہ شاعری کی ایجاد نظامی کا خاص کارنامہ ہے عشقیہ مثنویاں، نظامی سے پہلے بھی لکھی گئیں جن میں سے فردوسی کی یوسف زلیخا آج بھی موجود ہے، لیکن مثنویاں وہی قدما کی غزلیں ہیں۔ نظامی نے عشقیہ شاعری کی جس طرح بنیاد ڈالی۔ اور اُس کو ترقی دی۔ اُس کی تفصیل

[1] یہ نکتہ بھی لحاظ رکھنا چاہئے کہ نظامی نے ان باتوں کو بجائے خبر کے انشاء کے پیرایہ میں ادا کیا ہے اور یہ زیادہ بلیغ ہے

حسب ذیل ہے۔

(۱) عشق و عاشقی کے خیالات کے ادا کرنے کے لئے ایک خاص زبان درکار ہے جس کے الفاظ نازک، لطیف، اور شیریں ہوں، خاص قسم کے استعارات اور تشبیہیں ہوں۔ ادا میں دلاویزی اور دلفریبی ہو، یہ زبان خاص نظامی نے پیدا کی ہے۔ قدما کی عشقیہ مثنویوں کا نظامی کی کسی مثنوی سے مقابلہ کرو۔ تو یہ فرق صاف نظر آتا ہے۔

غزل کے مہمات مضامین یہ ہیں۔ معشوق کے حسن کی تعریف، ادا اور ناز و غمزہ کے کرشمے، الگ الگ اعضا کا بیان، اور اُن کی تشبیہات، عاشق و معشوق کے معاملات یعنی راز و نیاز، اصرار و انکار، سوال و جواب، عجز و غرور وغیرہ ان تمام مضامین کو **نظامی** نے اس وسعت، تنوع، رنگینی، اور لطافت سے ادا کیا ہے۔ کہ اُن کا ہر ہر شعر سینکڑوں غزلوں کا سرمایہ ہے۔ چند مثالیں ذیل میں درج ہیں۔

شیریں کا غسل کرنا۔

چو قصد چشمہ کرد آں چشمۂ نور	فلک را آب در چشم آمد از دور
پرند آسماں گوں بر میاں زد	بشد در آب و آتش در جہاں زد
تن صافش کہ مے غلطید در آب	چو غلطد قاقمے بر روئے سنجاب
چو بر فرق آب مے انداخت از دست	فلک بر ماہ، مروارید مے بست
ز ہر سو شاخ گیسو، شانہ مے کرد	بنفشہ بر سر گل، دانہ مے کرد
در آب انداختہ از گیسواں شست	نہ ماہی بلکہ ماہ آوردہ در دست

شیریں آراستہ ہو کر **خسرو** کے سامنے آتی ہے۔

پس آنگہ ماہ را پیرایہ ابر بست	نقاب آفتاب از سایہ بر بست
فرو پوشید گلنارے پرندے	برو ہر شاخ گیسو چوں کمندے
سرآغوشے بر آمودہ بگوہر	برسم چینیاں افگندہ بر سر
بدیں طاؤس کردارے ہمائے	رواں شد چوں تذروے در ہوائے

ایک موقع پر جب **خسرو** نے **شیریں** سے زیادہ اختلاط کرنا چاہا ہے۔ تو وہ برہم ہو کر اٹھتی ہے۔ اس حالت میں اُس کا تن کر کھڑا ہونا، پیشانی کا غصہ سے سمٹنا، چہرہ کا کھل جانا بدن ڈھکنے میں حسن کا چمکنا، بالوں کو کبھی سمیٹنا اور کبھی چھوڑ دینا۔ ان تمام اداؤں

کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

بگفت ایں وچو سرو از جائے برخواست
یہ کہ کر سرو کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی

جبیں را گرد کرد و فرق را است
پیشانی سمٹ گئی اور قد تن گیا

بہ آں آئین کہ خوباں را بود دست
اس خاص انداز سے جس میں معشوقوں کو کمال ہوتا ہے

زنخداں مے کشاد و زلف مے بست
چہرہ کھولنے اور بال سمیٹنے لگی

جمال خویش را در خز و خارا
اپنے حسن کو حریر اور کمخواب میں جس قدر

بہ پوشیدن ہمے کرد آشکارا
چھپاتی تھی، اسی قدر اور کھلتا تھا

گہے بر فرق تند آشفتہ مے بود
کبھی زلفوں پر جھلاتی تھی، اس میں

گرہ مے بست و بر مہ مشک مے سود
گھونگر بناتی تھی اور چاند پر مشک ملتی تھی

بہ زیور راست کردن دیر مے شد
زیور کے سنبھالنے میں دیر ہوئی جاتی تھی

کہ پالش بر سر شمشیر مے شد
کیونکہ جلدی کی وجہ سے گویا اس کا قدم تلوار پر تھا

ز گیسو گہ کمر مے کرد گہ تاج
زلفوں کو کبھی کمر سے لپیٹتی تھی اور کبھی سر پر جوڑا باندھتی تھی

بداں تاج و کمر شہ گشتہ محتاج
جو کمر بند اور تاج بنجاتی تھی اور اس کمر بند اور تاج کا خود خسرو بھی محتاج تھا۔

ایک موقع پر شیریں جب روٹھ کر اٹھی تو اس ادا سے اٹھی جس میں لگاوٹ بھی پائی جاتی تھی، اس کی تصویر اس طرح کھینچی ہے۔

بہ چشمے ناز بے اندازہ مے کرد | بہ دیگر چشم عذرے تازہ مے کرد

چو سرو پیچیدہ گیسو مجلس آراست | چو رخ گردید گردن عذرہا خواست

نمود اندر ہزیمت شاہ را پشت | بہ گوگرد سفید آتش ہمے کشت

غلط گفتم نمودش تختۂ عاج | کہ شاہ را نیز باید تخت با تاج

حسابے دیگر آں بودش دراں کوے | کہ پشتم نیز محرابے است چوں روے

دگر وجہ آنکہ گر وجہے شد از دست | ازاں روشن ترم وجہے دگر ہست

چہ خوش نازیست نازے خوبرویاں | ز دیدہ راندہ را وز دیدہ جویاں

بہ چشمے خیرگی کردن کہ برخیز | بہ دیگر چشم دل دادن کہ مگریز

منہ پھیر کر بھاگنے کی توجیہیں کسقدر شاعرانہ ہیں، یعنی اسکو یہ دکھانا تھا کہ جس طرح میرا چہرہ محرابی اور روشن ہے۔ اسی طرح پیٹھ بھی محرابی اور بلوری ہے۔

غزلیہ شاعری کا ایک بڑا میدان معشوق کا ناز و غرور ہے۔ **نظامی** نے داستان کی داستان اس مضمون پر لکھی ہے، جس کا ہر شعر غزل کا کام دے سکتا ہے۔

خسرو نے جب **شیریں** کو شاہی اقتدار کا زور دکھانا چاہا ہے۔ تو وہ کہتی ہے۔

ہنوزت در سر از شاہی غرور است	دریغا کیں غرور از عشق دور است
ابھی تک تیرے سر میں سلطنت کا غرور ہے	لیکن افسوس، عشق کو غرور سے کیا نسبت
دریں گرمی کہ آہ سرد باید	دل آسان است بادل درد باید
اس گرمجوشی میں کہ آہ سرد کی ضرورت ہے	دل آسان ہے لیکن دل میں درد مشکل ہے
ہنوزم ہندواں آتش پرستند	ہنوزم چشم چوں ترکان مستند
ابھی تک ہندو، مجھ کو پوجتے ہیں	ابھی تک میری آنکھیں ترک ہیں
ہنوزم لب پُر آب زندگانی ست	ہنوزم آب در جوئے جوانی ست
ابھی تک میرے ہونٹوں میں آبحیات ہے	ابھی تک میرے چشمہ میں آب شباب ہے
بہ غمزہ گرچہ ترکی دل ستانم	بہ بوسہ دل نوازی نیز دانم
اگرچہ غمزہ کے لحاظ سے میں ترک ہوں	لیکن بوسہ سے میں دلداری بھی کرسکتی ہوں
برو تا بر تو نگشایم بخوں دست	کہ در گردن چنیں خونم بسے ہست
ہٹ جا ایسا نہ ہو کہ میں تیرے اوپر ہاتھ ڈالدوں	ایسے اور بہت سے خون میری گردن پر ہیں

خسرو نے جب شاپور کے ہاتھ شیریں کو بلا بھیجا ہے۔ تو وہ کہتی ہے۔

اگر خسرو نہ کیخسرو بود شاہ	نباید کردنش سر پنجہ با ماہ
بگویم غمزہ را تا وقت شبگیر	سمندش را برقص آرد بیک تیر
فرستم زلف را تا یک فن آرد	شکیبش را رسن در گردن آرد
میں زلف کو بھیج دوں گی کہ چالاکی سے	خسرو کے صبر کو گرفتار کرکے لائے
مزاحی کردم و داد خواست پنداشت	دروغے گفتم و او راست پنداشت
میں نے تو دل لگی کی تھی، تو وہ تقاضا سمجھے	میں نے جھوٹ کہہ دیا تھا وہ سچ سمجھ گئے

خسرو ایک مرتبہ چند ندیموں کے ساتھ مستی کی حالت میں شیریں کے مکان پر گیا۔ شیریں نے اُس کی یہ حالت دیکھکر کوٹھے سے اترنا مناسب نہ سمجھا، خواصوں کو بھیجا کہ شہ نشین میں فرش کرکے وہیں خسرو کو بٹھائیں۔ خسرو کوٹھے پر جانا چاہتا ہے، شیریں منظور

نہیں کرتی، اس موقع کا سماں اور سوال و جواب کا انداز دیکھو۔

رقیبے را بہ نزد خویشتن خواند
ایک خواص کو اپنے پاس بلایا اور کہا
کہ مارا نازنین بر در چرا ماند
کہ مجھ کو نازنین نے باہر کیوں بٹھایا

درون شو گو کہ شاہنشہ غلامی
اندر جا کر کہو کہ ایک شہنشاہ نے نہیں بلکہ
فرستاد است نزدیکت پیامی
ایک غلام نے پیغام بھیجا ہے

کہ مہمانے بہ خدمت مے گراید
کہ ایک مہمان خدمت کیلئے آیا ہے
چہ فرمائی؟ در آید یا نیاید
کیا ارشاد ہے؟ اندر آئے یا نہ آئے

بدیں زاری پیام شاہ میگفت
بادشاہ کا عاجزانہ پیغام شیریں
شکر لب مے شنید و آہ میگفت
سنتی تھی۔ اور افسوس کرتی تھی

کنیزے کارداں را گفت آں ماہ
ایک ہوشیار کنیز سے شیریں نے کہا کہ
بخدمت خیز و بیروں شو سوی شاہ
بادشاہ کے پاس جا

فلاں شش طاق دیبا را بروں بر
مخمل کے تھان لے جا کر
بزن با طاق ایں ایواں برابر
شہ نشین میں بچھا دے

بنہ بر پیش گاہ و شقہ بر بند
اور پردے باندھ کر
پس آنگہ شاہ را گو کاے خداوند
بادشاہ سے کہ

نہ ترکِ ایں سرا ہندوی ایں بام
اس گھر کی ترک (یعنی معشوق) نے نہیں بلکہ
شہنشہ را چنیں داد ست پیغام
ہندو (غلام) نے حضور کو یہ پیغام دیا ہے

اس کے بعد خسرو اور شیریں سے دوبدو گفتگو ہوئی ہے۔ خسرو کہتا ہے کہ تم نے دروازہ کیوں بند کر دیا، شیریں جواب دیتی ہے۔

حدیث آں کہ در بستم روا بود
کہ سرمست آمدن پیشم خطا بود

چو من خلوت نشیں باشم تو مخمور
ز تہمت رائے مردم کے بود دور

تو مے خواہی مگر کز راہِ دستاں
بہ نقلانم خوری چوں نقل مستاں

بدست آری مرا چوں غافلاں مست
چو گل بوئے کنی و اندازی از دست

رہا کن نام شیریں از لب خویش
کہ شیرینی دہانت را کند ریش

تو در عشق من از مالی و جاہے
چہ دیدی جز خداوندی و شاہے

تو ساغرے زدی بادہ ستاں شاد ۔ قلم شاپورے زد تیشہ فرہاد

اس کے مقابلہ میں رندانہ شوخیاں دیکھو، **شیریں** جب کسی طرح راضی نہیں ہوتی تو خسرو اس سے کہتا ہے۔

بہ گستاخی در آمد کے دلارام ۔ گرفتہ چند خواہی بد، بیارام

خسرو نے گستاخانہ کہا کہ اے معشوق یہ بد ہمی کب تک، ذرا نرم ہو،

چو مے خوردی و مے دادی بمن یار ۔ چرا باید کہ من مستم تو ہشیار

تم نے شراب پی اور مجھکو بھی پلائی، لیکن یہ خلاف انصاف ہے کہ میں مست ہو جاؤں اور تم ہوش میں رہو

شمار بوسہ خواہد بود کارم ۔ تو مے دہ بوسہ تا من مے شمارم

میرا کام صرف بوسہ کا گننا ہوگا تم بوسہ دیتی جاؤ میں گنتا جاؤں گا

یعنی یہ کام تمہارا ہی ہے، لیکن میں اس کو تمہاری خاطر سے انجام دے دوں گا

سکندر نے جب **کنیزک چینی** سے اختلاط کرنا چاہا ہے۔ تو وہ غرور کے لہجہ میں اپنے اوصاف بیان کرتی ہے۔ بادشاہ اور کنیز کا کوئی مقابلہ نہیں، لیکن اس موقع پر **نظامی** نے جدت آفرینی سے **سکندر** کا ایک ایک وصف بیان کرکے، اس کے مقابلہ میں اس کی ترجیح کی وجہیں، کنیز کی زبان سے ادا کی ہیں۔

ملک گر ز جمشید بالاتر است ۔ رخ من ز خورشید زیباتر است

شہ ار کیقباد بلند افسر است ۔ مرا افسر از مشک واز عنبر است

شہ ار چوں سلیمان شود دیو بند ۔ مرا در جہاں ہست دیوانہ چند

شہ ار زانکہ عالم گرفت اے شگفت ۔ من آں را گرفتم کہ عالم گرفت

اگر ہم کمند جہانگیر شاہ ۔ فتادہ است در گردن مہر و ماہ

کمندے من از زلف بر سازمش ۔ نہ ترسم بہ گردن در اندازمش

گر او را کمندے بود ماہ گیر ۔ مرا ہم کمندے بود شاہ گیر

گر او ناوک اندازد از دور دست ۔ مرا غمزۂ ناوک انداز ہست

سکندر بہ حیواں، خطا میرود ۔ من اینجا سکندر کجا مے رود

اگر راہ ظلمات مے بایدش ۔ سر زلف من راہ بنمایدش

لب من کہ یاقوت رخشاں درست ۔ لبے چشمۂ آب حیواں در وست

رزمیہ شاہنامہ کو سو برس سے اوپر ہو چکے تھے، اس عرصہ میں زبان میں بڑا انقلاب ہو گیا تھا، سینکڑوں الفاظ بالکل متروک ہو گئے تھے۔ اکثر الفاظ، حروف زائد گرا کر خوبصورت قالب میں ڈھل چکے تھے، عربی کے نئے نئے مانوس الفاظ، داخل ہوتے جاتے تھے، زبان کے انقلاب کے ساتھ مضامین کی طرز ادا کی روش بھی بدل گئی تھی۔ استعارات اور تشبیہات میں لطافت و نزاکت آ گئی تھی طبیعتیں مضمون آفرینی کی طرف مائل ہوتی جاتی تھیں۔ ان باتوں سے شاہنامہ کی عالمگیر آواز دھیمی پڑنے لگی تھی، قصے زبانوں پر رہ گئے تھے۔ لیکن اشعار بھولتے جاتے تھے۔ اس بنا پر قوم کے شجاعانہ جذبات کے زندہ رکھنے کے لئے ایک، دوسرے شاہنامہ کی ضرورت تھی، جو سکندر نامہ کے قالب میں نمودار ہوا۔

سکندر نامہ کے ہیرو کے انتخاب میں غلطی ہوئی، لیکن مجبوری تھی، قومی تاریخ فردوسی کے حصہ میں آ چکی تھی۔ رسول اللہ غزوات اور خلفاء کے معرکوں میں شاعری کی گنجائش کم تھی۔ کیونکہ اصلیت سے بال برابر بھی ہٹتے تو مذہبی عدالت میں مجرم قرار پاتے۔ اور شاعری کے لئے کچھ نہ کچھ آب و رنگ چڑھانا ضرور تھا۔ خود کہتے ہیں۔

چو نظم گزارش بود راہ گیر	غلط کردن رہ بود ناگزیر
مرا کار با نغز گفتار ہیست	ہمہ کار من خود غلط کاریست
دگر بے شگفتے گزاری سخن	ندارد نوی، نامہ ہائے کہن

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ کسی مشہور کشورستان کی داستان اختیار کی جائے اس حیثیت سے سکندر کا کوئی ہمسر نہ تھا، ایشیا، اور یورپ دونو اس کو مانتے تھے، البتہ یہ افسوس ہے کہ نظامی نے مذہب ملا دیا، یعنی ذو القرنین کو سکندر بنا دیا جو صریح قرآن مجید کے خلاف ہے۔

سکندر نامہ میں اگرچہ شاعری کے محاسن بہت زیادہ ہیں باایں ہمہ شاہنامہ کے برابر مقبول نہ ہو سکا، اس کے خاص اسباب ہیں۔

(۱) سکندر نامہ میں اکثر جگہ تعقید ہے۔ جو بات کہنا چاہتے ہیں۔ اس طرح صاف صاف نہیں کہ سکتے کہ زبان سے نکلنے کے ساتھ دل میں اتر جائے، یہی وجہ ہے کہ کثرت سے شرحیں اور حاشیے لکھے گئے۔ اس پر بھی بہت سے مقامات لاینحل رہ گئے اور اکثر جگہ زبردستی مطلب پہنانا پڑا۔

(۲) کتاب کا ہیرو ایک غیر شخص یعنی سکندر رہتا، اس لئے ایرانیوں کو اس کے واقعات سے ایسی دلچسپی اور محبت نہیں ہوسکتی، جو خود اپنی قوم سے ہوسکتی تھی۔ شاہنامہ کے مقبول ہونے کا بڑا اگر یہ تھا کہ خود اپنی قوم کی داستان تھی۔

(۳) تمام کتاب میں صرف ایک شخص کی داستان ہے۔ پڑھنے والا اکتا اکتا جاتا ہے بخلاف اس کے شاہنامہ میں سینکڑوں اشخاص کے واقعات اور گوناگوں حالات ہیں۔ ایک غذا سے جی گھبرائے تو اور طرح طرح کے الوان نعمت موجود ہیں۔

(۴) تمام کتاب میں کوئی درد انگیز اور عبرت خیز واقعہ نہیں ہے۔ بخلاف اس کے شاہنامہ میں رستم و سہراب، منیزہ و بیژن، جمشید و ضحاک، کی داستانیں نہایت پر اثر اور حسرت آمیز ہیں۔

باوجود ان باتوں کے سکندر نامہ نے جو قبولیت حاصل کی، تعجب انگیز ہے شاہنامہ کے سو ڈیڑھ سو ہی برس بعد سکندر نامہ لکھا گیا۔ اور شہرت عام پا گیا، سکندر نامہ کو آج چھ سو برس کا زمانہ گزر چکا، اس مدت میں اس طرز پر پچیسیوں کتابیں لکھی گئیں لیکن اُن کا نام بھی کوئی نہیں جانتا، سکندر نامہ جامی، آئینہ اسکندری، ہمائے ہمایوں، اکبر نامہ، سلیمان نامہ[1] ان کا نام کس نے سنا ہے؟

رزمیہ نظم کا یہ اصول ہے کہ پہلے حربی باجوں کے بجنے اور دار و گیر، ہنگامہ، شور و غل اور عام ہلچل کا نقشہ کھینچا جائے۔ پھر فوجوں کی حملہ آوری، زور شور، جوش و خروش کا ذکر کیا جائے۔ پھر آلاتِ جنگ یعنی تیر و کمان، تیغ و سنان، نیزہ و خنجر کی کارستانیاں دکھائی جائیں پھر ایک ایک پہلوان کا معرکہ میں آنا، رجز پڑھنا، مبارز طلب ہونا، حریف سے لڑنا، داؤں پیچ کرنا، مرنا یا مارنا ان باتوں کا ذکر کیا جائے۔ اور اس طرح کیا جائے کہ میدان جنگ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ سکندر نامہ میں یہ سب باتیں ہیں۔ اور کمال کے درجہ پر ہیں۔

حربی باجوں کا ذکر،

در آمد بہ غریدن آواز کوس	فلک بر دہاں دہل داد بوس
ز غریدنِ کوس خالی دماغ	زمیں لرزہ افتاد در کوہ و راغ
چناں آمد از نائے ترکی خروش	کہ از نلے ترکاں بر آورد جوش

[1] یہ سب مثنویاں سکندر نامہ کی طرز پر اور اس کے جواب میں لکھی گئی ہیں۔

هنگامۂ جنگ

برآورد خیمه (ناقوس) مہرہ آواز شیر / دماغ از دم گاودم گشت سیر
طراقی (تازیانہ کی آواز) که از مقرعه (تازیانہ) خواسته / بروں رفت، ازیں طاق آراسته
ز بیم چغاچق که آمد ز تیر / کفن گشت در زیر جوشن زره
ز دارو بر آمد ز راه نبر / هزاهز در آمد به مردان مرد
به جنبش در آمد دو دریائے خون / شد از موج آتش، زمیں لاله گوں
زمین گفتی از یک دگر بر درید / سرافیل صور قیامت دمید
یکے گفت ہوے و دگر گفت ہاں / بر آورد سر، ہائے وہوئے از جہاں
جگر تاب شد نعره ہائے بلند / گلوگیر شد حلقہائے کمند
سپاه از دو جانب صف آراسته / زمیں آسمان وار برخاسته
ز سم ستوراں دراں پہن دشت / زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت
فرو رفت و بر رفت روز نبرد / نم خوں به ماہی و بر ماه گرد
زبس گرد بر تارک ترک و زیں / زمین آسمان، آسماں شد زمین
چناں گرم گشت آتش کارزار / که از لعل اسپاں بر آمد شرار
زبس خوں که گرد آمد اندر مغاک / چو گوگرد سرخ آتشیں گشت خاک
ز غریدن ژنده پیلان مست / گره در گلوئے ہژبراں شکست
زمیں کو بساطے شد آراسته / غباری شد از جائے برخاسته
ز پولاد پیکان پیکر شکن / تن کوه لرزید بر خویشتن
پدر با پسر کیں بر آراسته / محابا شده، مہر برخاسته
سنان علم جامه در خون زده / نجات از جہاں خیمه بیروں زده
ز شمشیر برگشته جائے نبود / که در غار او اژدہائے نبود
نہنگ خدنگ از کمین کماں / نیاسود بر یک زمیں یک زماں
کمند اژدہائے مسلسل شکنج / دہن باز کرده به تاراج گنج
زبس بر دہن تار پیچ انداختن / نفس را نه راه بروں تاختن
ز نیزه نیستاں شده روئے خاک / ز گوپال (گرز) کوه گشته مغاک
سناں در سناں رسته چوں نوک خار / سپر بر سپر بسته چوں لاله زار

نهنگان شمشیر جوشن گداز — به گردن کشی کرده گردن فراز
به آبرو در آمد کماں را شکنج — شتابان شده تیر چوں مار گنج
ز روسی در آمد به آوردگاه — یلے شیر پرطاس[1] روئین کلاه
مبارز طلب کرد و جولاں نمود — به نام آوری خویشتن را سرود رجز
که پرطاسیاں را دریں خام چرم — به پرطاسی من شود پشت گرم
پلنگاں درم بر سر کوهسار — نهنگاں خورم بر لب جویبار
ورشتم به چنگال و سختم بزور — به حمله درم پهلوئے نره گور
سنانم ز پهلو در آید به ناف — دروغے نمے گویم اینک مصاف
همه خون خام است نوشیدنم — همه چرم خام ست پوشیدنم
شه گردناں شاه گردوں گرائے — ز پیکار موکب تهی کرد جائے
زده بر میاں (پهلوان) گوهر آگیں کمر — در آورد پولاد هندی به سر [illegible]
به تن بر یکے آسماں گوں زره — چو مر غول زنگی گره در گره
یمانی یکے تیغ زهر آب جوش — حمائل فروهشته از طرف دوش
به کبک دری چوں در آید عقاب — چگونه جهد بر زمیں آفتاب
ازاں تیز تر خسرو پیل تن — به تندی در آمد بر آں اهرمن
بزد بانگ بروے که اے زاغ پیر — عقاب جواں، آمد آرام گیر
نخستیں بنزدے که تدبیر کرد — بر آں تیره دل بارش تیر کرد
چو وزخیم را نامد از تیر باک — زننده شد از تیر خود خشمناک
یکے خشت پولاد الماس رنگ — بر آورد و زد بر دلاور نهنگ
ز سختی که تن را بهم در فشرد — بر آں خاره شد خشت پولاد خرد
دگر خشتے انداخت زاں تیز تر — بر آں کشتنی هم نه شد کارگر
چو دانست کاں دیو آهن سرشت — نبندید لختے از حربهٔ تیر و خشت
نهنگ بهانسوز را بر کشید — سوئے اژدهائے دمنده دوید
ندهش بر کشت گاه، دیو دش ز جائے — چناں کاں ستمگر در آمد ز جائے

[1] پرطاس ایک مقام کا نام ہے۔

لیکن انصاف یہ ہے کہ نظامی، فردوسی کی طرح، خاص لڑائی کی داؤں پیچ اور فنون جنگ کی تصویر اچھی طرح نہیں کھینچ سکتے۔

نظامی اور فردوسی کا موازنہ

اگرچہ انصاف یہ ہے کہ **نظامی** فردوسی کے ہمپایہ نہیں ہیں تھوڑا سا شیریں پانی لے کر، بار بار چھانا جائے، مقطر کیا جائے، اور پھر کسی خوشرنگ خوشنما گلاس میں رکھا جائے تو اس کی شیرینی، خوشگواری، صفائی اور خوشنمائی میں کیا شک ہے لیکن ایک صاف شیریں قدرتی چشمہ، جو پہاڑ کے دامن سے نکل کر بہتا چلا جاتا ہے، اس سے کیا نسبت، تاہم دونو کا اندازِ کلام، دکھانے کے لئے ہم چند مشترک عنوانوں کے اشعار نقل کرتے ہیں۔ اور ان کا فرق دکھاتے ہیں۔

سکندر کا قاصد بن کر **نوشابہ** کے دربار میں جانا، سکندر نامہ کی مشہور داستان ہے یہی قصہ شاہنامہ میں بھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ شاہنامہ میں نوشابہ کے بجائے **قیدافہ** کا نام ہے۔ جو اندلس کا بادشاہ تھا، باقی حالات مشترک ہیں، یعنی بادشاہ نے سکندر کو پہچان لیا ہے۔ اور اس سے اس کا اظہار کیا ہے۔ سکندر انکار کرتا ہے۔ بادشاہ اس کی تصویر منگا کر سامنے رکھ دیتا ہے۔ کہ اپنے چہرہ سے ملا لو، سکندر سخت مضطر ہوتا ہے۔ بادشاہ اس کو تسلی دیتا ہے۔ کہ یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے۔

فردوسی	نظامی
چو قیدافہ را دید بر تخت عاج	بر آراست نوشابہ درگاہ را
ز یاقوت و پیروزہ بر سرش تاج	بزر در گرفت آہنی راہ را
ز زربفت پوشید چینی قبائے	پری چہرگاں را بصد گونہ زیب
فراواں پرستندہ پیشش بپائے	صف اندر صف آراست آں دلفریب
رخ شاہ تاباں بہ کردار ہور	بر آمود گوہر بہ مشکیں کمند
نشستنگہش راستون ہا بلور	فرو ہشت بر گوہر آگیں پرند
پرستندہ با طوق و با گوشوار	بر اورنگ شاہنشہی بر نشست
بہ پا اندراں گلشن زرنگار	گرفتہ معنبر ترنجے بدست
سکندر بداں در شگفتی بماند	بفرمود کائیں بجائے آورند
فراواں نہاں، نام یزداں بخواند	فرستادہ را در سرائے آورند

نشستنگہ دید، قیصر کہ نیز
نیامد ورا روم و ایران بہ چیز
بہ مہتر اندر زمیں داد بوس
چناں چوں بود، مردم چاپلوس
ورا دید قیدافہ بشناختش
بہ پرسید بسیار و بنواختش
بہ مے خوردن اندر، گراں مایہ شاہ
فزوں کرد، سوئے سکندر نگاہ
بہ گنجور گفت آں درخشاں حریر
نبشتہ بر و صورتِ دلپذیر
بہ پیش من آور چناں ہم کہ ہست
بہ تندی ببرد، ہیچ پیسائی دست
بیاورد گنجور، و بنہاد پیش
چو دیدش نگہ کرد زاندازہ بیش
بہ چہر سکندر نکو بنگرید
ازاں صورت او را جدائی ندید
بدانست قیدافہ کاو قیصر است
بداں لشکر نامور مہتر است
بدو گفت کائے مرد گستردہ کام
بیا تا چہ دادت سکندر پیام
چنیں داد پاسخ کہ شاہ جہاں
سخن گفت با من میان مہاں
کہ قیدافۂ پاک دل را بگوئے
کہ جز راستی در زمانہ مجوئے

فرستادہ از در آمد دلیر
سوئے تخت شد چوں شتابندہ شیر
کمر بند شمشیر بکشاد باز
بہ رسم رسولاں نہ بردش نماز
تماشائی دراں قصر زیبندہ دید
بہشتی سرائے فریبندہ دید
زبس گوہرین گوش گردن کشاں
شدہ چشم بینندہ گوہر فشاں
ز تابندہ یاقوت درخشندہ لعل
خرامندہ را آتشیں گشت نعل
مگر کان و دریا بہم تاختند
ہمہ گوہر ایں جا بر انداختند
زن زیرک از سیرت شان او
وراں داوری شد ہراسان او
کہ ایں کار واں مرد آہستہ رائے
چرا شرط خدمت نیارد بجائے
ز سر تا قدم دید در شہر یار
زر پختہ را بر محک زد عیار
چو نیکو نگہ کرد بشناختش
بہ تخت خود آرام گہ ساختش
سکندر بہ رسم فرستادگاں
نگہ داشت آئین آزادگاں
پس آنگہ گزارش گرفت از پیام
کہ شاہ جہاں داور نیک نام

[1] یعنی بے احتیاطی سے ہاتھ نہ لگانا۔

مگر سر نہ پیچی ز فرمانِ من
نگہدار بیدار پیمانِ من
وگر ہیچ تاب اندر آری بدل
بیارم یکے لشکرے دل گسل
بر آرم دمار از ہمہ کشورت
بہ آتش بسوزم ہمہ کشورت
بدو گفت کائے زادہ فیلقوس
ہمہ رزم جویم ست دہم نعم و بوس
دلیر آمدی پیش من باژ خواہ
ندانم ترا ایں کہ بنمود راہ
سکندر ز گفتار او گشت زرد
رواں پُر ز درد و رخاں لاجورد
بدو گفت کائے مہتر پُر خرد
چنیں گفتہ از تو نہ اندر خورد
منم نیطقون کہ خدائے جہاں
جز ایں بچہ فیلقوسم مخواں
بدو گفت قیدافہ گز داوری
لبت را بپرداز کاسکندری
بیاورد و بنہاد پیشش حریر
نوشتہ بر و صورتے دلپذیر
کہ گر ہیچ جنبش بدے در نگار
نبودے جز اسکندر شہریار

چنیں گفت کائے داور نامجوی
ز نام آوران جہاں بردہ گوی
چہ افتاد کز ماہ عناں تافتے
سوئے ما تو یک روز نشتافتے
زبونے چہ دیدی کہ توسن شدی
چہ بیداد کردم کہ دشمن شدی
چو من رہ دریں مملکت ساختم
بر و سایۂ دولت انداختم
کمر چوں نہ بستی بدرگاہِ من
چرا روئے پیچیدے از راہِ من
بہ پاسخ نمودن زن ہوشمند
ز یاقوت سر بستہ بکشاد بند
کہ صد آفریں بر تو شاہ دلیر
کہ پیغام خود خود گزاری چو شیر
چناں آیدم در دل اے پہلوان
کہ با ایں سرو سایۂ خسرواں
میانجی نہ شاہ آزادہ
فرستندہ نہ فرستادہ
پیام تو چوں تیغ گردن زند
کرا زہرہ کیں تیغ بر من زند
ز تیغ سکندر چہ رانی سخن
سکندر توئی چارہ خویش کن
مرا خواندی و خود بدام آمدی
نظر پختہ ترکن کہ خام آمدی
جہاندار گفت اے سزاوارِ تخت
پژوہش مکن جز بہ فرمان بخت

نظامی

سکندر محیط است و من جوئے آب	منہ تہمت سایہ بر آفتاب
بدرگاہ او بیش ازاں ست مرد	کہ او را قدم رنجہ بایست کرد
دگر بار نوشابۂ ہوشمند	ز نوشین لب خویش بکشاد بند
کزیں بیش بر دلفریبی مباش	بہ ناراستی بکر کیبی مباش
پیامت بزرگ است و نامت بزرگ	نہفتہ مکن شیر در چرم گرگ
فرستادہ را نیست ایں دسترس	کہ با ما بہ تندی بر آرد نفس
نہ جباری خویش را کم کند	نہ در پیش من پشت را خم کند
چو البش چنیں داد شاہ دلیر	کہ ناید ز روباہ پیغام شیر
اگر من چہ چشم تو نام آورم	سکندر نیم زو پیام آورم
اگر در میانجی دلیر آمدم	نہ از روبہ از نزد شیر آمدم
برآشفت **نوشابہ** زاں شیر دل	کہ پوشید خورشید را زیر گل
بفرمود کارد کنیزے دواں	حریرے برو پیکر خسرواں
یکے گوشہ از شقۂ آں حریر	بدو داد کیں نقش بر دست گیر
بہ بیں تا نشانِ رخ کیست ایں	دریں کارگاہ از پے چیست ایں
اگر پیکر تست چندیں مکوش	بہ ابروے خود آسماں را مپوش
سکندر بفرمان او ساز کرد	حریر نوشتہ ز ہم باز کرد
بعینہ درو صورت خویش دید	ولایت بدست بد اندیش دید
بترسید و شد رنگ رویش چو کاہ	بدارائے خود برد خود را پناہ

(۱) سب سے پہلے اس پر نظر ڈالو کہ جہاں ایک ہی خیال، ایک ہی واقعہ، ایک ہی بات کو دونوں نے لکھا ہے۔ وہاں بھی، بندش الفاظ کے لحاظ سے کس قدر فرق ہے۔ نظامی کی ترکیبوں کی چستی، قافیوں کی بلندی، فقروں کے دروبست، الفاظ کے شکوہ کا یہ انداز ہے۔ کہ گویا شیر گونج رہا ہے۔ اس کے مقابلہ میں فردوسی کا کلام ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی پیراتم بڈھا پیرانہ لہجہ میں ٹھیر ٹھیر کر باتیں کرتا ہے ان اشعار کا مقابلہ کرو۔

فردوسی	نظامی
ز زربفت پوشید چینی قبائے	پہ پیچیرگاں را بصد گونہ زیب
فراواں پرستندہ پیشش بپائے	صف اندر صف آراست آں دلفریب
بر مہتر اندر زمیں داد بوس	سکندر بہ رسم فرستادگاں
چناں چوں بود مردم چاپلوس	نگہ داشت آئین آزادگاں
سکندر بداں در شگفتے بماند	نہانے دراں قصر زیبندہ دید
فراواں نہاں نام یزداں بخواند	بہشتی سرائے فریبندہ دید
بہ مے خوردن اندر گراں مایہ شاہ	زسر تا قدم دید در شہریار
فرزوں کرد سوئے سکندر نگاہ	زر پختہ را بر محک زد عیار
بہ گنجور گفت آں درفشاں حریر	یکے گوشہ از شقۂ آں حریر
نبشتہ بر و صورتے دلپذیر	بدو داد کیں نقش بردست گیر
کہ قیدافۂ پاک دل را بگوئے	چنیں گفت کاے داورِ نامجوے
کہ جز راستی در زمانہ مجوی	زنام آوران جہاں بردہ گوی
دلیر آمدی پیش من باز خواہ	کہ صد آفریں بر تو شاہِ دلیر
ندانم ترا ایں کہ بنمود راہ	کہ پیغام خود خود گزاری چو شیر
بدو گفت قیدافہ کز داوری	میانجی نہ شاہ آزادہ
لبت را بپرداز کا سکندری	فرستندہ نہ فرستادہ
سکندر ز گفتار او گشت زرد	بترسید و شد رنگ رویش چو کاہ
رواں پر ز درد و رخاں لاجورد	بدارائے خود برد خود را پناہ
منم بیطقون کد خدائے جہاں	سکندر محیط است و من جوئے آب
جز ایں بچہ فیلقوسم مخواں	منہ تہمت سایہ بر آفتاب

(۲) انہی اشعار میں بلاغت کا فرق دیکھو۔

فردوسی	نظامی
فراواں پرستندہ پیشش بپائے	صف اندر صف آراست آں دلفریب

فردوسی کے بیان سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ غلاموں اور لونڈیوں کا ہجوم

تھا۔ اور سب کھڑے تھے، لیکن **نظامی** کے بیان سے اُن کا باقاعدہ صف بہ صف ایستادہ ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ آراستہ کے لفظ نے اس خصوصیت کو اور روشن اور خوشنا کر دیا ہے۔

فردوسی	نظامی
بر مہتر اندر زمیں داد بوس چناں چوں بود مردم چاپلوس	سکندر بہ رسم فرستادگاں نگہ داشت آئین آزادگاں

فردوسی نے سکندر کی شان کا کچھ لحاظ نہیں رکھا، زمین چومنا خوشامدیوں کا شیوہ ہے۔ **فردوسی** کو اس پر بھی قناعت نہیں، بلکہ کھول کر کہتا ہے۔ کہ سکندر نے اسطرح زمین چومی۔ جس طرح خوشامدی چوما کرتے ہیں۔ **نظامی** نے اگرچہ "برسم فرستادگان" کے لفظ سے ظاہر کر دیا ہے۔ کہ سکندر نے قاصدوں کے طریق اور آئین کو ملحوظ رکھا تھا۔ تاہم دوسرے مصرع میں دفع دخل بھی کر دیا کہ اس حالت میں بھی اپنی آن تان نہیں چھوڑی۔

فردوسی	نظامی
سکندر بداں در شگفتی بماند فراواں نہاں نام یزداں بخواند	نہانے دراں قصر زیبندہ دید بہشتی سرائے فریبندہ دید

فردوسی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سکندر بالکل ندیدہ تھا۔ دربار کے ٹھاٹھ کو دیکھ کر مبہوت ہو گیا تھا۔ اور بار بار خدا کا نام لیتا تھا۔ **نظامی** نے مکان اور ایوان کی عمدگی اور خوبی کا اثر سکندر پر طاری کرنا چاہا ہے۔ لیکن اسی قدر کہ وہ کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا

فردوسی	نظامی
فزوں کرد سوے سکندر نگاہ	ز سر تا قدم دید در شہریار

فزوں نگاہ کردن، سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ نوشابہ سکندر کو بڑی دیر تک دیکھتا رہا۔ ممکن ہے کہ صرف چہرہ پر ہی دیر تک اُس کی نظر جمی رہی۔ لیکن صرف چہرہ کی مشابہت پہچاننے کے لئے کافی نہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے۔ کہ دو آدمیوں کے چہرے ملتے جلتے ہوتے ہیں، لیکن اور اعضا میں فرق ہوتا ہے۔ بخلاف اسکے **نظامی** کے بیان سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ نوشابہ نے سکندر کو سر سے پاؤں تک دیکھا، یعنی نہ صرف چہرہ بلکہ تمام اعضا اور ڈیل ڈول، رنگ روپ، سج دھج کو بھی دیکھا۔ جس سے صاف ثابت ہو گیا کہ یہ سکندر ہے۔

نظامی		فردوسی	
	چنیں گفت کاے داور نامجوے زنام آوران جہاں بردہ گوے		کہ فیدافہ پاک دل راگوے کہ جز راستی در زمانہ مجوے

قاصد کا بادشاہ کے دربار میں بادشاہ کا نام لینا، اور پھر فوراً تنبیہ اور نصیحت شروع کر دینا، دستور کے خلاف ہے۔ اس لئے **نظامی** نے نام نہیں لیا بلکہ داور نامجو کے لفظ سے خطاب کیا اور اس کے ساتھ مدحیہ الفاظ اضافہ کئے۔

نظامی		فردوسی	
	کہ صد آفریں بر تو شاہ دلیر کہ پیغام خود خود گزاری چو شیر		دلیر آمدی پیش من باژ خواہ ندانم ترا ایں کہ بنمود راہ

فردوسی نے اس بات کو کہ فیدافہ نے سکندر کو پہچان لیا، نہایت بے مزہ طریقہ سے بیان کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ یہ الفاظ کہ معلوم نہیں کس نے تمکو یہ طریقہ سکھایا، اور بھی بدتہذیبی ہے۔ بخلاف اسکے **نظامی** اسی بات کو اس طرح ادا کرتے ہیں جس سے یہ ظاہر معلوم ہوتا ہے۔ کہ **نوشابہ** کو یہ ظاہر کرنا مقصود نہیں کہ میں نے آپکو پہچان لیا بلکہ وہ سکندر کی دلیری اور جرأت کے اثر سے متاثر ہے، اور بے اختیار تعریف کرتی ہے۔

نظامی		فردوسی	
	بترسید و شد رنگ رویش چو کاہ بہ داراے خود برد خود را پناہ		سکندر ز گفتار او گشت زرد رواں پر ز زور دور خاں لاجورد

اس قدر مضمون دونو کے ہاں مشترک ہے کہ جب سکندر کو معلوم ہوا کہ بادشاہ نے اُس کو پہچان لیا، تو وہ ڈرا، اور متردد ہوا، لیکن **فردوسی** نے اسکے ڈرنے کو اس قدر حد سے بڑھا دیا۔ جو سکندر کی شان سے بالکل بعید ہے۔ رواں پر زور دور خاں لاجورد، **نظامی** کے بیان سے بھی اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ سکندر کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اور دل میں خدا سے دعا مانگی کہ اس خطرہ سے بچ جائے، لیکن اتنا بھی بدحواس نہیں ہوا کہ دل میں ٹیس اٹھنے لگی۔ فردوسی نے پہلے مصرع میں سکندر کا زرد پڑ جانا بیان کر دیا تھا۔ لیکن اس پر بھی تسلّی نہیں ہوئی اور دوسرے مصرع میں پھر کہنا پڑا "رخاں لاجورد"۔

(۳) اب عام طرح پر نظر ڈالو، جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے تو سب سے پہلے

یہ دیکھنا چاہیے کہ بیان کرنے والا واقعہ کا خاکہ (پلین) کیونکر قائم کرتا ہے۔ اور یہ بلاغت کا پہلا لیکن سب سے ضروری مرحلہ ہے۔

فردوسی نے واقعہ کا جو خاکہ قائم کیا ہے۔ اس میں متعدد ناموزونیاں ہیں۔

(۱) سکندر قاصد کے لباس میں خوشامدیوں کی طرح دربار میں آداب بجا لاتا ہے۔

(۲) دربار کو دیکھکر مبہوت ہوجاتا ہے۔ گویا کبھی شاہانہ دربار دیکھا ہی نہ تھا۔

(۳) حالانکہ سکندر کی رفتار گفتار، طور و طریقہ سے ابھی کوئی بات ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ جس سے اس احتمال کی طرف ذہن جائے کہ یہ خود سکندر ہے تاہم بادشاہ کو شبہ ہوتا ہے اور وہ سکندر کے چہرہ کو بہت غور سے دیکھتا ہے۔ اس لئے **نظامی** نے اسکا یہ پہلو نکالا کہ سکندر نے قاصدوں کی طرح سجدہ نہیں کیا تھا۔ اور پیغام اس شان سے ادا کیا کہ قاصد اس دلیری اور جرأت سے ادا نہیں کرسکتا تھا، اس حالت میں شبہ پیدا ہونا ضرور تھا، اور شبہ کو اس لئے قوت ہوئی کہ سکندر کی تصویر اسکی نظر سے گزر چکی تھی

(۴) **قیدافہ** نے سکندر کے سامنے ہی تصویر منگا کر دیکھی۔ حالانکہ جب مخفی طور سے سکندر کو پہچاننا مقصود تھا۔ تو سکندر کے سامنے تصویر منگوا کر دیکھنا نہ چاہئے تھا۔

(۵) سکندر جب قاصد کی حیثیت سے پیغام ادا کرتا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ آداب شاہی سے ناواقف ہے۔ اول تو بادشاہ کا نام لینا خلاف ادب ہے، اس کے علاوہ پہلے ہی سخت کلامی شروع کردی، نہائت بد تہذیبی ہے۔

برآرم دمار از ہمہ لشکرت		بہ آتش بسوزم ہمہ کشورت	

(۶) سکندر جب اپنے آپکو چھپاتا، اور سکندر کا قاصد ہونا ظاہر کرتا ہے۔ تو اس کو سکندر کا نام بڑی تعظیم و تکریم سے لینا چاہئے تھا۔ لیکن وہ سکندر کو بچہ فیلقوس کے خطاب سے یاد کرتا ہے۔

ع۔ جز ایں بچہ فیلقوسم مخواں۔

اس کے مقابلہ میں **نظامی** نے جس طرح اس تمام واقعہ کا خاکہ کھینچا ہے وہ یہ ہے نوشابہ کو جب معلوم ہوا کہ سکندر کے دربار سے قاصد آتا ہے۔ تو اس نے بڑے سازو سامان سے دربار آراستہ کیا، خود بھی بن ٹھن کر ہاتھ میں ایک ترنج لیے ہوئے تخت شاہی پر

لہ اس بیان میں، فردوسی، اور نظامی کے اشعار نکر رہ گئے لیکن اس بحث کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کیلئے ایسا کرنا ضرور تھا

بیٹھی۔ سامنے پری چہرہ کنیزیں صف باندھکر کھڑی ہوئیں، پھر سکندر کو طلب کیا۔ اسکندر دربار میں آیا۔ تو آداب شاہی کے موافق کمر بند سے تلوار کھول کر رکھ دی۔ لیکن سجدہ نہیں کیا۔ اس موقع پر دربار جو جواہرات سے جگ مگ کر رہا تھا۔ اُس کو نہائت مبالغہ آمیز پیرایہ میں ادا کیا ہے۔

ز تابندہ یاقوت درخشندہ لعل نگر کان و دریا بہم تاختند		خرامندہ را آتشیں گشت نعل ہمہ گوہر آں جا براند اختند	

قاصد کے شاہانہ طرز کلام سے نوشابہ کو شبہ ہوا کہ یہ خود سکندر ہے۔ خوب غور سے دیکھا تو یقین ہو گیا۔ قاصد نے اب پیغام ادا کرنا شروع کیا کہ شہنشاہ نے کہا ہے کہ ہماری طرف کیا کمی ہوئی جو تم نے بے اعتنائی کی، آج تک تم دربار میں نہ آئے، ہم ان اطراف میں بھی آئے۔ لیکن تم نے ادھر رُخ نہ کیا۔

نوشابہ نے کہا کہ آپ کی جرأت پر صد ہزار آفرین ہے۔ کہ آپ اپنا پیغام ادا کرتے ہیں۔ آپ کی باتیں تلوار کا کاٹ کرتی ہیں۔ یہ تلوار اور کس کی مجال ہے کہ مجھ پر چلائے۔ سکندر انکار کرتا ہے۔ کہ میں سکندر نہیں۔ پھر اس کی نہائت عمدہ توجیہیں بیان کرتا ہے۔ کہ کجا سکندر، کجا میں، سکندر کے دربار میں آدمیوں کی کیا کمی ہے۔ کہ خود قاصد بن کر آتا۔ اس موقع پر نوشابہ واسکندر کے سوال و جواب کو نہائت بلیغ انداز میں طول دیا ہے، آخر نوشابہ جھلا کر سکندر کی تصویر منگوا کر اُس کو دکھاتی۔ اور سکندر لاجواب ہو کر رہ جاتا ہی اس کے ساتھ خطرہ کے خیال سے اُس کے چہرہ کی رنگت زرد پڑ جاتی ہے۔

اس تمام سلسلہ میں کہیں سے کوئی کسر نہیں، تمام واقعات، اصلیت اور نیچر کے مطابق ہیں۔ اِس کے ساتھ فصاحت و بلاغت، تشبیہات اور استعارات کی نادرت اور لطافت، الفاظ کی شان و شکوہ، ان تمام باتوں نے اِس داستان کو سحر سامری بنا دیا ہے

نظامی اور فردوسی میں یہ فرق اور بہت سے موقعوں پر نظر آتا ہے۔ لیکن طول کے لحاظ سے ہم قلم انداز کرتے ہیں۔ سکندر و دارا کی گفتگو اوپر گزر چکی ہے۔ اِس کو اِس موقع پر ایک بار اور دیکھ لینا چاہیئے۔ ان سب باتوں پر بھی فردوسی فردوسی ہے، اور نظامی نظامی۔

چند ضروری باتیں

(۱) شعر العجم کے چار حصوں میں سے یہ پہلا حصہ شائع ہو رہا ہے۔ اس میں صرف قدیم شعراء کے حالات اور ان کی شاعری سے بحث ہے، دوسرا اور تیسرا حصہ مطبع میں جا چکا ہے پہلے حصہ کی تالیف میں اگرچہ تدقیق اور محنت میں کچھ کمی نہیں کی گئی لیکن مجھکو صاف کہنا چاہئے کہ یہ حصہ اور تمام حصوں کی بہ نسبت کم دلچسپ ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کی تصنیف کی دلچسپی یا شعرائ کے حالات سے ہو سکتی تھی۔ یا اُن اشعار سے جو جا بجا مثال میں پیش کئے جاتے ہیں۔ قدیم شعرائ کے حالات کم ملتے ہیں۔ اور یہ حصہ قدماء ہی تک محدود ہے۔ دقیقی، عنصری، نظامی، بہت بڑے رتبہ کے شاعر ہیں۔ لیکن ان کے حالات اور واقعات اسقدر کم ہیں کہ مجبوراً چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر پھیلانا پڑا ہے۔ قدماء میں سے دور اول کی زبان آج بالکل نامانوس ہے، دقیقی، فردوسی، منوچہری، عنصری، کے متواتر دو شعر بھی آجکل کی زبان میں نہیں ملتے، اس کے علاوہ ان کی شاعری میں عشق کی چاشنی گویا ہے ہی نہیں، اس لئے ان کے کلام میں آج کل کے لوگوں کو مزا نہیں آسکتا۔

غرض یہ حصہ چنداں تفریح اور تفنن کے کام کا نہیں۔ اس کو ایک علمی خشک مضمون کی حیثیت سے پڑھنا چاہئے، باقی حصے البتہ دلچسپ، بامزہ اور رنگین ہیں۔

(۲) چونکہ کتابوں کی تفحص اور تلاش کا سلسلہ اب تک قائم ہے۔ اور بعض بعض نادر کتابیں اس حصہ کی تصنیف کے بعد ہاتھ آئیں۔ اس لئے وہ معلومات جو ان کتابوں سے ہاتھ آئے۔ اب چوتھے حصے کے کام آئیں گے، مثلاً تمام تذکروں میں مذکور ہے ایران میں سب سے پہلے بہرام گور نے شعر کہا۔ اور وہ یہ تھا۔

منم آن پیل دمان و منم آن شیر یلہ
نام بہرام مرا و پدرم بوجبلہ

لیکن میں نے اس روایت کو اس لئے نظر انداز کیا تھا۔ کہ اول تو یہ اُس زمانہ کی زبان نہیں ہو سکتی۔ دوسرے یہ کہ بہرام کے کلام میں ابوجبلہ عربی لفظ کیوں آتا۔ لیکن لب اللباب عوفی کی پہلی جلد، کتاب کی تصنیف کے بعد چھپ کر یورپ سے آئی تو اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ بہرام گور عرب میں پلا تھا۔ اور عربی زبان میں شعر کہتا تھا چنانچہ عوفی نے اس کا عربی دیوان خود دیکھا تھا۔ لب اللباب میں یہ شعر کسی قدر تغیر کے ساتھ مذکور

ہے۔ جس سے اس کی ساخت اور زبان دونو پر اثر پڑتا ہے

(۳) دنیا میں ناممکنات کی اب تک جو فہرست تیار ہو چکی ہے۔ اس میں ایک نمبر "کتاب کا صحیح چھپنا" بھی اضافہ کرنا چاہیے، یہ مصیبت، مدت سے مجھکو پیش آتی ہے لیکن علاج کی کوئی صورت نہیں نکلتی، کاپیوں اور پروف کی تصحیح چنداں کام نہیں دیتی، چھپنے میں حرف کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ کسی کتاب کے ساتھ غلط نامہ لگانا بھی بیکار سا ہے۔ غلط نامہ سے کتاب کو مطابق کر کے تصحیح کرنا، اتنی بڑی زحمت کون اٹھائے۔ اسی بناپر میں نے کبھی اس کا قصد نہیں کیا۔ لیکن شعر العجم فارسی لٹریچر کا آئینہ ہے۔ اس کی غلط بیانی کا اثر خود زبان پر پڑ سکتا ہے۔ اس لیے چارو ناچار میں خود زحمت اٹھاتا ہوں اور احباب کو بھی زحمت دیتا ہوں۔ خفیف غلطیاں تو اس قدر ہیں۔ کہ سب کا احصاء کروں تو ایک اور کتاب تیار ہو جائے۔ اس لیے موٹی موٹی غلطیاں لکھ دی ہیں۔ ایک عام غلطی یہ ہے کہ بین السطور میں جہاں کہیں میں نے کسی لفظ کے نیچے اس کے معنے لکھ دیئے ہیں۔ کاتب صاحب وہاں سے ہٹا کر کسی دوسرے لفظ کے نیچے وہ معنے لکھ دیتے ہیں۔ اور اس سے مصنف کی سخت جہالت ثابت ہوتی ہے۔

ایک جگہ اہل مطبع نے نہیں بلکہ میں نے خود سخت غلطی کی ہے۔ جس سے فردوسی کی شاعری پر حرف آتا ہے۔ اس لیے نہایت ندامت کے ساتھ فردوسی سے اس کی معافی چاہتا ہوں، کتاب کے ۱۶۷ صفحہ سطر میں یہ عبارت ہے۔

صلاح و مشورہ کے لیے لوگ جمع ہوئے ہیں، اس میں کھانا بھی سامنے آگیا ہے۔ لوگ کھاپی کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کو اس طرح ادا کرتا ہے۔

پے مشورہ مجلس آراستند		نشستند، خوردند، برخاستند

لیکن فردوسی کا شعر میں نے غلط نقل کیا۔ اور اس لئے معنی بھی غلط لکھے۔ شعر کا دوسرا مصرع اصل میں یوں آیا ہے۔ ع

نشستند و گفتند و برخاستند

نکتہ دان بلاغت جانتا ہے۔ کہ اس لفظ (گفتند) کے تغیر سے شعر برباد ہو جاتا ہے۔

(شبلی نعمانی)

تمام شد

A-H-C

:- چوہدری محمد شریف سوداگر ناظم کتب خانہ نے حمایت اسلام پریس لاہور میں طبع کرایا۔

(۵) ترجمتین وجواب مضمون فارسی ۲

(۶) کتاب الصرف ۱۲ر کتاب النحو ۱۸ر

قطف الازہار (حصہ نثر) ۱ر

اختیاری مضمون اردو

(۱) دربار اکبری (تتمہ خارج) ۵ر

(۲) مجموعہ نظم آزاد ۸ر

مسدس حالی معہ حالات وفرہنگ ۵ر

انتخاب مخزن حصہ نظم ۱۸ر

کتب امدادی

کنز المنافع یعنی بہترین اردو خلاصہ رسالہ عبد الواسع از جناب جعفری شادانی ۴ر

اردو خلاصہ عروض سیفی از ساحل بلگرامی ۲ر

خلاصہ شعر العجم حصہ دوم ۵ر خلاصہ شعر العجم حصہ سوم ۵ر

ترجمہ بی۔اے کورس فارسی جدید عا/ر

اردو خلاصہ سیر المتاخرین ۶ر

اردو ترجمہ رقعات عالمگیر از عبد اللہ چغتائی عہ

ترجمہ قصائد عرفی از مولوی جان محمد صاحب منشی فاضل ۶ر

اردو خلاصہ اخلاق ناصری ۱۲ر

ترجمہ ایف۔اے کورس عربی (حصہ نثر) ۱۲ر

اتالیق فارسی فارسی ترجمہ کے لئے بہترین کتاب ۱۴ر

قرۃ العین در ترجمتین ۱۰ر

پرچہ جات منشی عالم ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۶ء ۶ر

منشی فاضل ۱۹۴۲ء

پرچہ (۱) دبیر عجم ۴ر

العروض والقوافی از مولانا نارُوچی ۱۲ر

جواہر المحور (حصہ نثر حصہ مقامات بدیع الزمانی خارج) ۱۲ر

شعر العجم حصہ چہارم کاغذ سفید ڈمی عہ

تاریخ ادبیات ایران للعہ

(۲) چہار مقالہ معہ متعدد فرہنگ مرتبہ خواجہ فیروز حسن ایم۔اے کاغذ سفید ڈمی ۱۸ر

انشائے ابو الفضل دفتر اول وسوم ۱۰ر

حاجی بابا اصفہانی کاغذ سفید ڈمی اعلیٰ عا/۸ر

سیاحت نامہ ابراہیم بیگ جلد دوم ۱۰ر

وکلائے مرافعہ ۳ر

(۳) انتخاب قصائد قاآنی ۱۰ر

غزلیات نظیری معہ حالات زنار ردیف س ا کامل کتاب ۱۲ر

دیوان فرخی حصہ داخل نصاب ۱۰ر

منطق الطیر ۱۰ر

رباعیات باباطاہر معہ ترجمہ وحالات از ڈاکٹر سید محمد عبد ایم۔اے ۳ر

(۴) مطلع السعدین از کمال الدین عبد الرزاق صفحہ ۱ تا ۲۰۰

انتخاب سیر المتاخرین تا اخیر عہد جہانگیر ۱۰ر

نوٹ:- اس پرچے کے سوالات عبارتی وتاریخی دونو طرز پر ہوں گے

(۵) اخلاق جلالی (بحث تتمہ خارج) مطبوعہ نولکشور اعلیٰ عہ

رموز حکمت از مولوی محمد شریف عا/ر

درۃ الاخبار مطبوعہ یونیورسٹی ۱۲ر

کشف المحجوب (تا اختتام احوال صوفیہ کرام) اعلیٰ خوشخط کاغذ سفید ڈمی کامل کتاب ۱۲ر

(۶) ترجمہ اردو سے فارسی میں اور جواب مضمون فارسی

اختیاری مضمون اردو

(۱) روح الاجتماع ۱۸ر

افادات مہدی ۷ر

انتخاب مخزن حصہ دوم (نثر) عہ

کتاب	قیمت
رویائے صادقہ	۴ر
ادبی خطوط غالب از محمد عسکری	عہ
(۲) دیوان حالی معہ مقدمہ شعر و شاعری	عہ
دیوان غالب اردو معہ حالات و فرہنگ	۵ر
بانگ درا از ڈاکٹر سر محمد اقبال	عہ۸ر

کتب امدادی

کتاب	قیمت
حدیقۂ ارم اردو حل دبیر عجم کاغذ ولیمنی اعلیٰ	۸ر
العروض والقوافی از مولانا محمد شفیع منشی فاضل مولوی فاضل	۶ر
اردو ترجمہ بی اے کورس عربی جدید مطبوعہ ۳۶ء احصہ نثر	۱۰ر
خلاصہ شعر العجم حصہ چہارم از مولانا محمود الحسن	۴ر
خلاصہ تاریخ ادبیات ایران	۱۲ر
اردو ترجمہ چہار مقالہ از مولانا محمود الحسن صاحب ضیا ایچ ایچ پی۔او۔ٹی	۸ر
اردو ترجمہ ابو الفضل دفتر اول و سوم معہ فرہنگ از نسیم امروہی فقیہہ فاضل و فاضل ادب الہ آباد یونیورسٹی	عہ۸ر
اردو ترجمہ وکلائے مرافعہ از مولوی جان محمد صاحب منشی فاضل	۳ر
بہترین اردو ترجمہ حاجی بابا از حضرت مونس بھوپالوی	عہ۸ر
اردو ترجمہ سیاحت نامہ ابراہیم بیگ معہ فرہنگ و دیباچہ از باقی عباسی	۲عہ
بہترین اردو ترجمہ جدید انتخاب قصاید قاآنی	۱۲
اردو شرح غزلیات نظیری تا آخر ردیف س از مولانا خوشی محمد صاحب فاضل ادب عربی۔ اردو۔ فارسی	۲عہ
اردو شرح فرخی تا حصہ نصاب از صوفی محمد اشرف ایم۔اے۔ ایم۔او۔ایل	۱۵ر
اردو شرح رباعیات ابو سعید ابو الخیر حل تمن از مولانا محمود الحسن صاحب منشی فاضل مولوی فاضل	۱۲ر
اردو خلاصہ سیر المتاخرین معہ حالات مصنف	۶ر
اردو ترجمہ مطلع السعدین	
اردو ترجمہ اخلاق جلالی معہ فرہنگ	عہ
جواہر اخلاق خلاصہ اردو اخلاق جلالی از بسمل بلگرامی منشی فاضل	۸ر
اردو ترجمہ کشف المحجوب	عہ۸ر
معیار شرافت یعنی اخلاق جلالی حصہ فلسفۂ اخلاق بطور سوال و جواب تقریباً تمام سابقہ امتحانات کے سوالات معہ جوابات	عہ
خلاصہ رموز حکمت از محمد ایوب مولوی فاضل منشی فاضل	۶ر
مفتاح الحقیقت یعنی بہترین اردو خلاصہ کشف المحجوب معہ حالات مصنف از ثاقب رامپوری منشی فاضل کامل الہ آباد	۶ر
اردو ترجمہ منطق الطیر از مولانا محمد نذیر عرشی فاضل عربی فارسی اردو	۲عہ
اتالیق فارسی ترجمہ کے لئے بہترین کتاب	۱۴ر
در مکنون در جواب مضمون از پروفیسر رشید احمد صاحب	۱۵ر
اردو حل ورقۃ الاخبار از زبدۃ الحکما مولانا گل احمد خان فاضل عربی۔ فارسی۔ اردو	۸ر
پرچہ جات منشی فاضل ۲۷ و ۳۰ تا ۳۴ء	۱۲ر
رہبر کامل یعنی حل پرچہ جات منشی فاضل ۳۰ تا ۳۷ء	عہ۸ر

علاوہ ازیں کتب نصاب امتحانات مولوی عالم مولوی فاضل۔ ادیب۔ ادیب عالم ادیب فاضل معہ کتب امدادی عمدہ اور بارعایت ملتی ہیں فہرست کتب نصاب مفت

ملنے کا پتہ

شیخ جان محمد اللہ بخش تاجران کتب علوم مشرقی کشمیری بازار لاہور